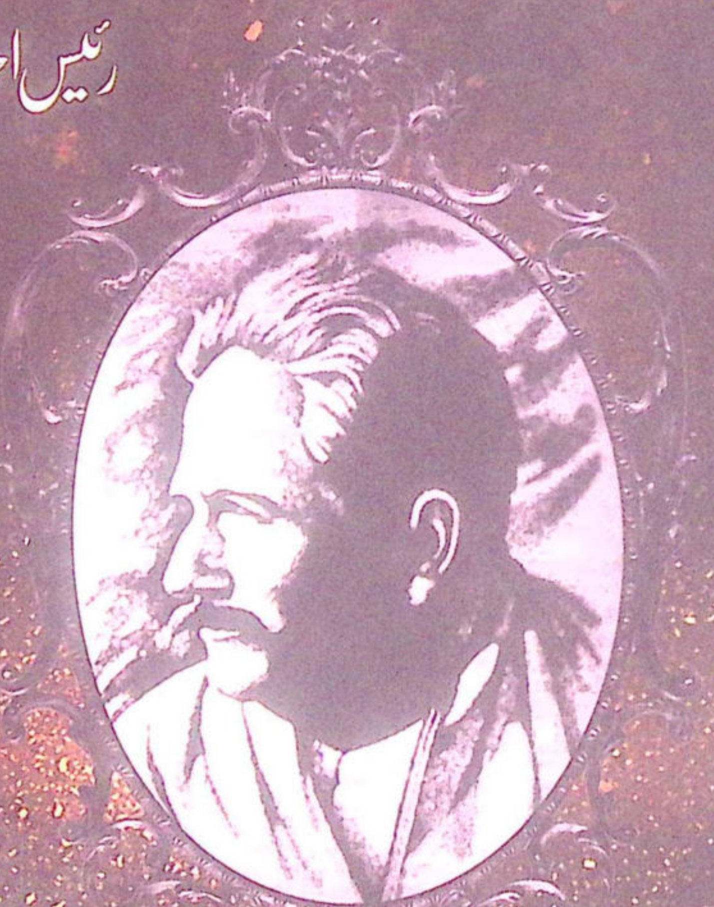
اقبال

اپنے آئینہ میں

رئیس احمد جعفری



اقبال

اپنے آئینہ میں

رئیس احمد جعفری

نام کتاب .... اقبال اپنے آئینہ میں

مصنف .... رئیس احمد جعفری

ناشر .... بک کنک

اون لائن بک سٹور، لاہور۔ 0331-5444492

مطبع .... بسمہ اللہ پرنٹرز، لاہور

اشاعت 2019ء

قیمت .... -/600 روپے

تقسیم کار

حمزہ بکس 17-الفصل مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور 0317-1526084	**علم و عرفان** الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور 042-37232336
آصف بک سٹال اُردو بازار، لاہور۔ 0322-8413120	**خزینہ علم و ادب** الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

کتاب کی کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی جاتی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو یا متن درست نہ ہو تو از راہ کرم مطلع فرمائیں۔ تاکہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائے۔ (ناشر)

پیرایۂ آغاز

قلم کا مسافر، اپنی منزل تک پہنچ گیا!

شکر کہ جمازہ بہ منزل رسید

''اقبال اپنے آئینہ میں'' یہ بڑا نازک اور محنت طلب موضوع تھا، میں نے محنت میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ ان کے ہزاروں اشعار پڑھے، انہیں بار بار سمجھنے کی کوشش کی، انتخاب کیا اور پھر اس انتخاب کا انتخاب کیا۔

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلِ چینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

میں نہیں کہہ سکتا، اپنی کوششوں میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔ اس کا فیصلہ تو قارئین ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک بات ضرور عرض کروں گا۔ میں نے ایک نیا موضوع تلاش کیا ہے اور اس موضوع پر ایک انسان جتنی محنت کر سکتا ہے، اس سے میں نے گریز نہیں کیا۔ کاش! میری یہ محنت، اہل نظر کی نگاہ میں کسی قابل ٹھہرے۔

رئیس احمد جعفری
۸۹۔ ٹیگور پارک، لاہور
۵ ستمبر ۱۹۵۶ء

گوہر یگانہ

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد
ہر دَور میں کرتا ہے طواف اُس کا زمانہ!
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
اس قوم کو تجدید کا پیغام مُبارک
ہے جس کے تصوّر میں فقط بزمِ شبانہ

(ضرب کلیم ۱۶۸)

....

لیکن مجھے یہ ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

(ضرب کلیم ۱۶۸)

فہرست مضامین

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن' رازِ چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن

عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن
اُڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

....

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

(بانگِ درا: ۱۷۰۔۱۶۹)

اقبالؔ بھی اقبالؔ سے آگاہ نہیں ہے

شاعری ہر زبان کی دل آویز ہوتی ہے اور اُردُو شاعری تو دل کشی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ہر شاعر اپنا ایک مخصوص اُسلوب رکھتا ہے، لیکن اُردُو شاعروں کے اسالیب، اپنے تنوع اور تجدّد کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔ شاعر ہو یا نثار، ادیب ہو یا انشا پرداز، سب کے نطق و کلام کا ایک مخصوص مرکز ہوتا ہے۔ اسی میں وہ ترقی کرتے ہیں، یہیں سے وہ فروغ حاصل کرتے ہیں اور یہی ان کے عروج وارتقا کا سرچشمہ ہوتا ہے۔

اُردُو شاعروں کی فہرست بہت طویل ہے، شبِ فراق سے زیادہ دراز اور زلفِ دراز سے زیادہ طویل، شاعروں کی اس کثرت نے اُردُو زبان کو بہت زیادہ فائدہ پہنچایا، اس میں وسعت پیدا کی، لچک پیدا کی، گہرائی پیدا کی، تنوع پیدا کیا۔ اسی باعث اُردُو زبان کو نئے نئے محاورے ملے۔ نئی نئی دل آویز اور دِل کش ترکیبیں عالمِ وجود میں آئیں، نئے نئے خیالات پروان چڑھے، زبان کو حسنِ بیان ملا، حسنِ بیان کو زبان ملی۔ نطق و کلام میں زور اور جوش پیدا ہوا، نئے نئے اسلوب اُبھرے، نت نئے اندازِ بیان نمایاں ہوئے۔ سُبک، خوش نما اور خُوب رو الفاظ تخلیق ہوئے، ادائے مطالب کی دِل آویز صورتیں دماغ کی دُنیا سے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوئیں۔ اگر اُردُو شاعری میں یہ تنوع نہ ہوتا اور اُردُو شاعروں کی یہ کثرت نہ ہوتی تو ان تمام خوبیوں اور نعمتوں سے اُردُو زبان محروم رہ جاتی۔

اُردُو زبان کے شاعروں پر اگر ایک سرسری سی نظر ڈالی جائے تو جو چیز سب سے پہلے نمایاں ہو کر نظر کے سامنے آتی ہے، وہ ہے شاعروں کی یک رنگی، اور یک فنی اور یہ بات صرف

اُردو زبان ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے، ہر زبان کے شاعروں اور ادیبوں میں یہی بات نظر آتی ہے، جو شخص اپنے مزاج وطبیعت سے جس رنگ کو قریب پاتا ہے، اسے اختیار کر لیتا ہے۔ اس رنگ سے ہٹتا ہے، تو بہک جاتا ہے، لڑکھڑاتا ہے، ٹھوکر کھاتا ہے اور گر پڑتا ہے۔ اس کا سماں اس وقت بندھتا ہے، جب وہ اپنے رنگ میں نکھرتا اور اپنے طور پر میٹھے اور سُریلے بول بولتا ہے۔ جہاں اپنے طرز وطور سے ہٹا، طلسم ٹوٹا، بات بگڑی، رنگ اُڑا۔

میرؔ کی انفرادیت

میرؔ کو اہلِ نظر "خدائے سخن" کہتے ہیں۔ بات بھی یہی ہے، وہ درد، وہ سوز وگداز، وہ لذّت حرماں وہ نوائے جگر خراش، وہ سرودِ غم، وہ اشک مسلسل، وہ غم بے کراں، وہ یاس، وہ تڑپ، جو میرؔ کے اشعار میں ملتی ہے، کہیں اور کہاں مل سکتی ہے؟ ---- ہر کہ سوز دل خیز د بر دل ریزد ---- یہ بات جتنی میرؔ کے شعر پر صادق آتی ہے، مشکل سے کسی اور پر صادق آسکتی ہے، جو کیفیاتِ عشق کی یوں تصویر کھینچ سکتا ہے۔

جب نام ترا لیجیے تب اشک بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

جو سیدھے سادے سبک الفاظ اور روزمرہ کے محاورے میں ایک شعر کے اندر پورا دفترِ عشق یوں بیان کرسکتا ہے۔

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

یا جو حسن وعشق کی آویزش کا مرقّع، اس سادگی اور معصومیت کے ساتھ کھینچ سکتا ہے۔

یاں ہوئے خاک سے برابر ہم
واں وہی نازِ خود نمائی ہے

یا وہ عشق کا ماتم دل میں پیوست ہو جانے والے ان الفاظ میں کرسکتا ہے۔

مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ
کیا دوانے نے موت پائی ہے

یا جو زبانِ شعر سے یوں باتیں کر سکتا ہے۔

دل پر خوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے
جی رہا جائے ہے سحر سے آج
رات گزرے گی کس خرابی سے
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

❖

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیئے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی

اور جو خود اپنے بارے میں کہتا ہے اور بالکل بجا کہتا ہے۔

پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے
رہے گا دیر تک ماتم ہمارا

ماننا پڑے گا وہ اقلیمِ حرماں اور کشورِ یاس کا تاجدار ہے۔

میرؔ کی شاعری کے داخلی اور خارجی پہلو

میرؔ کی زندگی رنج والم کے بہت سے داخلی اور خارجی پہلو رکھتی ہے۔ میرؔ ۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ دس برس کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، سوتیلے بڑے بھائی نے نہ صرف یہ کہ گھر میں ٹکنے نہ دیا، بلکہ اپنے سگے اور میرؔ کے سوتیلے ماموں سراج الدین خاں آرزوؔ کا گھر بھی

بے چارے کے لیے جہنم بنا دیا۔ آخر وہاں سے بھی نکلے اور کم عمری ہی سے تلاشِ معاش میں سرگرداں ہو گئے۔ ابھی ۱۷ برس کے تھے کہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ درّانی ایک قیامت بن کر دتی پر ٹوٹا اور دتی کے خرمنِ امن و عافیت پر بجلی کی طرح گرا۔ دتی کا قتلِ عام میؔر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، یہ جوئے خوں ان کے سر سے گزری۔ اس قلزمِ خوں میں انہوں نے شناوری کی۔

نادر شاہ کے حملہ سے خاندانِ مغلیہ کا زوال شروع ہوتا ہے، ادبار و زوال، انحطاط و سقوط، تباہی و بربادی، ہلاکت اور خوں ریزی، انتشار اور طوائف الملوکی کے جو لرزہ خیز، بھیانک اور خوفناک مناظر میؔر نے دیکھ لیے وہ اتنی مختصر مدت میں چشمِ فلک نے بھی کم دیکھے ہوں گے۔ میؔر نے عماد الملک اور صفدر جنگ کی آویزشیں دیکھیں، نجیب الدولہ اور نجف خاں کا اُتار چڑھاؤ دیکھا، ان لوگوں کے ہاتھوں شاہانِ مغلیہ کو کٹھ پتلی کی طرح ناچتے دیکھا، نہ صرف ناچتے دیکھا، بلکہ ان کی آنکھوں میں سلائیاں پھرتے اور انہیں اندھا ہوتے دیکھا، خاندانِ شاہی کے افراد کو فاقہ مست اور آشفتہ روزگار دیکھا اور بے اختیار پکار اٹھے۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انہی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

پھر فرماتے ہیں:

دتی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تخت و تاج کا

ابدالی کے بار بار حملوں نے دتی کو جس طرح لوٹ لیا تھا، مرہٹوں کی مسلسل ترک و تاز اور تاخت و تاراج نے جس طرح دتی والوں کو زندگی سے مایوس اور خودکشی پر آمادہ کر دیا تھا، باہمی آویزشوں اور خانہ جنگیوں نے جس طرح دتی کو خراب اور کھنڈر بنا دیا تھا، یہ سب کچھ میؔر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، ایک وہ زمانہ تھا کہ دلی کی تعریف میؔر نے ان الفاظ میں کی تھی:

دتی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی، تصویر نظر آئی

پھر جب یہ اوراقِ مصور بکھرے، فضائے آسمانی میں ان کی دھجیاں اُڑیں اور پاؤں سے یہ رَوندے گئے تو میر پکار اٹھے

دلّی ہوئی ہے ویراں سُونے کھنڈر پڑے ہیں
ویران ہیں محلّے ، سُنسان گھر پڑے ہیں
دیکھا تو اس چمن میں، بادِ خزاں کے ہاتھوں
اُکھڑے ہوئے زمیں سے کیا کیا شجر پڑے ہیں
بلبل کا باغباں سے اب کیا نشان پوچھوں
بیرونِ درِ چمن کے اک مشت پر پڑے ہیں

مشاہداتِ میر

میر نے اپنی آنکھوں سے بکسر کی لڑائی دیکھی (۱۷۶۴ء)۔ اس لڑائی نے انگریزوں کے حق میں تختِ حکومت کا فیصلہ کر دیا۔ شجاع الدولہ کی کمر ہمت ٹوٹ گئی۔ بنگال اور بہار پر انگریزوں کی حکومت اور اس پر تسلط اور بادشاہِ دلّی پر اقتدار قائم ہو گیا۔ پھر میر نے غلام قادر روہیلہ کے وہ ننگِ انسانیت اور شرمناک اور حد درجہ گھناؤنے مظالم بھی دیکھے جو اس نے (۱۷۸۸ء) خاندانِ شاہیں اور شہنشاہ عالم و خالسیان شاہ عالم پر روا رکھے۔ ان مظالم کی تفصیل لکھتے ہوئے قلم کا جگر شق ہوتا ہے۔ میر نے یہ سب کچھ دیکھا، آہ کی اور کلیجہ مسوس کر رہ گئے

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو(۱۰۰) مرتبہ لُوٹا گیا

پھر میر نے یہ بھی دیکھا کہ روہیلہ کے بعد مرہٹے دلّی پر قابض ہو گئے۔ بادشاہ ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گیا اور وہ بادشاہ کی آڑ لے کر سارے ملک پر حکومت کرنے لگے اور حکومت کے پردہ میں لوٹ کھسوٹ، مار دھاڑ، قتل و غارت اور تباہی و بربادی کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہندو تک ان کے ہدفِ ستم بننے سے نہ بچ سکے، ان کی عورتیں بھی بے آبرو کی گئیں اور ان کا مال بھی لُوٹا گیا۔ مسلمانوں کی طرح، ان کی عورتیں بھی کوئیں میں پھاندنے اور ان کے مرد بھی خودکشی کرنے پر مجبور ہو گئے، میر نے یہ نظارہ دیکھا اور کہا

اے بتو اس قدر جفا ہم پر
عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم
کوئی خواہاں نہیں ہمارا میر
گویا جنس ناروا ہیں ہم

پھر فرمایا۔

خوش نہ آئی تمہاری چال ہمیں
یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے ، سنو ہو یہ بستی اُجاڑ کے

اب خرابہ ہوا جہاں آباد
ورنہ ہر ایک قدم پہ یاں گھر تھا

یہ سب کچھ دیکھ چکنے کے بعد اپنے دلِ حزیں کو تسلی دیتے ہیں۔

تو ہے بے چارہ گدا میر ترا کیا مذکور
مل گئے خاک میں یاں صاحب افسر کتنے

آخر اس جھوٹی تسلی سے بھی کام نہیں چلتا بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں۔

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا!

اور اس صورت حال کا علاج تجویز کرتے ہوئے اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہیں۔

موتی سے تیرے اشک ہیں غلطاں کسو طرف
یاقوت کے سے ٹکڑے ہیں لختِ جگر کہیں
تا کے یہ دشت گردی کب تک یہ خستگی
اس زندگی سے کچھ تجھے حاصل بھی مر کہیں

سنگِ حوادث نے میرؔ کے قلب نازک کو چُور چُور کر دیا تھا، ان کی بات آہ بن گئی تھی، ان کے الفاظ خود بخود نالے کی صورت اختیار کر لیتے تھے اور ویسے بھی دل چوٹ کھایا ہوا تھا۔ عشق ناکام نے حوصلوں اور امیدوں، آرزوؤں اور تمناؤں کو ختم کر دیا تھا۔ عاشق ہوئے ہیں لیکن عشق وہ تھا جو کامران نہ تھا، حرماں نصیب تھا، دل اور زیادہ دُھنس گیا، طبیعت اور زیادہ بجھ گئی، آنسو کے موتی آنکھ کی سیپی سے نکلنے کے لیے بے چین ہونے لگے، اپنی رودادِ محبت کی طرف خود اشارہ کرتے ہیں۔

کبھو کف بہ لب مست رہنے لگا
کبھو سنگ در دست رہنے لگا
وہی جلوہ ہر آن کے ساتھ تھا
تصوّر مری جان کے ساتھ تھا
اسے دیکھوں جیدھر کروں میں نگہ
وہی ایک صورت ہزاروں جگہ
گل تازہ شرمندہ رو اس سے ہو
نجل مُشک ناب اس کے گیسو سے ہو
سراپا ہیں جس جا نظر کیجیے
وہیں عمر اپنی بسر کیجیے
کہیں نقشِ دیوار دیکھا اسے
کہیں گرم رفتار دیکھا اسے
کبھو صورت دلکش اپنی دکھائے
کبھو اپنے بالوں میں منہ کو چھپائے
کبھو گرم کینہ ، کبھو مہرباں
کبھو دوست نکلے ، کبھو خصمِ جاں

اور آخر کار

نہ دیکھا کبھو میرؔ ، پھر وہ جمال
وہ صحبت تھی گویا کہ خواب و خیال

یہی وجہ تھی کہ میرؔ کچھ سے کچھ ہو گئے، یعنی آدمی سے عاشق بن گئے۔

کیا میرؔ ہے یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا
نم ناک چشم و خشک لب و رنگ زرد سا

پوچھا جو میں نے دردِ محبت سے میرؔ کو
رکھ ہاتھ اس نے دل پہ ٹک اک اپنے رو دیا

میرؔ اور "عشق"

میرؔ کے والد صوفی باصفا اور درویش بوریہ نشین تھے۔ صوفی کی خانقاہ اور زاویہ میں جس چیز کی حکومت ہے وہ "عشق" ہے۔ "عشق مجازی" سے "عشق حقیقی" تک پہنچنا، اس دبستاں کا سب سے پہلا سبق ہے۔ میر ایک صوفی کے گھر میں پیدا ہوئے، ایک درویش کی گود میں پروان چڑھے، اپنی معصوم آنکھوں سے، عشق کی کافر جوانی کے بہت سے واقعات و حادثات انہوں نے دیکھ ڈالے، بچپن کا نقش بڑا گہرا ہوتا ہے۔ یہ نقش کچھ اس طرح دل کی انگشتری پر نگینہ بن کر بیٹھا کہ جیتے جی اور مرتے مرتے اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ میرؔ کے اشعار میں عشق کی عظمت اور بزرگی، اجلال و احترام اور رکھ رکھاؤ کے نمونے بہت سے ملتے ہیں:

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق
عشق معشوق ، عشق عاشق ہے
یعنی اپنا ہی جلا ہے عشق
کون مقصد کو ، عشق بن پہنچا
آرزو عشق ، مدعا ہے عشق

ظاہر باطن، اوّل آخر، پائیں بالا عشق ہے سب
نور و ظلمت، معنی و صورت سب کچھ آپ ہوا ہے عشق

درد ہی خود ہے، خود دوا ہے عشق
شیخ کیا جانے تو کہ کیا ہے عشق
یہ نہ ہووے تو نظم کل اُٹھ جائے
سچ ہیں شاعراں، خدا ہے عشق

ان مشاہدات اور کیفیات، یعنی داخلی اور خارجی محرکات نے جہاں میر کو ذاتی طور پر رنج و حرماں، اور غم و یاس کا پیکر بنا دیا تھا، وہاں ان کے اشعار میں بھی سوز و درد، کسک اور تڑپ کی کیفیت پیدا کر دی تھی اور ان سب چیزوں نے مل کر میر کو خدائے سخن اور ان کے کلام کو مجموعۂ سوز و گداز بنا دیا تھا، اس میں ایسا نکھار اور ایسی سجاوٹ پیدا کر دی تھی کہ میر خود کہتے ہیں۔

جو دیکھو مرے شعر تر کی طرف
تو مائل نہ ہو پھر گہر کی طرف

میر اور دیگر اصناف سخن

لیکن یہی میر جب اپنی حد سے قدم آگے بڑھاتے ہیں اور دوسرے اصناف سخن پر طبع آزمائی کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے اپنی عظمت اور منزلت پر خود خاک ڈال رہے ہیں۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میر کی خوشنوائی پر انشاء کا پھکڑ پن اور سودا کی منہ زوری اور جرأت کی طراری غالب آگئی ہے۔

بھلا آپ باور کر سکتے ہیں ملک الشعراء اور خدائے سخن کا یہ شعر بھی ہو سکتا ہے؟

میر کیا خوب ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

یا پھر یہ شعر میرؔ کا ہو سکتا ہے؟

کیا پہناوا خوش آتا ہے ان لڑکے چسپاں پوشوں کا
مونڈھے چپسے ہیں، چول پھنسی ہے، ٹیڑھی ٹیڑھی کلاہیں ہیں

لیکن یہ انہی کے شعر ہیں، مگر ان کے رنگ سے بالکل مختلف، متضاد، متغائر۔

غالبؔ کا رنگِ سخن

غالبؔ کی عظمت کے خود اقبالؔ ثنا گستر ہیں، اس کی عظمت پر ایک مستقل نظم کہہ چکے ہیں، خود اقبالؔ کی تعریف شروع شروع میں اس طرح کی جاتی تھی کہ اُردو زبان میں ایک دوسرا غالب پیدا ہو گیا اور وہ اس انتساب سے بجا طور پر فخر محسوس کرتے تھے، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ہندوستان کی دو کتابوں کو ''الہامی'' مانتے تھے۔ ایک وید مقدس، دوسری مجموعۂ کلام غالبؔ اور بلاشبہ غالب اس طرح کے خراجِ تحسین کے سزاوار بھی تھے۔ ان کی رفعتِ شان، علوالمرتبت اور سادگی و پرکاری انہی سے شروع ہوئی اور انہی پر ختم ہو گئی۔ وہ بیک وقت شاعر بھی تھے اور فلسفی بھی اور سپاہی زادے بھی۔ اپنی اور اپنی سپہ گری پر انہیں ناز تھا، اپنی فلسفیانہ منزلت کے وہ خود معترف تھے۔ اپنی شاعری کے آگے وہ مانے ہوئے اساتذہ کو ہیچ سمجھتے تھے۔ رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب تاریخ ادب اُردو میں غالب کے فضائل و مناقب، خصائص اور کمالات بیان کرنے کے بعد یورپ کے چند شعرا سے ان کا مقابلہ کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

غالبؔ اور مغربی شعراء

''براؤننگ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ رُوح کا تجزیہ کرتا ہے۔ مرزا غالب تجزیہ اس قدر نہیں کرتے جتنا رموز روحانی کے عمق کو دریافت کرتے ہیں۔ ان کا کلام مثل مولانا روم وغیرہ کے سراپا اسرار تصوف نہیں ہے اور نہ من اوّلہ الی آخرہ کوئی فلسفہ ہے، مگر حقائق و رموز کا ان کے کلام میں جا بجا پرتو موجود ہے۔ ان کو صوفی براؤننگ کہنا بجا ہے۔ ہر چند کہ

براؤننگ کے کھرّے پن اور اکھڑ پن سے ان کا کلام پاک ہے۔

حزن و یاس میں ان کا مقابلہ جرمنی کے شاعر ''ہین'' سے خوب ہو سکتا ہے مگر فی الحقیقت اگر کوئی فلسفی شاعر ان کا مدِ مقابل یورپ میں گزرا ہے تو وہ جرمنی کا مشہور و معروف شاعر گوئٹے ہے، غالبؔ میں تین جزوں کا اجتماع ہو گیا ہے، یعنی فلسفی کی عقل و ادراک، صوفی کی نگاہ دُور بین چابکدست مصوّر کا نازک ہاتھ، ان کی صنعت پُر کاری اور پُر کاری صنعت ہے۔ حسن حق ہے اور حق حسن ہے۔ وہ ایک صوفی، صاف دل تھے اور ان کا یہ قول بالکل صحیح ہے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

ان کا تصوف کوئی شغل دلچسپی نہیں اور نہ ان کی شاعری محض خیالی شاعری ہے، بلکہ وہ واقعات و واردات سے لبریز ہے اور اس وجہ سے اس کا شمار دنیا کی بہترین شاعری میں کیا جا سکتا ہے۔''

میرؔ اور غالبؔ کی مماثلت

سکینہ صاحب، نے جو کچھ فرمایا ہے اس کے علاوہ بھی مرزا غالب کچھ خصوصیات رکھتے تھے، بلکہ ان میں اور میرؔ میں ایک طرح کی مشابہت بھی پائی جاتی ہے۔ میرؔ کی طرح غالبؔ بھی تصوّف کی لذّت سے آشنا تھے۔ غم و حرماں سے لگاؤ رکھتے تھے، میرؔ نے بہت سی عالم آشوبیاں اپنی طویل عمر میں دیکھیں، غالبؔ بھی اس سے محروم نہ رہے، انہوں نے اپنی آنکھوں سے دلّی کا شہر آشوب دیکھا، ۱۸۵۷ء کا غدر اُن کی آنکھوں کے سامنے ہوا اور ایک پل کے لیے اس ساری مدّت میں وہ دلّی سے باہر نہیں نکلے۔ تلنگوں کی سفاکیاں اور انگریزوں کی درندگیاں، انہوں نے بہ چشم خود ملاحظہ کی تھیں، عورتوں کی بے آبروئی، بچوں کا وحشیانہ قتل، بے گناہوں کی پھانسی کے جگر خراش مناظر ان کی نظروں کے سامنے گزرے تھے۔ جس بادشاہ کو وہ ظل اللہ کہتے تھے، وہ ان کے

سامنے گرفتار ہوا ''عدالت'' سے سزایاب ہوا اور رنگون جلاوطن کر دیا گیا، بہت سے دوست، جن سے جسم و جاں کی طرح ربط و تعلق تھا، جلاوطن ہوئے، پھانسی چڑھے یا ایسے روپوش ہوئے کہ پھر ان کا پتہ نہ ملا۔ وہ تہذیب، وہ تمدن وہ معاشرت جس میں انہوں نے آنکھ کھولی تھی، پروان چڑھے تھے، ان کے دیکھتے دیکھتے مٹ گئی، تباہ ہوگئی۔ میرؔ اور مرزا غالبؔ کے زمانہ کی تباہیوں میں فرق یہ ہے کہ میرؔ کے زمانہ میں ایک بادشاہ گیا دوسرا آیا۔ یہ قتل ہوا، وہ سریر آرائے مملکت ہوا، اس کی آنکھیں نکال لی گئیں، وہ دھوکے سے قتل کر دیا گیا، لیکن تہذیب وہی رہی، معاشرت وہی رہی، اقدارِ حیات میں کوئی فرق نہیں آیا، غالبؔ کے زمانہ میں یہ ہوا کہ ایک بساط اُلٹ گئی، دوسری بچھ گئی۔ اب تک اُنہوں نے جو کچھ دیکھا تھا، ہوتا تھا وہ سب نسیا منسیا ہو گیا۔ حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا، نقشِ باطل کی طرح کھرچ دیا گیا۔ حکومت ہی نہیں بدلی، حکمران بھی بدل گئے، اقدارِ حیات بھی بدل گئے، تہذیب، معاشرت بھی بدل گئی۔ احوال و کیفیات بھی بدل گئے۔ حق تھا کہ غالبؔ کے کلام میں ان حوادث کی جھلکیاں ملتیں، لیکن ان کے خطوط و رقعات میں ان کی لکھی ہوئی تاریخ غدر ''دستنبو'' میں تو کافی واقعات و اشارات مل جاتے ہیں، لیکن ان کے کلام میں ان عالمِ آشوب واقعات کی جھلک، رمزیت اور اشاریت کی صورت میں بھی بہت کم ملتی ہے۔ ہاں، جو ان کا خاص موضوع ہے، فلسفہ اور اسرارِ حیات، وہ ہر جگہ بکھرا پڑا ہے۔ الم دوستی اور اذیت پرستی کی مثالیں بھی ملتی ہیں، اور خوب ملتی ہیں، کہتے ہیں۔

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے؟

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

غالبؔ کچھ اپنے بخت سے کہنا نہیں ہمیں
خرمن جلے اگر نہ غم ہائے کشت کو

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑہ برہمن کو

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہے غیب غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب ہیں

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اپنی محبوبہ کا مرثیہ کہتے ہیں:

عمر بھر کا تُو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

اپنے متبنّیٰ کا مرثیہ کہتے ہیں:

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

غالبؔ کے کلام میں ابتذال کی مثالیں

غرض کلامِ غالبؔ کے داخلی اور خارجی موثرات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ گو ان کی زندگی اضطراب و اضطرار کے عالم میں گزری، نہ دل کی حسرتیں پوری ہوئیں، نہ سکون و عافیت کی دولت ہاتھ آئی۔ بڑے بڑے دل دوز اور جگر خراش حادثات دیکھے، بیتے، محسوس کیے، لیکن جو رنگ اپنا قائم کر چکے تھے اس سے سرِ مُو نہ ہٹے اور کبھی ہٹے بھی تو پہچان لیے گئے کہ بہک رہے ہیں، غلط جا رہے ہیں، مثلاً فرماتے ہیں:

دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

یا فرماتے ہیں:

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

یا ارشاد ہوتا ہے:

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

بے شک یہ اشعار غالبؔ کے ہیں، لیکن غالبؔ کا رنگ کہاں؟ رنگ سے ہٹے اور بے رنگ ہوئے۔

حسرتؔ موہانی کا رنگِ سخن

حسرتؔ موہانی، سید الاحرار اور رئیس المتغزلین تھے، ان کی ساری زندگی برطانوی سامراج کے خلاف لڑتے گزری، زندگی کا بڑا حصہ قید و بند میں گزرا۔ کلام کا بہت بڑا حصہ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں لکھا گیا اور مرتب ہوا۔

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
کیا طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرتؔ
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

لیکن اس طرح کے ہلکے پھلکے اشارے جو خارجی عناصر پر دلالت کرتے ہوں، کلامِ حسرت میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ ان کا اصل رنگ تغزل ہے۔ معاملہ بندی، محاکات، حکایتِ غمِ دل۔ حالانکہ حسرت کا زمانہ، میرؔ اور غالبؔ سے زیادہ پُر آشوب تھا۔

میرؔ کے زمانہ میں تاخت و تاراج کا سلسلہ اندرونِ ہند میں جاری تھا۔ کبھی کبھی کوئی غیر ملکی حکمران، دولت سمیٹنے کے خیال سے کچھ عرصہ کے لیے آ جاتا تھا، پھر واپس چلا جاتا تھا، غالبؔ کے زمانہ میں جو تباہیاں آئیں، ان کا تعلق بھی زیادہ تر صرف دلّی اور چند دوسرے غدر سے متاثر شہروں تک محدود رہا۔ اُن کی کوئی آفاقی حیثیت نہیں تھی، لیکن حسرتؔ موہانی کے دور میں عالمِ اسلام کے حصے بخرے ہو رہے تھے، طرابلس پر اطالیہ قابض تھا۔ شام و لبنان فرانس کے تصرف میں

تھے۔ عراق، مصر اور متعدد دوسرے مقامات برطانوی قبضہ میں آ چکے تھے۔ عزل خلافت ہو چکا تھا اور خلیفۃ المسلمین ایک غیر مسلم ملک میں پناہ گزیں کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے تھے، ترکوں اور یونانیوں کی آویزش اور اتحادی حکومتوں کی شہ نے سمرنا کو لاشوں کا شہر بنا دیا تھا۔ غرض ساری دنیائے اسلام میں ایک عجب طرح کی افراتفری اور تباہی و بربادی کی صورت نظر آ رہی تھی۔ خود ہندوستان میں گولیاں چل رہی تھیں، مارشل لاء نافذ ہو رہا تھا۔ آزادی کی تحریک زور و قوت اور تشدد سے کام لے کر دبائی جا رہی تھی۔ حسرتؔ نہ صرف یہ کہ ان واقعات سے ناواقف نہیں تھے بلکہ ایک سرفروش مجاہد کی طرح ہر خطرہ سے بے نیاز ہو کر، پامردی اور دلیری کے ساتھ میدانِ جنگ میں ڈٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے برطانوی سنگینوں کا مقابلہ کیا۔ بندوقوں کے سامنے سینہ کھول کر کھڑے ہو گئے، تلوار کی چمک ان کی نظروں کو خیرہ نہ کر سکی۔ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی اور وہاں کے ننگ انسانیت مظالم، ان کے عزم و ثبات میں لغزش نہ پیدا کر سکے۔ یہ سب کچھ ہوا، لیکن ان کی شاعری جو اُردُو ادب کی گراں مایہ متاع اور نہایت قیمتی پونجی ہے، ان اثرات و نقوش سے خالی رہی۔ کہیں کہیں اگر کچھ اشارے ملتے بھی ہیں تو غیر مؤثر۔

حسرتؔ کا اصل رنگ تغزل ہے۔ واقعی وہ رئیس المتغزلین ہیں، جو شخص یہ کہہ سکتا ہو:

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

تری محفل سے ہم آئے مگر با حالِ زار آئے
تماشا کامیاب آیا، تمنا بے قرار آئی

نہ بھولے گا وہ وقت رخصت کسی کا
مجھے مڑ کے وہ اک نظر دیکھ لینا

عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے
مہر ذرّوں کو کیا ، قطروں کو دریا کر دیا

رعنائی و زیبائی و محبوبی و خوبی
کیا بات ہے جو اس قدِ دلجو میں نہیں ہے

تم جفا کار تھے کرم نہ کیا
میں وفادار تھا خفا نہ ہوا

انکار اور اک جرعۂ صہبا سے بھی انکار
ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہے گی

دل میں کیا کیا تھے عرضِ حال کے شوق
اس نے پوچھا تو کچھ بتا نہ سکے

کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر
ہم سے اظہارِ مدّعا نہ ہوا

قصہ درد کہوں ، شوق کا افسانہ کہوں
دل ہو قابو میں تو اس شوخ سے کیا کیا نہ کہوں

مجھ سے بھی خفا ہو ، مری آہوں سے بھی برہم
تم بھی ہو عجب چیز کہ لڑتے ہو ہوا سے

بے زبانی ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

بے مثالی کی ہے مثال وہ حسن
خوبیِ یار کا جواب کہاں؟

حسرت کا بے رنگ، رنگ

لیکن، یہی حسرت جب یہ کہتے ہیں:

حائل تھی بیچ میں جو رزائی تمام شب
اس غم سے ہم کو نیند نہ آئی تمام شب
بیباک ملتے ہی جو ہوئے ہم تو شرم سے
آنکھ اس پری نے پھر نہ ملائی تمام شب

یا فرماتے ہیں:

اندھیرے میں وہ آ لپٹے تھے پہلے کس کے دھوکے میں
کہ آخر جب مجھے دیکھا تو شرما کر کہا تم ہو

بزمِ اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے
ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا

یقین آتا ہے کہ واقعی یہ حسرت بول رہے ہیں؟

غرض شعراء کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

ہر شاعر کا جداگانہ رنگ جداگانہ صنفِ سخن

ناسخ کا رنگ اور ہے آتش کا دوسرا، غالب کا اندازِ غزل سرائی کچھ اور ہے، مومن کا اسلوبِ سخن کچھ اور، داغ کچھ ہیں امیر کچھ، جو ریاض ہیں وہ جلال نہیں، جو جلال ہیں وہ ریاض نہیں۔ اصغر، جگر اور حسرت کی شاعری پر لوگ سر دُھنتے ہیں، لیکن اصغر کا رنگ جگر سے، جگر کا اصغر سے اور حسرت کا ان دونوں سے مختلف ہے۔ ان سب کی شاعری کی بنیاد اسی مخصوص ''رنگ'' اور ''طرز'' پر ہے جو یہ اپنے لیے مخصوص کر چکے۔ انیس نے اُردو زبان کو ایک بالکل نئی چیز دی۔ مرثیہ۔ انیس سے پہلے یہ بات ضرب المثل بن گئی تھی کہ بگڑا شاعر ''مرثیہ گو''، یعنی جو شاعر کسی صنفِ سخن میں کمال نہیں حاصل کر سکتا وہ مرثیہ گو بن جاتا ہے، لیکن انیس نے اس زمین کو آسمان کر دیا، مگر وہی انیس دوسرے اصنافِ سخن میں وہ بات نہ حاصل کر سکے۔ ذوق نے جتنے شاندار قصیدے کہہ ڈالے، غالب ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے، لیکن غالب نے زمینِ سخن پر جو گل بوٹے کھلائے، وہ ذوق کی رسائی سے دُور ہیں۔ جو شکوہِ الفاظ مومن کے ہاں موجود ہے وہ غالب کے ہاں نہیں، جو سوز اور تڑپ درد کے کلام میں ہے وہ سودا کے ہاں کہاں؟ سودا نے جیسے قصیدے کہہ ڈالے، جیسی ہجویں کہہ لیں، جیسے محاورے پیدا کیے اور ترکیبیں ایجاد کیں وہ بات ان کے کسی دوسرے معاصر کو نہ حاصل نہ ہو سکی۔ نظیر اکبرآبادی، اُردو زبان میں ''نیچرل'' شاعری کے بانی ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس کا جواب آج تک نہ ہو سکا۔ لیکن یہی نظیر، اگر میر اور مرزا کا رنگ اُڑانے کی کوشش کرتے تو کون ان کی سنتا؟ شبلی نے جیسی ولولہ انگیز، پُر جوش اور وجد آفریں قومی نظمیں کہیں، حالی کو اگر ان سے بھڑا دیا جائے تو پچھڑ جائیں گے۔ لیکن حالی نے صرف مسدّس، مدو جزرِ اسلام میں جو جذبہ بھر دیا ہے، وہ شبلی کی تمام نظموں پر بھاری ہے۔ وہ بجائے خود ایک بہت بڑا قیمتی اور گراں مرتبت سرمایہ ہے۔

شاعر کی انفرادیت

غرض ہر شاعر اپنی انفرادیت پر زندہ ہے، ایک مخصوص رنگ کا تابع ہے، ایک خاص اسلوب ہے جس پر اس کی عظمت وجلال کا ایوان قائم ہے، اس رنگ اور اسلوب سے بغاوت کر کے وہ اپنا وقار قائم نہیں رکھ سکتا۔

اقبالؔ کی خصوصیت

لیکن اقبالؔ ہر جہتی شاعر ہے۔ وہ غزل گو بھی ہے اور قصیدہ خواں بھی، مناظرِ قدرت، اور مظاہرِ فطرت کا پرستار بھی اور کشورِ دل کی تباہی اور بربادی کا سوگوار اور ماتم دار بھی، وہ نعت بھی کہتا ہے اور منقبت بھی اور حمد بھی، وہ زندگی کے مسائل سے بھی بحث کرتا ہے اور فلسفہ کی گتھیاں بھی سلجھاتا ہے، وہ شاعر بھی ہے، اور فلسفی بھی، وہ زمین پر رہتا ہے اور

ع پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتا ہے

آسمان کی خبریں لاتا ہے، وہ طنز وتعریض بھی کرتا ہے، اور مزاح وظرافت سے بھی کام لیتا ہے۔ وہ نئی نئی ترکیبیں بھی وضع کرتا ہے۔ تشبیہ اور استعارے سے بھی کام لیتا ہے۔ نئے نئے الفاظ بھی تراشتا ہے۔ وہ سیاست کی باتیں بھی کرتا ہے، شخصیتوں کو زیرِ بحث لاتا ہے۔ تاریخ کا سمندر بھی کھنگالتا ہے، روایاتِ سلف کا تذکرہ بھی کرتا ہے، عقیدہ قومیت اور وطنیت کی دھجیاں بھی فضائے آسمانی میں اُڑاتا ہے اور ان تمام مختلف اور متنوع حیثیتوں میں وہ فرد نظر آتا ہے۔ اس کی انفرادیت کہیں مجروح نہیں ہوتی۔ اس کا آب ورنگ کبھی نہیں اُڑتا۔ اس کا دبدبہ اور طنطنہ ہر جگہ قائم رہتا ہے اس کے شکوہ معنی اور طلسم الفاظ سے کون ہے جو متاثر نہ ہو؟

اقبالؔ کو جس رنگ میں دیکھیے وہ یکتا اور بے ہمتا نظر آئے گا۔ اس کی غزل سرائی میں آمد ہے، آورد نہیں، وہ روتا ہے، تو دوسروں کو ہنسی نہیں آتی، رونا آجاتا ہے، وہ سینہ کوبی کرتا ہے تو دوسرے بھی اپنے جیب ودامن کو پھاڑنے لگتے ہیں، وہ قدرت کے مناظر، اور فطرت کے مظاہر کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔ وہ دل کا ماتم دار بھی ہے اور اس کا نقیب بھی۔ ہر خطرہ، ہر مصیبت اور ہر آفت میں وہ

اپنے دل کو رہنمائی کے لیے آگے بڑھاتا ہے۔اس کا دل وہ آفت کا پرکالہ ہے جو خطرات سے کھیلتا، طوفانوں سے معانقہ کرتا اور آفتوں کا خیر مقدم کرتا ہے۔وہ جب دوسروں کو طوفانوں سے ڈرتے اور خطروں سے جھجکتے دیکھتا ہے تو طنز کا تیر چلاتا ہے اور بے ساختہ پکار اُٹھتا ہے۔

ترا بحر پُر سکوں ہے' یہ سکوں ہے یا فسوں ہے؟
نہ نہنگ ہے، نہ طوفاں، نہ خرابیِ کنارہ!

(ضرب کلیم ۳۶)

وہ پر سکوں سمندر سے نفرت کرتا ہے اسے وہ سمندر چاہیے جس میں طوفان مچل رہا ہو، جس کی موجیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں، جہاں نہنگانِ اجل بڑھ بڑھ کر شکار کرنے کے لیے حملہ آور ہوتے ہوں، جس کا ساحل، ساحلِ امید نہ ہو، بلکہ ایسا شکستہ ساحل ہو، جس پر اترنا، جہاں پناہ پانا آسان نہ ہو، اس کی نظر میں زندگی اس وقت تک زندگی ہے، جب تک وہ خطرات سے دوچار ہو رہی ہو، طوفانوں سے نبرد آزما ہو رہی ہو، ہلاکتوں سے ٹکرا رہی ہو، اگر یہ نہیں تو پھر زندگی زندگی نہیں، موت ہے، بلکہ موت سے بھی بدتر۔

اس کا ترانۂ حمد اور زمزمۂ نعت و منقبت بے کیف الفاظ کا مجموعہ نہیں، وہ ایسا ترانہ اور ایسا زمزمہ ہے جس سے رُوح وجد میں آجاتی ہے، خیالات و افکار کی دنیا تہہ و بالا ہو جاتی ہے۔ سوچے سمجھے نظریات، عقیدۂ باطل کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔اس ترانہ کی دُھن اور اس زمزمہ کی لَے کچھ ایسی ہے کہ جو سُنتا ہے جھومنے لگتا ہے، سر دُھننے لگتا ہے، ہوش میں نہیں رہتا، مدہوش ہو جاتا ہے، اس کے ترانہ اور زمزمہ کی ترکیب و ترتیب صرف الفاظ کی رہینِ منت نہیں ہے، صرف خوش نما ترکیبوں اور خوبصورت جملوں کی تخلیق نہیں ہے، اس میں کچھ اور بھی ہے، کوئی ایسی چیز جو تیر کی طرح دل میں جا کر ترازو ہو جاتی ہے، جو دل کی دُنیا زیر و زبر کر دیتی ہے، جس میں نغمگی بھی ہے ترنم بھی، زیر و بم بھی، لیکن ان سب چیزوں سے بڑھ کر ایک اور چیز بھی ہے اور وہ ہے جنون۔۔۔ ہاں جنون، وہ جنون، جس کے لیے اقبال نے بڑی پیاری اور دل آویز اصطلاحیں گھڑی ہیں، یہ جنون اُن کے غریب خانہ میں مختلف بہروپ بھر کے مختلف رنگ اختیار کر کے، مختلف لباس پہن کر آتا ہے، لیکن رہتا جنون میں ہی ہے، یہ کبھی بے اثر نہیں رہتا، اس کا اثر، صرف دلوں پر نہیں ہوتا،

سنگ دلوں پر بھی ہوتا ہے، یہ پتھر کو موم، فولاد کو پانی، آگ کو گلزار کر دیتا ہے۔ وہ الفاظ سے نہیں کھیلتا، واردات بیان کرتا ہے اور یہی کیفیت، نو بہ نو، لباس سے آراستہ ہو کر اس کے کلام میں بجلی کی طرح چمکتی اور آتشِ خرمن سوز کی طرح اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے نیا نہیں ہے۔ اس دنیا میں ہر چیز نئی ہو سکتی ہے، لیکن سچائی میں کوئی ندرت اور جدّت کہاں سے لائے گا۔ سچائی تو اتنی ہی پرانی ہے جتنی یہ دُنیا بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ، ہاں تو وہ جو کچھ کہتا ہے وہ نیا نہیں ہے، لیکن اس کا انداز نیا ہے، اسلوب نیا ہے، طرز نیا ہے، اصل قیمت انداز و اسلوب اور طرز ہی کی ہوتی ہے اور یہ چیز جس افراط سے اقبال کے نگار خانہ میں ملتی ہے کہیں اور نہیں ملتی۔۔۔۔مل ہی نہیں سکتی۔

کلامِ اقبالؔ کا امتیازی پہلو

وہ جب زندگی کے مسائل سے بحث کرتا اور فلسفہ کی گتھیاں سلجھاتا ہے تو اس کی حیثیت کچھ عجیب سی ہو جاتی ہے، زندگی کے مسائل سے وہ لوگ بھی بحث کرتے ہیں جن کا پیشہ قیادت اور رہنمائی ہے، جو اقتصادیات و معاشیات کے عالم ہیں، جو سیاست بین الاقوام کے امام ہیں، لیکن ان کے ایک ایک بول اور ہر ہر لفظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے یہ زندگی سے خائف ہیں، اس سے ڈرتے ہیں، جھجکتے ہیں، اس کی خاطر اسے خوش کرنے کے لیے اسے حاصل کرنے کو، یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ان کے قدم جب بھی آگے اُٹھتے ہیں تو یہ کچھ تھکے تھکے سے، ہراساں ہراساں سے، سہمے سہمے سے نظر آتے ہیں، یہی حال ان لوگوں کا ہے، جو فلسفہ کی گتھیاں سلجھاتے ہیں، وہ ڈور کی گرہیں کھولتے ہیں، لیکن ڈور کا سرا نہیں ملتا، وہ فلسفۂ حیات و مابعد الطبیعات سے بحث کرتے ہیں، لیکن کچھ اور الجھنیں پیدا کر دیتے ہیں۔ کچھ نئے مسائل کھڑے کر دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو فلسفہ کے سامنے سپر افگندہ ہو چکے ہیں، جو فلسفہ سے مرعوب ہیں، جو فلسفہ کا اتنا ہی احترام کرتے ہیں جتنا ایک سپاہی سپہ سالار کا اور جو فلسفہ سے اتنے ہی لرزاں و ترساں ہیں جتنا ایک اچھوت برہمن سے اور جو فلسفہ کو اتنا ہی ناگزیر سمجھتے ہیں جتنا ایک مے خوار، بادۂ گلرنگ کو، لیکن اقبال کی شان مختلف ہے، وہ زندگی کے مسائل سے اس طرح بحث کرتا ہے، جس طرح ایک فاتح اور کشور کشا، اپنے باجگواروں اور مفتوحوں سے مخاطب ہوتا ہے، وہ فلسفہ کے سامنے سپر افگندہ نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وہ فلسفی نہیں

ہے۔ وہ فلسفہ ساز ہے، فلسفہ گر ہے، اس کی جولانگاہِ افکار میں فلسفہ تخلیق ہوتا ہے اور وہاں سے ڈھل کر اس طرح نکلتا ہے جیسے ٹکسال سے سکہ۔ اس کی کارگاہِ فکر میں فلسفہ کے نظریے اس طرح تراشے جاتے ہیں جس طرح جوہری کی کارگاہ سے ہیرا ترش ترشا کر، نئے آب و رنگ اور شانِ جمال کے ساتھ گاہکوں کے ہاتھ میں جانے کے لیے دکان پر پہنچتا ہے۔ وہ زندگی پر بھی حکومت کرتا ہے اور فلسفہ پر بھی۔ وہ زندگی کے لیے قالب اور سانچا بناتا ہے۔ وہ فلسفہ کو جلا دیتا اور نکھارتا ہے، دونوں اس کے محکوم ہیں، تابع ہیں، دستِ نگر ہیں، وہی زندگی جو دوسروں کے ہاں رُوکھی پھیکی نظر آتی ہے، اقبالؔ کے تصرف میں آ کر اس کی قیمت بھی بدل جاتی ہے اور قسمت بھی۔ اب یہی زندگی، رعنائی کا پیکر اور برنائی کی تمثیل بن جاتی ہے، وہی فلسفہ، جو دوسرے فلاسفہ کے ہاں "فیل مست بے زنجیر" نظر آتا ہے اقبال کے دربار میں اس کی حیثیت مورِ ناتواں سے زیادہ نہیں۔ وہ فلسفہ کے طالب علموں کو نہیں مخاطب کرتا، نہ فلسفہ کے مریدوں کی طرف روئے سخن کرتا ہے۔ وہ وقت کے فلاسفہ کو ٹوکتا اور اپنی حکمت سے فلسفہ کو نیا آب و رنگ عطا کرتا ہے۔

اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ وہ بصارت بھی رکھتا ہے اور بصیرت بھی، فراست کا حامل بھی ہے اور ذکاوت کا بھی، وہ نزدیک بیں بھی ہے اور دُور اندیش بھی۔

عصرِ اقبال

اقبال نے جو زمانہ پایا وہ متقدمین اور متاخرین شعراء کو نہیں ملا، جس زمانہ سے اقبال نبرد آزما رہا، اس کے مزاج شناس نہ اس کے پیش رو تھے نہ ہم عصر۔ میں نے ابھی کہا تھا، اقبال نے جو زمانہ پایا، وہ متقدمین اور متاخرین شعرا کو نہیں ملا، یہ بات تو سمجھ میں آ سکتی ہے، لیکن متاخرین تو اسی زمانہ میں پیدا ہوئے، رہے اور مرے، انہیں اس زمانہ سے محروم کیوں کر دیا جا سکتا ہے۔ اس کے جواب میں مَیں عرض کروں گا کہ متاخرین بے شک اس زمانہ میں پیدا ہوئے، رہے، مرے، لیکن مرتے وقت تک وہ اتنے ہی معصوم رہے، جتنے پیدائش کے وقت تھے، انہوں نے یہ سوچنے کی کبھی کوشش نہ کی کہ زمانہ کدھر جا رہا ہے؟ اس کا تقاضا کیا ہے؟ اس کا مطالبہ کیا ہے؟ ضرورت اس کے سامنے سپر افگندہ ہونے کی ہے یا نبرد آزما ہونے کی؟ اس سے لڑنا چاہیے یا اس کے سامنے

سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے؟ اس کا مقابلہ کرنا چاہیے، یا اس کی اطاعت قبول کر لینی چاہیے؟ بے شک یہ لوگ اقبال کے دَور میں تھے، لیکن اقبال سے اور اس کے زمانہ سے بہت دُور، اتنے ہی دُور، جتنی دُور یہ زمین آسمان سے ہے، حد یہ ہے کہ حسرت موہانی، جو سیاست کی دنیا میں بجا طور پر "سید الاحرار" کے خطاب سے سرفراز تھے اور جن کی ساری زندگی ایک مجاہدِ بے ریا کی زندگی ہے، شاعری کی دنیا میں "عاشقانہ اور فاسقانہ" ہی پر سر دُھنتے رہے۔

عصرِ خویش سے اعلانِ جنگ

وہ اقبال ہی تھا جو اگرچہ نہتا تھا، لیکن جس نے عصرِ خویش سے اعلانِ جنگ کیا اور آخر وقت تک لڑتا رہا۔ نہ اس کے تیور میں فرق آیا، نہ ہمت میں، نہ عزم و حوصلہ میں، نہ جوشِ پیکار اور شوقِ رزم میں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس زمانہ کو، اس کے اقتضا اور مطالبہ کو اچھی طرح جانتا پہچانتا تھا۔ اس کا دل آزاد تھا، دماغ آزاد تھا، طبیعت آزاد تھی، مزاج آزاد تھا، وہ زندگی بھر غلامی کے خلاف صف آرا رہا، نہ وہ ذہنی غلامی کو جائز سمجھتا تھا، نہ جسمانی غلامی کو، اس نے جو کچھ دیکھا اپنی آنکھوں سے دیکھا، جو کچھ سوچا، اپنے دماغ سے سوچا، جو کچھ کہا، اپنی زبان سے کہا۔ افکار و خیالات اور نظریات و تصورات کی دریوزہ گری اس نے کبھی نہیں کی۔

اقبال اور فرنگ

اس نے یورپ کی دانش گاہوں میں تعلیم حاصل کی، وہ انگلستان اور جرمنی میں برسوں رہا اور اپنے انگریز و جرمن استادوں کا ثنا خواں اور مداح بھی رہا۔ اس نے مغربی ادب و لٹریچر کا مطالعہ کیا۔ اس نے مغربی علوم و فنون کھنگالے، اس نے مغربی اقدارِ حیات اور اطوارِ زندگی کو بہت نزدیک سے دیکھا۔ پرکھا، جانچا، لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی اس پر ربودگی اور سپردگی کی کیفیت نہیں طاری ہوئی، بلکہ اس کی خود شناسی اور خود نگری، خودی اور خود اعتمادی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ اپنے معنوی استاد نطشے کے بارے میں کہتا ہے:

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانہ میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے؟ (بالِ جبریل:۵۶)

وہ آرنلڈ کی شاگردی پر فخر کرتا رہا، آرنلڈ سے اس نے بہت کچھ سیکھا اور پایا، آرنلڈ کے ادب واحترام میں اس نے کبھی کوتاہی روا نہ رکھی، لیکن آرنلڈ کی قوم سے، وہ زندگی کی آخری سانس تک جنگ کرتا رہا۔ اس کے اقدارِ حیات اور اطوارِ زندگی کو ہیچ اور حقیر سمجھتا رہا، وہ للکارتا ہے۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دُکاں نہیں ہے!
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہو گا!

(بانگِ درا:۱۴۱)

اور پھر متنبہ کرتا ہے:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہو گا

(بانگِ درا:۱۴۱)

مرعوبیت اور سپردگی، یہ وہ الفاظ تھے جو اقبال کے لغت میں تھے ہی نہیں۔

استعمار اور سامراج کا دَور

اقبالؔ نے جس زمانہ میں آنکھیں کھولیں وہ استعمار اور سامراج کا دَور تھا، اس کے ہم عصر شعراء استعمار اور سامراج کے معنی بھی نہیں جانتے تھے اور وہ سامراج کے کرشمے دیکھ رہا تھا، وہ دیکھ رہا تھا دُنیا کس طرح پلٹا کھا رہی ہے؟ حالات کس طرح بدل رہے ہیں؟ واقعات یکے بعد دیگرے کیوں کر رُخ پلٹ رہے ہیں، حکومتیں کس طرح مِٹ رہی ہیں، مسلمان کس طرح مٹائے جا رہے ہیں؟ فرنگی اقتدار کس طرح ساری دنیائے اسلام پر مسلّط ہو رہا ہے؟ اور مسلمانوں پر کیسی شکست خوردہ ذہنیت طاری ہے، ان حالات کو دیکھ کر وہ دل شکستہ نہیں ہوا۔ ہر واقعہ، ہر حادثہ اس کے سمندِ عزم پر مہمیز کا کام دیتا رہا، کبھی وہ تاریخِ سلف کا ذکر کر کے اپنی قوم کا خون گرماتا، کبھی دل دوز اور مایوس کن حالات کو اس رنگ اور اس طور سے پیش کرتا کہ مایوسی کے بجائے، لوگوں کے سینہ میں عزم وہمت، استقامت اور ثابت قدمی کی موجیں لہریں لینے لگتیں، اس کی آہ بھی ولولہ سے بھرپور ہوتی، اس کے نالے میں بھی بجلیاں کوندتیں، اس کے آنسو موتی نہیں شعلہ بن کر گرتے اور

خاشاکِ غیر اللہ کو خاکستر کر دیتے۔

یورپ کا سفر سب ہی کرتے ہیں، اقبال نے بھی کیا، جہاز جب سسلی (جزیرہ صقلیہ) کی طرف سے گزرا، تو اقبال کے سامنے تاریخ کے وہ اوراق آگئے جب مسلمانوں نے اسے فتح کیا تھا۔ وہ یہاں حکومت کرتے تھے۔ یہ اسلامی ملک تھا، یہاں شاندار مسجدیں تھیں، درگاہیں تھیں، خانقاہیں تھیں اور اب۔۔۔۔۔۔ کچھ نہیں۔

اقبال کا حساس دل یہ دیکھ کر تڑپ گیا اور بے ساختہ وہ کہہ اٹھا:

غلغلوں سے جس کے لذّت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے ؟

(بانگِ درا: ۱۳۳)

پھر کس جوش کے ساتھ کہتا ہے:

آہ اے سسلی سمندر کی ہے تجھ سے آبرو
رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو
زیب تیرے خال سے رخسار دریا کو رہے
تیری شمعوں سے تسلّی بحر پیما کو رہے
ہو سبک چشمِ مسافر پر ترا منظر مدام
موج رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر مدام

(بانگِ درا:۱۳۳)

تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسنِ عالم سوز جس کا آتشِ نظارہ تھا

(بانگِ درا:۱۳۳)

کبھی وہ وطنیت کے فتنہ کی طرف اپنی قوم کو متوجہ کرتا ہے:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

(بانگِ درا: ۱۶۰)

پھر اُکساتا ہے:

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

(بانگِ درا: ۱۶۰)

پھر سمجھاتا ہے:

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

(بانگِ درا: ۱۶۱)

کبھی مسلمان نوجوانوں کو یاد دلاتا ہے:

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

(بانگِ درا: ۱۸۰)

ہلالِ عید پر نظر پڑتی ہے تو اسے تاریخ کی گزری ہوئی کہانیاں، بیتے ہوئے دن یاد آجاتے ہیں اور وہ اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

اوجِ گردوں سے ذرا دُنیا کی بستی دیکھ لے!
اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے!

(بانگِ درا: ۱۸۱)

طرابلس کے مسلمانوں پر، اطالیہ کے درندوں نے جو مظالم توڑے تھے انہیں دیکھ کر اقبال کا خون کھول جاتا ہے، غلام ہے، بے بس ہے، کچھ نہیں کرسکتا، حضور رسالت مآبؐ میں پہنچتا ہے اور یہ داستانِ درد سُنا کر ادب کے ساتھ عرض کرتا ہے:

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

(بانگِ درا:۱۹۷)

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

(بانگِ درا:۱۹۷)

حجاز میں شفاخانہ کھلتا ہے، کچھ لوگ اس کے پاس بھی چندے کے لیے پہنچتے ہیں، وہ جواب دیتا ہے:

اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

(بانگِ درا: ۱۹۸)

کارزارِ طرابلس میں، غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی ایک عرب لڑکی، فاطمہ بنت عبداللہ، اطالوی درندوں کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کرتی ہے۔ یہ خبر جب اقبال کے کانوں تک پہنچتی ہے تو فوراً اس کی زبان پر نالۂ منظوم جاری ہو جاتا ہے وہ اس کا مرثیہ کہتا ہے اور بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے۔

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی!
ایسی چنگاری بھی یا رب اپنے خاکستر میں تھی!

(بانگِ درا: ۲۱۴)

اور اپنے دل کو ایک نئی امید سے معمور کرتا ہے:

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں!

(بانگِ درا:۲۱۴)

تحریکِ خلافت ہندوستان میں ایک طوفان کی طرح نمودار ہوتی ہے۔

تحریکِ خلافت، علی برادران اور اقبال

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

اس تحریک کے روح رواں علی برادران تھے، وہ گرفتار ہوتے ہیں، اقبال اگرچہ اس وقت تک عملی سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیتے تھے، لیکن مجاہدینِ ملّت کی گرفتاری پر خاموش نہ رہ سکے:

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

(بانگِ درا: ۲۵۳)

عزلِ خلافت کے بعد، جب اتحادی حکومتوں نے ترکیہ کے حصے بخرے کرنا شروع کیے، کچھ خود لے لیا، کچھ دوسروں کو عطا کر دیا، تو ہندوستان سے ایک ''خلافت ڈیلی گیشن'' یورپ کے دورہ پر روانہ ہوا تاکہ لائڈ جارج اور اتحادی حکومتوں کے سربراہوں کی خدمت میں مسلمانان ہندوستان کے جذبات وتاثرات پیش کرے، اقبال کی غیرتِ ملی اسے برداشت نہ کر سکی:

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی!

(بانگِ درا: ۲۵۴)

لندن کی گول میز کانفرنس کے دورانِ شرکت میں مولانا محمد علی کا انتقال ہو گیا تو اختلافِ مسلک اور اختلافِ فکر ونظر کے باوجود اقبال تڑپ گئے، انہوں نے محمد علی کی خدمت میں بہ صورتِ مرثیہ ایسا شاندار خراجِ تحسین پیش کیا جس کی مثال ان کی شاعری میں نہیں ملتی۔

جلوۂ او تا ابد باقی بہ چشم آسیاست
گرچہ آں نورِ نگاہ خاور از خاور گزشت

دیوبند کے مولانا حسین احمد مدنی نے جو تقسیم ہند اور قیامِ پاکستان کے سخت مخالف تھے اور کانگرس کے جاں نثاروں میں تھے، یہ نعرہ لگایا کہ:

''قومیں اوطان سے بنتی ہیں''

ایک عالمِ دین کی زبان سے یہ الفاظ سن کر اقبال کو ایک دھچکا سا لگا، اس موقعہ پر انہوں نے جو چند شعر کہے وہ اپنی جگہ پر معرکہ آرا اور نا قابل فراموش ہی ہیں، لیکن آخری شعر ان کی شاعری بلکہ رُوحِ اسلام کا عطر ہے۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

(ارمغان حجاز:۴۹)

اقبالؔ خود کیا تھا؟ اقبالؔ کا ''انا''

غرض کہ اقبالؔ کی زندگی اور اقبالؔ کی شاعری میں پوری مطابقت اور ہم آہنگی ہے۔ جو کچھ دل میں آتا ہے کہتے ہیں، جو کچھ کہتے ہیں چوں کہ وہ خلوص وسچائی پر مبنی ہوتا ہے لہٰذا بے خوف و بے جھجک ہو کر کہتے ہیں، اگر چہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں:

لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

(بال جبریل: ۱۰۰)

ضروری ہے کہ ایسی گونا گوں صاف رکھنے والی شخصیات کو پرکھا جائے، دیکھا جائے وہ خود کیا ہے؟ اپنے بارے میں کیا کہتا ہے؟ اس کا ''انا'' کس طرح کا ہے؟

ہر ادیب اور شاعر، اپنے کلام اور اپنی تحریر سے اپنی شخصیت کو جدا نہیں کر سکتا۔ وہ لاکھ ان دونوں میں حدِ فاصل کرنا چاہے لیکن ممکن نہیں کہ بین السطور سے اس کی شخصیت اور اس کی ذات نہ جھلک رہی ہو۔ ابو الکلام کے قدو قامت سے کہیں زیادہ بڑا ان کا '' انا '' ہے، لیکن دل آویز، اور خوبصورت ابو الکلام کا ''انا'' جس ''خوبی' جس جامعیت اور جس تکمیل کے ساتھ ''غبار خاطر'' میں جھلک رہا ہے ان کی کسی تحریر اور کسی کتاب میں نہیں جھلکتا، اگر ابو الکلام کے منظر اور پس منظر، ان کی ذات اور شخصیت، ان کے عہد کے سیاسی افراد اور سیاسی تحریکوں سے واقفیت ہو تو صرف اس مختصر سی کتاب کو پیشِ نظر رکھ کر ابو الکلام کی مکمل اور مفصل سوانح عمری تیار ہو سکتی ہے۔ شاعروں کے ہاں ''تعلّی'' کی اصطلاح ہے اور چونکہ شعر میں ہر حرام حلال اور شاعر کے لیے ہر

ناجائز جائز ہے، لہٰذا شاعروں کا ''انا'' تعلّی کے پردہ میں میں چھپ جاتا ہے، اسے برافگندۂ نقاب کرنا بڑی دیدہ ریزی کا کام ہے لیکن بجائے خود ہے نہایت دلچسپ۔

اقبال کی صورت برعکس ہے، اقبال کے ہاں تعلّی ملتی ہے، لیکن تعلّی سے ہٹ کر بھی، اپنی نظموں غزلوں اور شعروں میں وہ پوری رعنائی اور شان جلال وجاہ کے ساتھ جلوہ آرا نظر آتے ہیں۔

میں نے اقبال کا کلام سامنے رکھ کر اقبال کو ڈھونڈنے اور تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آیئے اس کوشش میں آپ بھی میرا ساتھ دیں، ممکن ہے گوہرِ مقصود ہاتھ آ جائے۔

رئیس احمد جعفری

۸۹۔ ٹیگور پارک۔ لاہور

۲۱ فروری ۱۹۵۶ء

اقبال اپنے آئینہ میں

(۱)

فسانۂ ستم انقلاب

ہر شاعر حساس ہوتا ہے۔ پھولوں کی رعنائی میں اسے زندگی مچلتی، انگڑائی لیتی اور اُمنڈتی نظر آتی ہے۔ مرجھائی ہوئی کلیاں دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے لیکن اقبال کا احساس کچھ الگ اور منفرد قسم کا تھا۔ ان کی حساسیت انہیں کہیں سے کہیں پہنچا دیتی تھی۔

ایک شاعر کے لیے کنارِ آب و تہ شاخسار کا نظارہ بڑا دل فریب ہوتا ہے۔ پانی کی روانی اس کی طبیعت میں روانی پیدا کر دیتی ہے، دریا کی لہریں، اس کے دل میں تلاطم برپا کر دیتی ہیں، وہ اس منظر میں کھو جاتا ہے۔ دل کا بربط بجنے لگتا ہے اور اس کی زبان ترانہ سنجی شروع کر دیتی ہے۔ اگر پہلو میں یار طناز موجود ہوتا ہے تو وہ اس کے کاکل و رخسار، ناز و ادا، غمزۂ عشوہ اور ساق و ساعد میں کھو جاتا ہے۔ پیتا ہے، پلاتا ہے، جھومتا ہے، گاتا ہے۔ کہتا ہے سنتا ہے۔ دیتا ہے، پاتا ہے، خدا کو فراموش کر دیتا ہے، خدائی کی پروا نہیں کرتا، اور بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے:

تم جسے یاد کرو پھر اسے کیا یاد رہے
نہ خدائی کی ہو پروا نہ خدا یاد رہے

وہ اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ ساری دنیا کو غرقِ مے ناب کر دیتا ہے۔ ایک نئے عالم نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ منظر کی نشاط افروزی اسے دُنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتی ہے پھر وہ کسی کی نہیں سنتا، کچھ نہیں سوچتا۔

اور اگر پہلو خالی ہو محبوب، خود نہ ہو، صرف اس کی یاد ہو، تو منظر کی نشاط افروزیاں اسے مبتلائے الم کر دیتی ہیں۔ وہ خون کے آنسو روتا ہے۔ جدائی اور فراق کا صدمہ نغمہ کو نالہ بنا دیتا ہے

پھر وہ ہنستا نہیں روتا ہے۔ گاتا نہیں کراہتا ہے۔ پاتا نہیں کھوتا ہے۔ اس کی زبان رب کی ترانہ سنجی کرتی ہے۔ لیکن لَے بدل جاتی ہے۔ ساز، سوز کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور وہ دلِ داغ داغ کی کہانی اشک و آہ کے نمک مرچ کے ساتھ بیان کرنے لگتا ہے۔

لیکن اقبال، جب دریائے راوی کے کنارے پہنچتا ہے، تو گو وہ شاعر ہے، لیکن نہ اسے محبوب کی یاد ستاتی ہے، نہ گل و بلبل کی طرف وہ نظر کرتا ہے، نہ جامِ ارغواں اور مئے کہنہ سے وہ کوئی دلچسپی لیتا ہے، نہ حسن جوان، اور غمزۂ جانستان اس کا دامنِ دل اپنی طرف کھینچتا ہے۔ نہ ہجر و فراق اور وصال و حضور کی کیفیت اسے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، نہ اس کے بربطِ دل سے ہوس انگیز نغمے نکلتے ہیں، نہ اس کے سازِ دل سے نفس و ہوا کی لَے بلند ہوتی ہے۔ نہ وہ کسی کو یاد کرتا ہے نہ کوئی اسے یاد آتا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے، یہ دریا ایک کتاب ہے، یہ موجیں اس کتاب کے اوراقِ پریشاں ہیں۔ ان اوراق میں عظمتِ ماضی کی داستان، اپنی پوری رعنائی اور زیبائی کے ساتھ زمانہ کے قلم نے اس طرح لکھ دی ہے کہ مٹائے نہیں مٹتی۔

وہ محسوس کرتا ہے، یہی وہ مقام ہے، جہاں سے اس کی قوم کا کاروانِ عظمت گزرا تھا اور پھر چشمِ حقیقت بیں کھلتی ہے اور سامنے ہی اسے وہ آثار و نقوش نظر آتے ہیں جو اس عظمتِ پارینہ کے آئینہ دار ہیں۔

یہ جہانگیر کا مزار ہے۔۔۔ یہاں وہ شہریار خوابِ ابد میں مصروف ہے، جس کی زندگی ایک ہلچل تھی، ایک طوفان تھی، وہ دودمانِ مغلیہ کا گوہرِ شب چراغ تھا۔ وہ رند مزاج تھا۔ مے آشام تھا، حسن پرست تھا، لا ابالی تھا، شراب اور نور جہاں کے علاوہ ساری دنیا کو ہیچ سمجھتا تھا۔ لیکن یہی جہانگیر جب گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر جنگ کے میدان میں پہنچتا تھا تو اس کی شمشیر خارا شگاف دشمن کے سر پر بجلی بن کر گرتی تھی اور اس کے خرمنِ حیات کو خاکستر کر کے رکھ دیتی تھی۔ اس کے عدل و انصاف کی داستانیں زبانِ زد خاص و عام ہیں اور وہ تاریخ کی جیتی جاگتی حقیقت ہیں۔ عدل جہانگیری صرف ایک افسانہ نہیں حقیقت ہے، ناقابلِ فراموش سچائی، فقید المثال واقعہ، یہ وہی جہانگیر ہے جس نے نور جہاں کو، باہمہ الفت و محبت، تعزیز کے شکنجہ میں کس دیا تھا کہ عدل و انصاف کا تقاضا بھی تھا۔ علامہ شبلی نے اس نیم تاریخی واقعہ کو ایک معرکہ آرا نظم لکھ کر غیر فانی بنا دیا ہے۔

اور جہانگیر کے مزار کے پاس ہی نور جہاں بیگم کا سوگوار مزار ہے۔

نے چراغے نے گلے
نے پَرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

جس کی زندگی عیش لازوال کا نمونہ تھی، جس کے حرم میں کنیزانِ سمن بر کا ہجوم رہتا تھا اور جس کے سامنے خود شہنشاہ جہانگیر سرِ تسلیم خم کیے رہتا تھا۔ وہ آج بے کسی کے عالم میں گوشۂ قبر میں آرام فرما ہے اور اس کی بے کسی زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔

کہ سبز پوشِ غریباں ہمیں گیاہ بس است

اقبال کنارِ راوی پہنچ کر اسی خیال میں کھو جاتا ہے اور بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے:

شرابِ سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامنِ شام
لیے ہے پیرِ فلک دستِ رعشہ دار میں جام

(بانگِ درا: ۹۴)

ذرا زبان کی حلاوت، بیان کی برجستگی اور حسنِ ادا کا نمونہ دیکھیے:

عدم کو قافلۂ روز تیز گام چلا
شفق نہیں ہے یہ سورج کے پھول ہیں گویا!

(بانگِ درا: ۹۵)

اور اب اس کی چشمِ عبرت دیکھتی ہے کہ:

کھڑے ہیں دُور وہ عظمت فزائے تنہائی
منارِ خواب گہِ ، شہسوارِ چغتائی

(بانگِ درا: ۹۵)

فسانۂ ستمِ انقلاب ہے یہ محل
کوئی زمانِ سلف کی کتاب ہے یہ محل
مقام کیا ہے سرودِ خموش ہے گویا
شجر ؟ یہ انجمنِ بے خروش ہے گویا!

"سرودِ خموش" اور "انجمن بے خروش" کی ندرت ترکیب کیا اُردو زبان میں قابلِ قدر اضافہ نہیں؟

کلی

جب دکھاتی ہے سحر عارضِ رنگیں اپنا
کھول دیتی ہے کلی سینۂ زرّیں اپنا
جلوہ آشام ہے یہ صبح کے میخانے میں
زندگی اس کی ہے خورشید کے پیمانے میں
سامنے مہر کے دل چیر کے رکھ دیتی ہے
کس قدر سینہ شگافی کے مزے لیتی ہے

(بانگِ درا: ۱۱۸)

(۲)

دردِ دل

گورستان کی طرف ہم میں سے اکثر کا گزر ہوتا رہتا ہے۔قبروں کو دیکھ کر دل پرسوز و گداز اور رنج والم کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا ہے یہی انجام ایک دن ہمارا بھی ہونا ہے۔دُنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے، کچھ دیر کے لیے دنیا کی نیرنگیوں، رعنائیوں اور دلچسپیوں سے طبیعت نفور ہو جاتی ہے۔کوئی گزرا ہوا دوست ساتھی، عزیز یاد آ جاتا ہے تو دل میں تلاطم سا پیدا ہو جاتا ہے، لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک نہیں قائم رہتی۔منظر آنکھوں کے سامنے سے اوجھل ہوا اور تاثر ختم ہوا۔

لیکن شاعر۔۔اقبال۔۔۔جب گورستان کی طرف سے گزرتا ہے تو اس کے تاثرات کچھ دوسرے قسم کے ہوتے ہیں، وہ ہماری طرح نہیں سوچتا، وہ جانتا ہے اور خوب جانتا ہے۔

عاقبت منزل ما وادیٔ خاموشاں است

لیکن ایسے مواقع پر یہ خیال اس کے دل میں نہیں آتا۔وہ کچھ اور سوچتا ہے اور اس کے سوچنے کا طرز، ہم سے آپ سے بالکل جدا ہوتا ہے۔

اس کا جی چاہتا ہے کہ ان آسودگانِ خاک سے باتیں کرے۔اپنی کہے ان کی سنے، اپنی کم کہے، ان کی زیادہ سنے، اپنی کہنے کا اشتیاق اس لیے نہیں کہ اس کی ایک ایک بات سے واقف ہیں۔ان کی سننے کا اشتیاق اس لیے زیادہ ہے کہ وہ دنیا اب تک نئی ہے، لیکن بہر حال وہاں جانا ہے اور انسان کی یہ فطری خواہش ہے کہ جہاں وہ جانا چاہتا ہے، جہاں وہ جانے پر مجبور ہے وہاں کے بارے میں سوچے، پوچھے، معلومات حاصل کرے۔

چنانچہ اقبال ایک نئے انداز اور اسلوب سے اپنے سوالات کی ابتدا کرتے ہیں اور ان لوگوں سے جو زیرِ زمین۔۔۔ہنگامہ رسا اور شورشوں سے دُور چین اور آرام کی نیند سو رہے ہیں کچھ

چبھتے ہوئے سوالات کرتے ہیں۔ کرید کرید کر، وہاں کے۔۔۔۔نئی دُنیا، منزلِ عدم کے حالات دریافت کرتے ہیں۔

اے مئے غفلت کے سرمستو! کہاں رہتے ہو تم؟
کچھ کہو اس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم

اور قبل اس کے کہ وہ کچھ جواب دیں اقبال سوال کرتا ہے:

وہ بھی حیرت خانۂ امروز فردا ہے کوئی؟
اور پیکارِ عناصر کا تماشا ہے کوئی؟
آدمی واں بھی حصارِ غم میں ہے محصور کیا؟
اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا؟
واں بھی جل مرتا ہے سوزِ شمع پر پروانہ کیا؟
اس چمن میں بھی گل و بلبل کا ہے افسانہ کیا؟

پھر اپنی حالت بتاتے ہیں:

یاں تو اک مصرع میں پہلو سے نکل جاتا ہے دل
شعر کی گرمی سے کیا واں بھی پگھل جاتا ہے دل؟

اب اصل سوال کرتے ہیں:

اِس جہاں میں اِک معیشت اور سو افتاد ہے
روح کیا اُس دیس میں اِس فکر سے آزاد ہے ؟

کیا وہاں بجلی بھی ہے، دہقاں بھی ہے، خرمن بھی ہے؟
قافلے والے بھی ہیں ؟ اندیشہ و رہزن بھی ہے؟

(بانگِ درا: ۳۹)

تنکے چنتے ہیں وہاں بھی آشیاں کے واسطے؟
خشت و گِل کی فکر ہوتی ہے مکاں کے واسطے؟

واں بھی انساں اپنی اصلیت سے بیگانے ہیں کیا؟
امتیازِ ملت و آئیں کے دیوانے ہیں کیا؟

(بانگِ درا: ۳۹)

وہاں بھی آخر وہی لوگ ہیں جو یہاں تھے، کیا وہاں جا کر ان کی طبیعت میں، مزاج میں، سرشت میں، خیالات میں انقلاب ہو گیا ہے؟ کیا وہاں جا کر وہ کچھ بدل گئے ہیں؟

واں بھی کیا فریادِ بلبل پر چمن روتا نہیں؟
اس جہاں کی طرح واں بھی دردِ دل ہوتا نہیں؟

(بانگِ درا:۳۹)

مطلب یہ کہ اس دنیا میں، ہم سب حرص و ہوا بن کر رہ گئے ہیں۔ کیا وہاں جانے کے بعد بھی ہمارے رنگ ڈھنگ میں، ہمارے اطوار میں، ہماری طرزِ حیات میں کوئی فرق نہیں آیا ہے؟

(۳)

مناظر

شاعر کی کائنات دل کے سوا کیا ہے؟ وہ جو کچھ کہتا ہے، دل سے کہتا ہے۔ جو کچھ دیکھتا ہے، دل کی آنکھوں سے دیکھتا ہے، جو کچھ سنتا ہے دل کے کانوں سے سنتا ہے، جو کچھ محسوس کرتا ہے اسی سے محسوس کرتا ہے۔ عقل سے اسے بیر ہے دشمنی ہے عقل چالاک ہے۔ دل سادہ ہے، عقل مکار ہے۔ دل فریب خوردہ ہے، عقل دُور اندیش ہے اور وہ آفت کا ٹکڑا، دل وہ ایثار ہے، عقل سوچتی ہے، دل کرتا ہے، عقل فکر ہے، دل عمل ہے، عقل نشیب و فراز کے چکر میں گرفتار رہتی ہے لیکن دل اس طرح کے توہمات سے یکسر آزاد اور بے پرواہے۔

یہی وجہ ہے کہ عقل اور دل، یعنی عقل اور شاعر کی نہیں بنتی، دونوں میں اَن بَن رہتی ہے، دونوں کا راستہ الگ ہے، منزل جدا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی تحقیر کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو ہیچ اور ناکارہ سمجھتے ہیں۔ عقل اس پر نازاں ہے کہ وہ جو فیصلہ کرتی ہے سوچ سمجھ کر کرتی ہے۔ دل کو اس پر فخر ہے کہ وہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ ''سوچنے کے'' وسواس میں نہیں گرفتار ہوتا۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

(بانگِ درا: ۲۷۸)

اقبال کے کلام میں عقل و دل کی آویزش اکثر مقامات پر ملے گی۔ کہیں اس کا رنگ تیکھا ہے، کہیں سنجیدہ، کہیں طنز تعریض، کہیں دلیل و محبت، لیکن ان دونوں میں ناقابلِ مفاہمت دشمنی

اقبال نے پیدا کردی ہے۔ وہ عقل کی خوبیوں کے منکر نہیں لیکن ان کے سامنے اسے کچھ نہیں سمجھتے۔

عقل و دل کے عنوان سے انہوں نے ایک طویل نظم لکھی ہے، جس میں دونوں نے اپنے اپنے فضائل اور مناقب کے بارے میں مناظرہ کیا ہے۔ عقل نے اپنے فضائل گنائے ہیں اور دل نے اپنے مناقب کی فہرست پیش کی ہے۔ اقبال چوں کہ دل کے ساتھ ہیں بلکہ خود سراپا دل بھی ہیں اس لیے انہوں نے عقل کے اعتراضات کا جواب بڑی عقل سے دیا ہے۔ چند شعر سنیے۔

عقل دل کو چڑاتی ہے اور کہتی ہے:

بوند اک خون کی ہے تو لیکن
غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں

دل جوش و خروش کے ساتھ جواب دیتا ہے:

رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے
اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے، تو معرفت مجھ سے
تو خدا جُو، خدا نُما ہوں میں
شمع تو محفلِ صداقت کی
حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا
طائرِ سدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرش ربِ جلیل کا ہوں میں

(بانگِ درا: ۴۲۔۴۱)

عقل کی ساری فسوں طرازی، تعلّی اور دلیل و برہان کا جواب اقبال نے صرف ایک

مصرعہ میں دے دیا ہے:

عرش ربِ جلیل کا ہوں میں

نمودِ صبح

مطلعِ خورشید میں مضمر ہے یوں مضمونِ صبح
جیسے خلوت گاہِ مینا میں شرابِ خوش گوار
ہے تہِ دامانِ باد اختلاط انگیز صبح
شورشِ ناقوس ، آوازِ اذاں سے ہم کنار
جاگے کوئل کی اذاں سے طائرانِ نغمہ سنج
ہے ترنم ریز قانونِ سحر کا تار تار

(بانگِ درا: ۱۵۴)

(۴)
احساس گداز

شاعر کی طبیعت یکسر سوز و گداز ہوتی ہے، وہ ہر واقعہ سے عبرت اور حکمت کا درس لیتا ہے۔ وہ شمع سوزاں کو دیکھتا ہے، اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ طرح طرح کے خیالات آتے ہیں، نت نئے تصورات پردۂ چشم کے سامنے نمایاں ہوتے ہیں، نئی نئی کیفیتوں سے وہ لذت آشنا ہوتا ہے، نئے نئے تأثرات اس کا رازِ دل اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

شمع کا سوز و گداز، اس کی دردمندی اور جگر کاوی، دنیائے شاعری کی مسلمات میں داخل ہے۔ شاعر شمع کو دیکھتا ہے، پھر اپنے سراپا پر نظر ڈالتا ہے۔ دونوں میں اسے مشابہت نظر آتی ہے، مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ اب وہ خاموش نہیں رہ سکتا۔ باتیں شروع کر دیتا ہے۔ پہلے اس سے اپنا تعارف کراتا ہے۔

بزمِ جہاں میں مَیں بھی ہوں اے شمع! دردمند

(بانگِ درا: ۴۴)

اور اس تعارف کے بعد محبت بڑھتی ہے اور وہ اپنے اور شمع کے درمیان حد فاصل قائم کرتا ہے۔

دی عشق نے حرارت سوزِ دروں تجھے
اور گل فروشِ اشکِ شفق گوں کیا مجھے

(بانگِ درا: ۴۴)

اس تعارف اور امتیاز کے بعد وہ جب شمع کا گریہ مسلسل یا گداز متواتر دیکھتا ہے تو یہ سوال کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ہے شان آہ کی ترے دُودِ سیاہ میں
پوشیدہ کوئی دل ہے تری جلوہ گاہ میں؟

(بانگِ درا: ۴۴)

اگر تیری جلوہ گاہ میں دل پوشیدہ ہے، تو پھر "من و تو" کا فرق قائم رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن نہیں یہ فرق تو قائم رہے گا۔

کعبے میں، بت کدے میں ہے یکساں تری ضیا
میں امتیازِ دیر و حرم میں پھنسا ہوا

(بانگِ درا: ۴۴)

تیرا فیض عام ہے۔ تو کعبہ میں بھی جلتی ہے اور دیر میں بھی۔ بزمِ عیش میں بھی اور شمعِ مزار کی حیثیت سے بھی، غریب کی جھونپڑی میں بھی اور امیر کے ایوان میں بھی۔ بیمار کے کلبۂ احزان میں بھی اور صحت مند کے گھر میں بھی۔ وہاں تیرا فیض عام ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ مگر میں شاعر جس مقام پر فائز ہوں، وہ کوئی معنوی مقام نہیں ہے۔ تو جلتی ہے لیکن احساس سے محروم ہے۔ میں جلتا ہوں لیکن احساس کی نعمت سے مالا مال ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تو ساکن ہے، میں متحرک، تو جذبات سے عاری ہے اور میں سراپا جذب کیف ہوں۔

میں جوشِ اضطراب سے سیماب وار بھی
آگاہ اضطرابِ دلِ بے قرار بھی

(بانگِ درا: ۴۵)

اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ:

یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بے قرار
خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتش کدے ہزار

(بانگِ درا:۴۵)

اور یہ سب کچھ اس لیے کہ مجھے احساسِ گداز سے بھی نوازا گیا ہے۔

تھا یہ بھی کوئی ناز کسی بے نیاز کا
احساس دے دیا مجھے اپنے گداز کا

(بانگِ درا: ۴۵)

اور اس احساس کا کرشمہ یہ ہے کہ میں پیکرِ اضطراب ہوں اور تو شمع خاموش۔ میری جان پر بنی ہے اور تو صرف گھل رہی ہے۔ میں رونے کے ساتھ ہنسنے پر بھی مجبور ہوں اور تو صرف روتی ہے۔ تیرے پاس دل ہے، آنکھ نہیں۔ میری بدقسمتی اور میرے ساتھ قدرت کی ستم ظریفی یہ ہے کہ میں آنکھ بھی رکھتا ہوں اور دل بھی۔

یہ حکم تھا کہ گلشنِ کُن کی بہار دیکھ
ایک آنکھ لے کے خوابِ پریشاں ہزار دیکھ

(بانگِ درا: ۴۵)

اور اب ایک آنکھ سے ہزار خوابِ پریشان دیکھ رہا ہوں۔

لیکن نہیں۔۔۔۔!

یہ جو کچھ ہے، میں اس سے غمگین اور رنجیدہ نہیں ہوں۔ جب اپنے وجود پر غور کرتا ہوں تو اپنی اہمیّت محسوس کرنے لگتا ہوں۔

مضموں فراق کا ہوں، ثریا نشاں ہوں میں
آہنگِ طبعِ ناظمِ کون و مکاں ہوں میں

(بانگِ درا:۴۶)

باندھا مجھے جو اس نے تو چاہی مری نمود
تحریر کر دیا سرِ دیوانِ ہست و بود

(بانگِ درا:۴۶)

گوہر کو مشتِ خاک میں رہنا پسند ہے
بندش اگرچہ سست ہے مضمون بلند ہے (بانگِ درا:۴٦)

اور یہی مضمون کی بلندی ہے جس نے بعد میں وہ چیز پیدا کی ہے جسے "انا" کہتے ہیں۔
اوراب شاعر شمع کو درسِ حکمت دیتا ہے:

چشمِ غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے
عالم ظہورِ جلوۂ ذوقِ شعور ہے

(بانگِ درا:۴٦)

یہی ذوقِ شعور ہے جو انسان میں تڑپ اور سوز و گداز کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ اسی سے اس کی رفعت اور بلندی قائم ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان انسان نہ رہے، کچھ اور بن جائے، کوئی اور چیز۔
پھر بتاتے ہیں:

یہ سلسلہ زماں مکاں کا کمند ہے
طوقِ گلوئے حسن تماشا پسند ہے

(بانگِ درا:۴٦)

لیکن یکایک شاعر محسوس کرتا ہے میں سب کچھ ہوں لیکن منزل سے دُور ہوں۔ یہ بھی نہیں جانتا منزل ہے کہاں؟ گم کردہ راہی کا یہ احساس شاعر پر ایک نیا جذبہ طاری کرتا ہے اور وہ خیال کرنے لگتا ہے کہ یہ جو کچھ ہے سب فریب ہے، حقیقت نہیں۔ حقیقت کہاں ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم۔

منزل کا اشتیاق ہے، گم کردہ راہ ہوں
اے شمع! میں اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں

(بانگِ درا:۴٦)

اور یہ فریبِ نگاہ، نئے نئے حوادث و آلام اور کیفیات و احوال سے مجھے روشناس کرا رہا ہے۔

صیاد آپ ، حلقۂ دامِ ستم بھی آپ!
بامِ حرم بھی، طائرِ بامِ حرم بھی آپ !   (بانگِ درا:۴۶)

مَیں ہی مَیں ہوں، اور خود ہی حلقۂ دامِ ستم بھی، خود ہی بامِ حرم ہوں اور خود ہی طائرِ بامِ حرم بھی۔۔۔۔آخر یہ معمہ کیا ہے؟ میں کیا ہوں؟ میری حقیقت کیا ہے؟

میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں !
کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں !

لیکن یہ کہتے کہتے ''عشق سراپا گداز'' اپنا رنگ دکھاتا ہے اور شاعر ناز و نیاز کے گرداب سے نکل کر حقیقت کے میدان مین آ جاتا ہے اور نہ کہتے ہوئے بھی یہ سب کچھ کہہ جاتا ہے:

ہاں آشنائے لب نہو رازِ کہن کہیں
پھر چھڑ نہ جائے قصہ دار و رسن کہیں

(بانگِ درا:۴۶)

---

(۵)

شاعر کا احساس

پھول میں اور شاعر کے دل میں کتنی مشابہت ہے؟

مزاج اور طبیعت، آغاز اور انجام، بود و عدم کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

پھول کھلتا ہے، اپنی تازگی اور رعنائی کا جلوہ دکھاتا ہے اور مرجھا جاتا ہے۔

کیا دل کی بھی یہی کیفیت نہیں؟

وہ بھی کھلتا ہے، اُمیدوں اور حسرتوں، آرزوؤں اور تمناؤں کے گہوارے میں نشو و نما حاصل کرتا ہے۔ پھر بادِ خزاں چلتی ہے، امیدوں کا موسمِ گل ختم ہو جاتا ہے، حسرتوں کا دورِ خزاں شروع ہو جاتا ہے، آرزو کا چراغ اس بادِ تند کی تاب نہیں لاتا، چلملاتا ہے اور دم توڑ دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ ساری کائناتِ آرزو بھی ختم ہو جاتی ہے۔ ان کے ساتھ ہر چیز رخصت ہو جاتی ہے، بقول شاعر

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تُو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

دل مر گیا، تو زندگی کہاں رہی؟ دل نہ رہا تو جوش اور ولولہ کی دُنیا کہاں رہی؟ دونوں لازم و ملزوم ہیں، دونوں کی ہستی ایک دوسرے سے وابستہ ہے، دونوں میں وہ ربط ضبط ہے جو گوشت اور ناخن میں۔

اقبال کی نظر ایک مرجھائے ہوئے پھول پر پڑتی ہے:

اس مرجھائے پھول کو دیکھ کر وہ عہدِ بہار یاد آ جاتا ہے، جب یہ کلی سے کونپل بنا تھا پھر جب اس نے گلِ رعنا کی صورت اختیار کر لی تھی، جو دیکھتا تھا اس کی آنکھوں میں طراوت پیدا ہو جاتی تھی، چمن کی زینت اس سے تھی۔ باغ ولبستان کی رونق یہ تھا۔ باغبان اسے دیکھ کر خوش ہوتا تھا، صبا کے نام سے یہ آشنا تھا، خزاں کی نہ اسے فکر تھی نہ جانتا تھا کہ وہ کیسی ہلاکت خیز اور مرگ آفریں چیز ہے۔ لیکن ابھی یہ زندگی کے لطف اور لذّت سے آشنا ہی نہ ہوا تھا کہ پیامِ مرگ آ پہنچا، اس کی تازگی رخصت ہو گئی اور گل پژمردہ بن کر یہ پاؤں تلے رَوندا جانے لگا۔ شاعر نے اسے دیکھا اور یہ آہ سرد کہا:

کس زباں سے اے گلِ پژمردہ تجھ کو گل کہوں
کس طرح تجھ کو تمنائے دلِ بلبل کہوں
تھی کبھی موجِ صبا گہوارۂ جنباں ترا
نام تھا صحنِ گلستاں میں گلِ خنداں ترا
تیرے احساں کا نسیمِ صبح کو اقرار تھا
باغ تیرے دم سے گویا طبلۂ عطار تھا

(بانگِ درا: ۵۱)

لیکن اب وہ دَور ختم ہو گیا۔ تیرا ننھا سا وجود بارِ غم نہ اٹھا سکا اور زندگی سے بے زار ہو کر عدم کے گوشہ میں جا چھپا۔ لیکن کچھ بھی ہو، مجھ میں اور تجھ میں جو ربط تھا وہ قائم ہے اور قائم رہے گا۔

تجھ پر برساتا ہے شبنم دیدۂ گریاں مرا
ہے نہاں تیری اُداسی میں دلِ ویراں مرا

(بانگِ درا: ۵۱)

---

(۶)

خارِ حسرت

شاعر، ماہِ نو سے مخاطب ہے۔۔۔! اسے ماہِ نو! میں ایک عجیب قسم کی کشش محسوس ہوتی ہے۔ وہ ایک عام آدمی کی حیثیت سے اس کا نظارہ نہیں کرتا۔ ایک سائنس دان اور محقق کی حیثیت سے بھی اس کا مطالعہ نہیں کرتا، ایک مظاہر پرست کی حیثیت سے بھی اس پر نظر نہیں ڈالتا۔ اس کا نقطۂ نظر خالص شاعرانہ ہے، لیکن اس کی شاعری میں حکمت اس طرح سموئی ہوئی تھی جس طرح حلقۂ چشم میں نگاہ۔ اس کی حکمت میں شاعری اور شاعری میں حکمت کا جلوہ نظر آتا ہے۔ وہ چاند کو دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتا۔ جس طرح چاند کے ساتھ ساتھ بحرِ بے کراں، یعنی سمندر میں مدّ وجزر اور تلاطم کی کیفیت طاری ہوتی ہے اسی طرح اقبال کے دل میں اسے دیکھ کر ہلچل مچ جاتی ہے اور وہ کیفیات سے بے قابو ہو کر اپنے تأثرات زبان پر لے آتا ہے۔ ان تأثرات میں رنگینیٔ دل ہے، حلاوتِ بیان بھی اور فکرِ عمیق بھی۔

وہ چاند کو دیکھ کر، خالص شاعرانہ زبان اور بڑے دلکش انداز میں کہتا ہے۔

چرخ نے بالی چُرا لی ہے عروسِ شام کی؟
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی؟

(بانگِ درا: ۵۳)

چاند کو "عروسِ شام" کی بالی سے تشبیہ دینا یا اس کی چمک دمک کے لحاظ سے اسے "سیمِ خام" کی مچھلی قرار دینا اتنا اچھوتا اور نادر تخیل ہے جو صرف اقبال ہی کے ہاں مل سکتا ہے۔

لیکن تکلف برطرف۔۔۔۔ وہ زیادہ عرصہ تک شاعرانہ باتیں نہیں کرتا، بلکہ حکیمانہ

رنگ ان پر غالب آ جاتا ہے۔

قافلہ تیرا رواں بے منتِ بانگِ درا
گوشِ انساں سُن نہیں سکتا تری آوازِ پا

(بانگِ درا: ۵۳)

گھٹنے بڑھنے کا سماں آنکھوں کو دکھلاتا ہے تو
ہے وطن تیرا کدھر؟ کس دیس کو جاتا ہے تو؟

(بانگِ درا:۵۴)

یہ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد دل کی بات زبان پر لاتے ہیں:

ساتھ اے سیارۂ ثابت نما لے چل مجھے
خارِ حسرت کی خلش رکھتی ہے اب بے کل مجھے

(بانگِ درا:۵۴)

نور کا طالب ہوں گھبراتا ہوں اس بستی میں مَیں
طفلکِ سیماب پا ہوں، مکتبِ ہستی میں مَیں

(بانگِ درا:۵۴)

(۷)

اقبال کہ ہے قمری شمشادِ معانی

تعلّی ہو یا تفاخر، شاعر جب اپنے بارے میں کچھ کہنے پر آتا ہے تو بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔ پرکھنے والے ایسے کلام کو دیکھ کر اچھی طرح پرکھ لیتے ہیں۔

ہے تہہ میں کہیں در دِ خیالِ ہمہ دانی

لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کے باوجود شاعر، اپنی شاعری سے اپنے آپ کو الگ نہیں کر سکتا، دونوں ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ جدا نہیں کیے جاسکتے۔

جس طرح کہ الفاظ میں مضمر ہوں معانی

شعر لفظ ہے اور معنی خود شاعر۔

کہیں پردہ میں، کہیں علانیہ، کہیں استعارہ کے طور پر، کہیں بہ طریقِ تکلم و تخاطب اقبال نے اپنے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے، اس اظہارِ خیال کے بین السطور سے، الفاظ سے، معنی سے، اندازِ اسلوب سے، اقبال کی شخصیت اس طرح جھلکتی ہے جس طرح ماہِ نو میں آفتاب عالمتاب کا عکس۔ اقبال کی شخصیت، اس کے خیالات، اس کا تصور اس کی ذات، اس کا انا، اس کا علم، اس کا مشاہدہ، اس کا فلسفہ، اس کا نظریۂ حیات، کوئی چیز ایسی نہیں، جو صاف اور واشگاف نہ نظر آتی ہو۔

''زہد اور رندی'' میں اقبال نے ایک مولوی صاحب کی کہانی سنائی ہے۔

رہتے تھے ادب جن کا اعالی و ادانی

(بانگِ درا: ۵۹)

یہ مولوی صاحب اقبال سے ہمسائگی رشتہ رکھتے تھے، اور ویسے ہی تھے جیسے عام طور پر مولوی صاحبان ہوا کرتے ہیں، وہی اپنے آپ کو سب کچھ سمجھنا، دوسروں کو خاطر میں نہ لانا، اپنے

کرامات اور خرقِ عادات پر ایمان رکھنا اور دوسروں کے ملکات اور فضائل کا استخفاف کرنا، اپنے آپ کو دین اور شریعت کا اجارہ دار خیال کرنا، اور دوسروں کو کافر یا وہابی قرار دینا، لیکن ان مولوی صاحب کی قوتِ فیصلہ اقبال کے بارے میں عاجز تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا اس شخص کو صوفی قرار دیں، رند مانیں، دائرۂ اسلام سے خارج کر دیں یا فاسق و فاجر تسلیم کر لیں۔ آخر ایک روز ضبط نہ کر سکے، اقبال کے ایک ہم نشیں سے اس کے بارے میں پوچھ ہی ڈالا۔

پابندئ احکامِ شریعت میں ہے کیسا؟
گو شعر میں ہے رشکِ کلیم ہمدانی

(بانگِ درا: ۵۹)

سُنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی

(بانگِ درا:۵۹)

ہے اس کی طبیعت میں تشیّع بھی ذرا سا
تفضیلِ علیؓ ہم نے سنی اس کی زبانی

(بانگِ درا:۵۹)

مولوی صاحب اقبال کے جتنے جرائم گنا رہے ہیں، اقبال انہیں حسن اور صواب سمجھتے اور مولوی صاحب کی زبان پر یہ عیب بن کر آتے ہیں، اقبال کے کردار میں یہ خوبی بن کر سمائے ہوئے ہیں۔

اب مولوی صاحب کا لب ولہجہ بلند اور تلخ ہوتا ہے:

سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل
مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اُڑانی

(بانگِ درا: ۵۹)

کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ ہمارے شعراء کی ہے پرانی

(بانگِ درا: ۵۹)

گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی

(بانگِ درا: ۵۹)

یہ ساری خود قرار داد جرم ---- جو در حقیقت اقبال کا اپنا فخر ہے --- سنانے کے بعد کتنی بے بسی کے ساتھ کہتے ہیں:

لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے
بے داغ ہے مانندِ سحر اس کی جوانی

(بانگِ درا: ۵۹)

آخر جب کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس رند پارسا کے بارے میں رائے کیا قائم کریں تو عاجز آکر ایک ایک شعر پہ بات ختم کر دیتے ہیں۔

مجموعۂ اضداد ہے اقبال نہیں ہے
دل دفترِ حکمت ہے طبیعت خفقانی

(بانگِ درا: ۶۰)

رندی سے بھی آگاہ، شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوف کی ، تو منصورؒ کا ثانی

(بانگِ درا: ۶۰)

اور مختصر یہ کہ فتویٰ لگ گیا:

اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی
ہو گا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی

(بانگِ درا: ٦٠)

بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر سب کچھ سننے کے بعد اقبال نے بڑا مختصر لیکن اتنا ہی جامع جواب دے دیا:

گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت
پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمہ دانی
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

(بانگِ درا: ٦٠)

اور بات یہیں ختم ہوگئی۔

بلبل

اور بلبل مطربِ رنگیں نوائے گلستاں
جس کے دم سے زندہ ہے گویا ہوائے گلستاں
عشق کے ہنگاموں کی اُڑتی ہوئی تصویر ہے
خامۂ قدرت کی کیسی شوخ یہ تحریر ہے!
باغ میں خاموش جلسے گلستاں زادوں کے ہیں
وادیٔ کہسار میں نعرے شباں زادوں کے ہیں

(بانگِ درا: ۱۵۲)

(۸)

دیدۂ بینائے قوم

قوموں اور ملتوں کی تعمیر و تشکیل میں شاعر کا بڑا حصہ ہوتا ہے، وہ اپنے سخن گرم سے دلوں کو گرماتا ہے، جوش و خروش پیدا کرتا ہے، کٹ مرنے اور مقصد پر جان دے دینے کا ولولہ پیدا کرتا ہے۔ شاعر کا ایک مصرعہ وہ کام کرتا ہے، جو بڑے بڑے خطیبوں کی آتش نوائی اور واعظوں کی شعلہ مقالی سے بھی ممکن نہیں۔ اس کا ایک شعر صدہا کتابوں اور ہر قسم کی دلیل اور برہان پر بھاری ہوتا ہے۔

دُنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے وہ شاعر ہی تھے جنھوں نے اپنے اشعار میں انقلاب کو سمویا اور انقلاب آ گیا۔ وہ شاعر ہی تھے جنھوں نے غلامی کے خلاف قوم کو اُبھارا اور وہ صف آراء ہو گئی، وہ شاعر ہی تھے جنھوں نے دشمن کے خلاف افرادِ قوم کو للکارا اور صف بستہ ہو کر میدانِ جنگ میں پہنچ گیے، وہ شاعر ہی تھے جنھوں نے بزدلوں اور کم ہمتوں کو مخاطب کیا اور ان میں وہ جذبہ اور طنطنہ پیدا کر دیا جس نے بڑی سے بڑی قوت کو بیخ و بن سے اُکھاڑ کر پھینک دیا۔ شاعر ایک بہت بڑی قوت ہے اور اس قوت سے ٹکرا کر کوئی سلامت نہیں رہ سکتا۔

شاعر کے الفاظ اقوام کی قسمت بدل دیتے ہیں، ملکوں کا نقشہ بدل دیتے ہیں۔ دُنیا کے جغرافیہ میں تبدیلی کر دیتے ہیں۔ عہدِ جاہلیت کے شعرائے عرب جب چاہتے تھے امن و سکون کے سمندر کو شعلۂ جوالہ بنا دیتے تھے، تلواریں میان سے باہر نکل آتی تھیں، خنجر خون چاہتے تھے اور نیزے سینوں میں پیوست ہونے کے لیے بے قرار ہو جاتے تھے۔ یہ شعراء ہی تھے، جنھوں نے عرب جیسی قوم کو جس کے پاس نہ دولت تھی، نہ وسائل و ذرائع، روم اور ایران کی مسلح دولت مند اور

جہاں آرا اقوام کی غلامی سے محفوظ رکھا۔ یونان، رُوم، فرانس اور برطانیہ کی تاریخ بھی شعراء کے انقلاب انگیز کارناموں سے پُر ہے۔ فارسی شاعری میں بھی ہمیں یہی جوہر نظر آتا ہے۔ اس شاعری نے جو روپ بدلا، ایرانی قوم بھی اسی لباس میں جلوہ گر ہو گئی۔ فارسی شعراء نے جو روش اختیار کی، فارسی بولنے والی مخلوق ان کی ہم نوائی سے انکار نہ کر سکی۔ اس سے بڑھ کر اس شاعری کے اثر و نفوذ اور اقتدار کا کیا ثبوت ہوگا کہ جن باتوں کے زبان پر لانے سے آج ہی ایک آدمی کی گردن کٹ سکتی ہے اور اس پر کفر کے فتوے لگ سکتے ہیں، اسے گمراہ اور بے دین قرار دیا جا سکتا ہے، اس کا معاشرتی بائیکاٹ کیا جا سکتا ہے، اور اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہونے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ یہی باتیں، بہت زیادہ تند و تلخ، ترش اور تیز انداز و اسلوب میں ان شاعروں نے کہیں، اور نہ صرف یہ کہ ان کے خلاف کوئی اقدام نہیں ہوا، بلکہ ان کی ہر دل عزیزی میں اضافہ ہوتا رہا۔ ان کی عزت بڑھتی رہی یہاں تک کہ بہت سے لوگوں نے ان سے اظہارِ عقیدت شروع کر دیا۔ انہیں زاہد والا مقام اور صوفی والا مرتبت مان لیا۔ ان کے عرس ہونے لگے۔ ان کے کلام سے فال نکالی جانے لگی۔ انہیں مشائخ کے زمرہ میں شامل کر لیا گیا اور ان کی تعظیم و تکریم اکابر رجال کی طرح ہونے لگی۔ اُردُو شاعری میں بھی حالی کے مسدس نے وہ کام کیا ہے جو اس عہد کے کسی مصنف، کسی خطیب، کسی عالم اور کسی صوفی سے نہیں بن آیا۔

یہ بات خود شاعر کے ہاتھ میں ہے کہ وہ اپنے لیے کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔ قوم کو گمراہی کے گڑھے میں دھکیلتا ہے یا راہِ راحت پر گامزن کرتا ہے۔ اس کے لیے اپنے الفاظ کے تانے بانے سے غلامی کی زنجیریں تیار کراتا ہے یا شمشیر آبدار، قوم پھر خالی اس کی سنے گی، اس کی مانے گی اور اس سے عقیدت و ربط و تعلق کے اظہار میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرے گی۔

اب دیکھنا چاہیے، اقبال شاعر کو کیا سمجھتے اور اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

محفلِ نظمِ حکومت ، چہرۂ زیبائے قوم
شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

(بانگِ درا: ٦١)

جتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

(بانگِ درا: ٦١)

اوراس سے کوئی انکارنہیں کرسکتا کہ اقبال اس قسم کے شاعر تھے۔

تارکِ قرآں

ہر کوئی مست مئے ذوقِ تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟

حیدری فقر ہے، نے دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

(بانگِ درا: ٢٠٣-٢٠٤)

---

(۹)

دِل

جب سے آدم نے جنت فردوس کو چھوڑ کر اس دنیا میں قدم رکھا ہے، یہ دنیا آماجگاہِ شر و فساد بنی ہوئی ہے۔ ہنگامہ اور شورش اس کی سرشت بن گیا ہے۔ یلغار اور للکار اس کی زندگی کا لباس ہے۔۔۔۔ اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ انسان کے سینہ میں جو ایک ننھا سا گوشت کا ٹکڑا دھڑکتا رہتا ہے جسے دِل کہتے ہیں، وہ بڑا امن چلا ہے، جہاں کوئی نہیں جاسکتا یہ چلا جاتا ہے۔ جو کام کوئی نہیں کر سکتا یہ کر ڈالتا ہے۔ جو کسی سے ممکن نہیں، وہ اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

مذہب نے بھی دِل کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ احادیث صحیحہ میں وارد ہوا ہے کہ انسان کی سلامتی کا مدار اس کے دِل پر ہے۔ اگر یہ توانا و تندرست ہے تو وہ بھی توانا اور تندرست ہے اور اگر یہ ہدف بن چکا ہے تو سارا جسم غارت گیا۔

صوفیا کے ہاں تو "تزکیۂ قلب" کو بڑی غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ ان کا ذکر و شغل سب اسی دِل کے لیے ہوتا ہے۔ مرشد جب تک دِل کی اصلاح نہیں کر لیتا اور اسے صالح نہیں بنا لیتا اُس وقت تک وہ مرید کو لائق اعتنا نہیں سمجھتا۔ حلقۂ تصوف میں سب سے زیادہ زور جس چیز پر دیا جاتا ہے وہ دِل اور صرف دِل ہے۔

غور کیجیے تو دنیا کی تعمیر و تخریب میں صرف دِل ہی کی کارفرمائی نظر آئے گی۔۔۔۔ تخریب دِل کے "فساد" کا نام ہے اور تعمیر دل کی صالحیت کا، دنیا میں قتل و غارت، فتنہ و فساد، کشت و خون، رزم و پیکار اور خانہ جنگی کا جب سلسلہ شروع ہوتا ہے تو اسی وقت جب دل ہاتھ سے نکل جاتا ہے اور جب امن و امان کا دور دورہ ہوتا ہے، فارغ البالی اور سکون کی نعمت میسر ہوتی ہے، تعمیر اور اصلاح کے کارنامے انجام دیے جاتے ہیں، نوع انسان کی صلاح و فلاح کے واقعات وقوع کا جامہ پہنتے ہیں تو یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ مائل بہ فساد نہیں ہوتا، بلکہ اپنی سرشت اور مزاج کے

اعتبار سے صالح ہوتا ہے۔

شاعروں نے تو اپنا سارا زورِ بیان دل پر صرف کردیا ہے، کسی نے اسے ملاحیاں سنائی ہیں، کسی نے اس کے ترانے گائے ہیں، کسی نے اس کی ہجو کی ہے، کسی نے اس کی شان میں قصیدہ پڑھا ہے، کسی نے توبہ کی طرح قابلِ شکست قرار دیا ہے، کسی نے بُت کی طرح اسے پوجا ہے، غالب نے اس کی جو تعریف کی ہے وہ اچھوتی ہی ہے اور مطابق واقعہ بھی۔

میں ہوں اور آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

اس شعر میں دل کی جتنی صفتیں بیان کی گئی ہیں وہ بجائے ایک دفترِ معنی ہیں" آفت کا ٹکڑا" "دل وحشی" عافیت دشمن اور" آوارگی کا آشنا" یہ سارے صفات واقعی دل کے ساتھ خاص اور ان کی تشریح کی جائے تو ایک پورا دفتر تیار ہو جائے۔

اقبال خود اپنے متعلق کہہ چکے ہیں:

گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی

اور واقعہ بھی یہی ہے۔۔۔وہ کسی چیز پر طائرانہ نگاہ نہیں ڈالتے، وہ کسی چیز کو سرسری طور پر دیکھتے ہوئے گزر جاتے ہیں، وہ صرف ایک عالم، ایک حکیم، ایک شاعر ہی نہیں ہیں ان سب کے ماسوا بھی وہ بہت کچھ ہیں، ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مفکر بھی ہیں اور ان کے فکر میں عمق اور گہرائی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ کسی پر لب کشائی کرتے ہیں تو ایک جہانِ معنی لاکر سامنے رکھ دیتے ہیں۔ وہ ایسی دُور کی کوڑی لاتے ہیں جہاں تک ہر شخص کی فکر پہنچ نہیں سکتی۔ وہ اپنی عقابی نگاہ سے کام لے کر دل وجود کی ایسی گہرائیوں میں پہنچ جاتے ہیں کہ کوئی دوسرا ان کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ وہ ایسے ایسے نکتے پیدا کرتے ہیں، جن کی طرف عام لوگوں کا ذہن بھی نہیں منتقل ہوتا۔

کلامِ اقبال کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ اسے جس نقطۂ نظر سے دیکھیے آپ کو کام کی چیزیں قدم قدم پر ملتی جائیں گی، صرف ذوقِ تجسس اور سعی و تلاش کے جذبہ کی ضرورت ہے۔ اقبال کا کلام رنگارنگی کا مجموعہ ہے۔ اس میں اعالی و ادانی ہر ذوق کی رعایت ہے۔ ہر ذوق اپنی تسکین و تسلی کا مواد فراہم کرسکتا ہے۔ اس بارگاہ سے ہر آدمی کو وہی کچھ ملے گا جو اس کی تمنا ہے، جو

اس کی جستجو ہے۔ جس عنوان پر، جس موضوع پر، جس اصول پر، آپ اقبال اور اقبال کے خیالات معلوم کرنا چاہیں معلوم کر سکتے ہیں بشرطیکہ اس کا تعلق حیاتِ انسانی کے کسی پہلو سے ہو۔ درحقیقت قبال کا موضوعِ کلام بھی یہی ہے۔ وہ صرف حیاتِ انسانی ہی کو پیشِ نظر رکھتے ہیں اور اس کی اصلاح وفلاح سے متعلق نئے نئے قابلِ قبول اور قابلِ عمل نکتے پیدا کرتے رہتے ہیں۔

دل کے سے نازک اور پیچیدہ مسئلہ پر بھی اقبال نے اظہارِ خیال کیا ہے اور حق یہ ہے کہ چند اشعار میں انہوں نے جو کچھ کہہ دیا ہے وہ چند دیوانوں پر بھاری ہے۔ یہ مصرعہ انہی کا ہے:

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت

اور اپنی شاعری میں انہوں نے مختلف زاویوں سے "کتابِ دل" کی تفسیریں لکھی ہیں، چند اشعار ملاحظہ فرمایئے اور اقبال کے حقائق ومعارف کا اندازہ کیجیے:

ابرِ رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یارب!
جل گئی مزرعۂ ہستی تو اُگا دانۂ دل

(بانگِ درا: ۶۱)

حسن کا گنجِ گرانمایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد! نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

(بانگِ درا: ۶۱)

عرش کا ہے کبھی کعبہ کا ہے دھوکا اس پر
کس کی منزل ہے الٰہی! مرا کاشانۂ دل

(بانگِ درا: ۶۱)

اس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا
دل کسی اور کا دیوانہ، میں دیوانۂ دل (بانگِ درا: ۶۲)

تو سمجھتا نہیں اے زاہدِ ناداں! اس کو
رشکِ صد سجدہ ہے اک لغزشِ مستانہ دل

(بانگِ درا: ۶۳)

خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنا دیتی ہے
وہ اثر رکھتی ہے خاکسترِ پروانہ دل

(بانگِ درا: ۶۳)

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

(بانگِ درا: ۶۳)

ان چند اشعار میں اقبال نے کیا کچھ نہیں کہہ دیا؟ کیا کچھ نہیں بیان کر دیا؟ لیکن اس کی پیدائش اور نشو و نما پر جو کچھ ڈیڑھ شعر میں کہا ہے، اگر صرف وہی کہتے تو کتابِ دل کی تفسیر کا حق ادا ہو جاتا۔

دل کی پیدائش کی حقیقت ایک مصرعہ میں بیان کی ہے:

جل گئی مزرعۂ ہستی تو اُگا دانہ دل

اور حق یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر جامع اور مانع طور پر یہ حقیقت نہیں بیان کی جا سکتی۔

آخر میں دل کی نشو و نما کا افسانہ ایک شعر میں بیان کیا ہے اور قلم توڑ دیا ہے:

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے، تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

کوئی بڑے سے بڑا "اہلِ زبان" شاعر بھی اس مفہوم کو اتنی خوبصورتی سے ادا نہیں کر سکتا۔

(۱۰)

کنجِ تنہائی

شاعر دُنیا کے کسی خطہ کا ہو شاعر ہوتا ہے، ہر شاعر اپنا ایک معیار رکھتا ہے۔ اس معیار پر اپنے معاصرین کو پرکھتا ہے۔ جو پورا اُترتا ہے، اس سے ہم ذوقی کے رشتہ کی بنا پر ایک ربط و تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور یہ ربط و تعلق متعدد مقامات پر ایک کو دوسرے کا، ہم سخن اور دم ساز بنا دیتا ہے، اسی کو شاعرانہ اصطلاح میں "توارد" کہا جاتا ہے۔ لیکن زیادہ عالی ظرف لوگ اپنا راگ جب کسی کے نغمہ میں سنتے ہیں تو خیالات کو مستعار لینے سے بھی نہیں ہچکچاتے، اعتراف بھی کرتے ہیں اور اس کی لے میں اپنی لے ملا دیتے ہیں۔

اقبال علومِ مشرق و مغرب کے جامع تھے، ان کی نگاہ میں جس طرح مشرق کے یگانہ روزگار شعراء کا کلام تھا، اسی طرح مغرب کے مایۂ ناز شعراء کے نتائجِ فکر بھی ان کے سامنے تھے۔ ان میں سے اگر کوئی چیز انہیں اپنے خیالات سے ملتی جلتی نظر آتی تھی تو وہ اس کے اخذ و التقاط میں تأمل نہیں کرتے تھے۔ ایمرسن کی ایک نظم کو انہوں نے اپنایا ہے، اس کے وہ اشعار خاص طور پر بڑے اثر انگیز ہیں جن میں اقبال کی خود اپنی شخصیت جھلکتی نظر آ رہی ہے۔

بزمِ ہستی میں ہے سب کو محفل آرائی پسند
ہے دلِ شاعر کو لیکن کنجِ تنہائی پسند

(بانگِ درا: ۶۴)

پھر اس کی توجیہ پیش کرتے ہیں:

طعنہ زن ہے تو کہ شیدا کنجِ عزلت کا ہوں مَیں
دیکھ اے غافل! پیامی بزمِ قدرت کا ہوں مَیں

بزمِ قدرت کی پیامبری کی صورت کیا ہے؟

ہم وطن شمشاد کا، قمری کا مَیں ہم راز ہوں
اس چمن کی خامشی میں گوشِ بر آواز ہوں

(بانگِ درا: ۶۵)

گوش بر آواز ہونے کا سبب کیا ہے؟

کچھ جو سُنتا ہوں تو اوروں کو سُنانے کے لیے
دیکھتا ہوں کچھ تو اوروں کو دکھانے کے لیے

(بانگِ درا: ۶۵)

اور اس جذبہ نے شاعر میں ایک خاص قسم کا استغنا پیدا کر دیا ہے:

عاشقِ عزلت ہے دل، نازاں ہوں اپنے گھر پہ مَیں
خندہ زن ہوں مسندِ دارا و اسکندر پہ مَیں

(بانگِ درا: ۶۵)

---

(11)

طفلِ ناداں میں بھی ہوں

شاعری صرف موزونیِ طبع کا نام نہیں ہے، یہ ایک مستقل علم اور مستقل فن ہے۔ شاعر کے لیے جہاں اور بہت معلومات ضروری ہیں، وہاں اس کے لیے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ ماہرِ نفسیات ہو۔ لوگوں کی نفسی کیفیت پر عبور رکھتا ہو۔

من انداز قدت را می شناسم

وہ رمز آشنا ہو، جب تک اس میں یہ خصوصیت نہ ہوگی، نہ وہ اپنے تاثرات کی صحیح ترجمانی کر سکے گا نہ دوسرے کے ذہن و دماغ کو تول کر اور ان کی فکر و نظر کا جائزہ لے کر وہ کوئی بات کر سکے گا۔ جو شاعر موزونیِ طبع کے باوجود کسی مقام خاص پر فائز نہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ نہ اپنے بارے میں کچھ جانتے ہیں نہ دوسروں کے بارے میں انہیں کوئی علم ہے، نہ اپنی ترجمانی کر سکتے ہیں، نہ کسی اور کے جذبات و احساسات کا مطالعہ کر کے اس کی ترجمانی کر سکتے ہیں اور بدقسمتی سے شاعر کی حیثیت صرف ترجمان ہی کی ہے۔ اگر وہ ترجمان ـــــ اپنا بھی اور دوسروں کا بھی ـــــ نہیں ہے، تو سب کچھ ہے مگر شاعر نہیں۔ غالب نے یہی بات کہی ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جب تک یہ بات نہ ہو کہ کہے کوئی اور ترجمانی اپنی معلوم ہو، اس وقت تک شاعری شاعری نہیں ہوتی وہ تک بندی ہوتی ہے۔

اقبال کے کلام پر اگر اس نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو نفسیاتی تاثرات و نشانات ان

کے ہاں کافی ملیں گے۔ایک نظم ہے۔ ''طفلِ شیر خوار'' اس میں بڑے نفسیاتی انداز میں بچہ کی ''طلب ورسد'' کی تحلیل کی ہے۔اس کی ضد، اس کے رونے، اس کے جھنجلانے اوراس کے مچل جانے کی تصویر کشی تو اتنے دل آویز اسلوب سے کی ہے کہ بس:

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

لیکن اس کی نفسیاتی تحلیل کرتے کرتے وہ اپنے سراپا پر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں حیرت ہوتی ہے کہ ایک طفل شیر خوار اور ایک شاعر میں کتنی چیزیں مشترک ہوتی ہیں۔ذرا سی بات پر روٹھ جانا، معمولی سی بات پر من جانا، پھر ان کا ذہن رسا ایک قسم کا تسلی قائم کرتا ہے اور وہ فرماتے ہیں۔

آہ! اس عادت میں ہم آہنگ ہوں میں بھی تیرا
تو تلوّن آشنا ، میں بھی تلوّن آشنا
عارضی لذّت کا شیدائی ہوں، چلّاتا ہوں میں
جلد آ جاتا ہے غصہ، جلد من جاتا ہوں میں
میری آنکھوں کو لبھا لیتا ہے حسنِ ظاہری
کم نہیں کچھ تیری نادانی سے نادانی مری

(بانگِ درا: ٦٧)

آخر میں تو یہ مناسبت اور زیادہ چوکھی ہو جاتی ہے:

تیری صورت گاہ گریاں، گاہ خنداں مَیں بھی ہوں
دیکھنے کو نوجواں ہوں طفلِ ناداں مَیں بھی ہوں

(بانگِ درا: ٦٧)

غور کیجیے، تو یہ اشعار، ایک بہت بڑی حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔

---

(۱۲)

رازدار قضا و قدر

جو شاعر آزاد فضا میں جنم لیتے اور پروان چڑھتے ہیں ان کی نغمہ سرائی کا رنگ کچھ اور ہوتا ہے۔ جو غلام قوم میں پیدا ہوتے ہیں، جن کی سخن سنجی اور نطق و کلام پر پابندیاں ہوتی ہیں، جن کی آنکھوں کے سامنے دار و رسن اور بجن و زنداں کے واقعات بار بار دہرائے جاتے ہیں، ان کی مصیبت بڑی دردناک ہوتی ہے۔ خاموش نہیں رہ سکتے، اگر خاموش رہیں تو سینہ پھٹ جائے، کھل کر دل کی بات زبان پر نہیں لا سکتے، اگر ایسی جرأت کریں تو زبان کاٹ لی جائے:

ایماں مجھے کھینچے ہے تو روکے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

بدقسمتی سے اقبال جس قوم میں پیدا ہوئے وہ نہ صرف غلام تھی، بلکہ غلامی پر قائم بھی تھی، اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگاتا تھا اور جہدِ حیات اور جہادِ حریت کے میدان میں گام فرسا کرتا تھا، راستہ خطرات سے گھرا ہوا تھا، لیکن وہ اپنے فرائض انجام دیے جا رہے تھے، قوم میں زندگی کی حرارت پیدا کر رہے تھے۔ اسے سودائے حریت سے آشنا کر رہے تھے۔ اس میں استقلال اور آزادی کا جذبہ پیدا کر رہے تھے، اسے جاں نثاری اور فداکاری کا سبق دے رہے تھے۔ اسے ایک نئی۔۔۔ آزاد۔۔۔ دنیا بسانے کا مشورہ دے رہے تھے، اگر یہ نہ کرتے تو اپنے فرض سے غافل رہتے اور وہ اپنے فرض سے کسی قیمت پر بھی غافل نہیں رہ سکتے تھے۔

لیکن جب وہ اپنے آس پاس نظر ڈالتے تھے، اپنی دشواریاں اور معذوریوں کو محسوس کرتے تھے، ان پابندیوں اور قدغنوں پر نگاہ ڈالتے تھے، جو حریت طلب کرنے والوں پر عائد کر دی گئی تھیں تو وہ محسوس کرتے تھے، جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ کم ہے، ناکافی ہے میری لے اور تیز ہونی

چاہیے، میرا نغمہ اور اونچا ہونا چاہیے۔ میری حدی خوانی میں کچھ اور کیفیت ہونی چاہیے، لیکن خالات سدِّ راہ بن کر کھڑے ہو جاتے تھے، اور وہ بہت سی باتیں دل کے نہاں خانہ میں قید کر دینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

ایک طویل نظم میں انہوں نے اپنی اس طرح کی بے چارگی اور مجبوری پر نظر ڈالی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی قوم کو جھنجھوڑتے بھی گئے ہیں۔ ذیل میں اس طویل نظم کے صرف چند ایسے اشعار درج کیے جاتے ہیں جن میں انہوں نے اپنی کیفیت بیان کی ہے:

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری (بانگِ درا: ٦٨)

پھر پیار سے دریافت کرتے ہیں:

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں؟
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

(بانگِ درا: ٦٨)

پھر بتاتے ہیں میں خاموش رہوں تو بھی:

اٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گُل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

(بانگِ درا: ٦٨)

چمن والوں کو اس راز سے بھی آشنا کرتے ہیں:

اُڑا لی قمریوں نے، طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

(بانگِ درا: ٦٨)

اور تنگ آکر کہتے ہیں:

الٰہی! پھر مزا کیا ہے یہاں دُنیا میں رہنے کا
حیاتِ جاوداں میری نہ مرگِ ناگہاں میری (بانگِ درا: ٦٨)

یہ کہہ کراب اپنی داستانِ درد سناتے ہیں:

ریاضِ دہر میں ناآشنائے بزمِ عشرت ہوں
خوشی روتی ہے جس کو، میں وہ محرومِ مسرّت ہوں

(بانگِ درا: ۶۹)

مری بگڑی ہوئی تقدیر کو روتی ہے گویائی
میں حرفِ زیرِ لب شرمندۂ گوشِ سماعت ہوں

(بانگِ درا: ۶۹)

پریشاں ہوں میں مشتِ خاک، لیکن کچھ نہیں کھلتا
سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں

(بانگِ درا: ۶۹)

عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیانوں میں
کہ بامِ عرش کے طائر ہیں مرے ہم زبانوں میں

(بانگِ درا: ۷۰)

اوراس کے بعد فرماتے ہیں:

اثر یہ بھی ہے اِک میرے جنونِ فتنہ ساماں کا
مرا آئینۂ دل ہے قضا کے راز دانوں میں

(بانگِ درا: ۷۰)

اور بالآخر دُنیانے دیکھ لیا، اقبال نے جو کچھ کہا تھا، محض ایک شاعرانہ تعلّی نہ تھی، ایک پیش گوئی تھی اور وہ پوری ہو کر رہی۔

(۱۳)
استاد کی یاد

منت پذیری اور احسان شناسی کا جذبہ اقبال میں بدرجہ اتم تھا، انہوں نے فلسفہ پروفیسر آرنلڈ سے پڑھا تھا۔ آرنلڈ نے اس جوہر قابل کو پرکھ لیا تھا، محسوس کرلیا تھا کہ یہ ذرّہ ایک دن آفتاب بن کر چمکے گا۔ لہٰذا بڑی محبت اور شفقت سے مقاماتِ علم طے کرائے پھر آرنلڈ اپنے وطن چلے گئے اور رفتہ رفتہ اقبال، اقبال بن گئے، لیکن بایں ہمہ اپنے استاد کو یاد کرتے رہتے، اس سے ملنے کی تمنا انہیں بے چین رکھتی تھی۔ وہ اس احسان کو کبھی فراموش نہ کرسکے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں آرنلڈ کا بہت بڑا حصہ ہے۔

آرنلڈ کی یاد میں "نالۂ فراق" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے۔ یوں تو پوری نظم مرصع ہے لیکن ذیل کے اشعار میں چوں کہ ذاتی تاثر اور شخصی رنگ جھلک رہا ہے، اس لیے یہ خاص طور پر مطالعہ طلب ہیں:

تو کہاں ہے اے کلیمِ ذروہ سینائے علم!
تھی تری موجِ نفس بادِ نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوقِ رہ پیمائی صحرائے علم
تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

(بانگِ درا: ۷۸)

شوقِ ملاقات وحسرت دید میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کا اظہار کرتے ہیں:

کھول دے گا دست وحشت عقدۂ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو (بانگِ درا: ۷۸)

دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو
کیا تسلی ہو مگر گرویدۂ تقریر کو؟

(بانگِ درا: ۷۸)

"تاب گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جس کو ہے سخن تصویر کا"

(بانگِ درا: ۷۸)

خودی کی تربیت

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز!
یہی ہے سرِّ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیب و شبانیِ شب و روز!

(ضربِ کلیم: ۷۵)

(۱۴)

لذتِ درد

چاند کو دیکھ کر شاعر کے بحرِ خیالات میں مدّ و جزر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، وہ اس سے پوچھتا ہے:

قصد کس محفل کا ہے؟ آتا ہے کس محفل سے تو؟
زرد رُو شاید ہوا رنجِ رہِ منزل سے تو؟

(بانگِ درا: ۷۸)

پھر جب بابِ سخن وا ہوتا ہے تو اپنا اور چاند کا تقابل کرتے ہیں:

آفرینش میں سراپا نور تو، ظلمت ہوں میں
اس سیہ روزی پہ لیکن تیرا ہم قسمت ہوں میں

(بانگِ درا: ۷۹)

اس کے بعد مناسبت بھی پیدا کر لیتے ہیں:

آہ! میں جلتا ہوں سوزِ اشتیاقِ دید سے
تو سراپا سوز داغِ منتِ خورشید سے

(بانگِ درا: ۷۹)

اب چوں کہ شاعر اور چاند دونوں ایک دوسرے کے ہمدم اور راز داں بن گئے، اس لیے شاعر ذرا بے تکلف لہجہ میں کہتا ہے:

انجمن ہے ایک میری بھی جہاں رہتا ہوں میں
بزم میں اپنی اگر یکتا ہے تُو، تنہا ہوں میں

(بانگِ درا: ۷۹)

مہر کا پرتو ترے حق میں ہے پیغامِ اجل
محو کر دیتا ہے مجھ کو جلوۂ حسنِ ازل

(بانگِ درا: ۷۹)

لیکن اس مناسبت کے باوجود ایک بہت بڑا اور بنیادی فرق بھی ہے۔۔۔ میں دردِ دل کا لذّت آشنا ہوں تُو اس سے محروم ہے۔

پھر بھی اے ماہِ مبیں! میں اور ہوں تو اور ہے
درد جس پہلو میں رکھتا ہو وہ پہلو اور ہے

(بانگِ درا: ۸۰)

خودی

آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر
خلوَت میں خودی ہوتی ہے خود گیر ولیکن
خلوَت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسّر!

(ضربِ کلیم: ۹۴)

---

(۱۵)
حسنِ ازل

شاعر کی آنکھ حسن گر ہوتی ہے، حسن شناس ہوتی ہے، حسن آفریں ہوتی ہے وہ ہر چیز میں حسنِ ازل کی جھلک دیکھتا ہے، اس سے متاثر ہوتا ہے، دوسروں کو متاثر کرتا ہے، جگنو پر ہماری آپ کی ہر روز نظر پڑتی ہے اسے دیکھتے ہیں، طبیعت خوش ہوتی ہے۔ ایک کیف سا طاری ہوتا ہے۔ پھر وہ اپنی روشنی کی ہلکی ہلکی سی چمک دکھاتا ہوا رخصت ہو جاتا ہے۔ ہم بھی دوسری دلچسپیوں میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ نہ جگنو یاد رہتا ہے نہ اس کی دلپذیری۔

لیکن شاعر جب اسے دیکھتا ہے تو بے خود ہو جاتا ہے۔ قدرت کی اس کاری گری کو دیکھ کر عش عش کرنے لگتا ہے، بہت سی شاعرانہ باتیں، شاعرانہ اندازِ بیان میں کہنے کے بعد کہتا ہے۔

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وہ سخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے

(بانگِ درا: ۸۵)

یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ، یاں درد کی کسک ہے

(بانگِ درا: ۸۵)

اندازِ گفتگو نے دھوکے دیے ہیں ، ورنہ
نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے

(بانگِ درا: ۸۵)

یہ شعر سنیے:

کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

دین و ہنر

سرود و شعر و سیاست ، کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ!
ضمیرِ بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی
بلند تر ہے ستاروں سے اُن کا کاشانہ!
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ!
ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ!

(ضربِ کلیم: ۱۰۰)

---

(۱۶)
منت پذیری

داغ بھی اقبال کے استاد تھے۔ آرنلڈ سے اقبال نے زیادہ فیض حاصل کیا۔ داغ سے کم، لیکن فیض وہ چیز ہے جو ناپ تول کر نہیں لیا جاتا، یہ وہ نعمت ہے کہ کم ہو یا زیادہ جس سے ملے، دل اس کے گیت گاتا ہے، اس کی تعریف کرتا ہے، اس کا ممنون ہوتا ہے اور یہ منت پذیری، نطق و بیان کے لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

اقبال کا رنگ اور تھا، داغ کا اور، دونوں میں بعد المشرقین تھا، ایک ۔۔۔ اقبال ۔۔۔ فطرتِ انسانی کا راز داں تھا، قدرتِ الٰہی کا محرم اسرار تھا۔ قوموں کے عروج و زوال کا رمز آشنا تھا، دوسرا ۔۔۔ داغ ۔۔۔ رندی اور ہوس مشربی کا پیامبر تھا، عشق و محبت کا افسانہ خواں تھا، معاملہ بندی اور تغزل کا نغمہ سرا تھا۔ ان دونوں میں کوئی مناسبت بھی نہیں تھی، یکسانیت بھی نہیں تھی۔ لیکن اقبال داغ کے شاگرد تھے۔ زبان کے اسرار و رموز، محاورات کی نزاکت، ترکیب اور بندش کا فن انہوں نے داغ سے سیکھا، شاگردی اور استادی کی مدت بہت مختصر رہی، لیکن اپنا کام کر گئی، ایک ایسا نقش بٹھا گئی، جسے زمانہ کی گردش بھی محو نہ کر سکی۔

داغ کی وفات پر اقبال نے ایک اثر انگیز نظم کہی ہے اور داغ کے فن کو سراہا ہے۔ اس کی شخصی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ اس کی زبان دانی، نکتہ سنجی اور تخیل آفرینی کی داد دی ہے۔ ایک ہم عصر، ایک دوست، ایک شاگرد جو کچھ کہہ سکتا ہے وہ سب اقبال نے کہہ دیا ہے۔ آخر میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ عام سے زیادہ خاص ہے، یعنی اس میں ذاتی رنگ نمایاں ہے۔ چند شعر آپ بھی سن لیجیے:

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی روئے خاکِ دلی! داغؔ کو روتا ہوں میں

(بانگِ درا: ۹۰)

اے جہاں آباد اے سرمایۂ بزمِ سخن!
ہو گیا پھر آج پامالِ خزاں تیرا چمن!

(بانگِ درا: ۹۰)

وہ گلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بُو ہوا
آہ! خالی داغؔ سے کاشانۂ اُردُو ہوا

(بانگِ درا: ۹۰)

مسلم کی صداقت

دمِ تقریر تھی مسلم کی صداقت بے باک
عدل اس کا تھا قوی، لوثِ مراعات سے پاک
شجرِ فطرتِ مسلم تھا حیا سے نمناک
تھا شجاعت میں وہ اک ہستیِ فوق الادراک
خود گدازی نمِ کیفیتِ صہبایش بود
خالی از خویش شدن صورتِ مینایش بود

(بانگِ درا: ۲۰۳)

(۱۷)

سکوتِ شام

شام کا وقت ہے۔ دن کی سرگرمیاں ختم ہو رہی ہیں۔ شام کی نشاط افروزیوں کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے، لوگ مصروفیتوں سے فراغت کے بعد واپس جا رہے ہیں، کوئی بیتابانہ گھر کی طرف لپک رہا ہے، کسی کے قدم کلب کی جانب بڑھ رہے ہیں، کسی کو سینما کی دلکشی اپنی طرف کھینچ رہی ہے، کسی کو تھیٹر کی جلوہ سامانیاں دعوت دے رہی ہیں، کوئی بازارِ حسن کا طواف کر رہا ہے، کوئی عشوہ فروشوں کے بالا خانوں کا رُخ کر رہا ہے۔

ہر کس بہ خیالِ خویش خبطے دارد

لیکن ہمارا شاعر ان سب چیزوں سے بے تعلق اور بے نیاز ہو کر دریائے راوی کے کنارے پہنچتا ہے اور وہاں کا منظر دیکھ کر کھو جاتا ہے۔ کچھ عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس پر

سکوتِ شام میں محوِ سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی

(بانگِ درا: ۹۴)

شاعر دریا کے کنارے کھڑا ہے، موجیں اٹھ رہی ہیں، گرداب بن رہے ہیں۔ ننھی ننھی، چھوٹی چھوٹی ہر قسم کی مچھلیاں پانی کے فرش پر محوِ خرام ہیں۔ فضا کا سناٹا بڑھتا جاتا ہے۔ شور و غل کا راج ختم ہو چکا ہے، سکوت اور سکون کی دُنیا آباد ہو رہی ہے۔

سر کنارۂ آبِ رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں

لیکن یہ بے خودی، دعوت فکر و نظر بھی دے رہی ہے، شاعر دیکھتا ہے:

روان ہے سینۂ دریا پہ ایک سفینۂ تیز
ہوا ہے موج سے ملاح جس کا گرمِ ستیز

(بانگِ درا: ۹۵)

کشتی بڑی تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی ہے۔

سبک روی میں ہے مثلِ نگاہ یہ کشتی
نکل کے حلقۂ حدِ نظر سے دُور گئی

(بانگِ درا: ۹۵)

کشتی نظروں سے اوجھل ہو گئی، لیکن شاعر کے سامنے کتابِ معرفت کھل گئی۔

جہازِ زندگی آدمی رواں ہے یونہیں
ابد کے بحر میں پیدا یونہیں نہاں ہے یونہیں

(بانگِ درا: ۹۵)

اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ:

شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

(بانگِ درا: ۹۵)

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری
از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن
تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری

(بانگِ درا: ۲۶۱)

---

(۱۸)

کارواں کی منزلِ مقصود

اہل اللہ کا تصرف باطنی وہم وسوسہ نہیں ایک حقیقت ہے۔ اقبال اگرچہ دانش افرنگ اور علومِ مغربی سے بہرہ ور تھے، لیکن اپنے مذہب کے والا وشیدا تھے، اپنی قوم پر جان دیتے تھے، اپنے اکابر کا احترام کرتے تھے اور ان سے اظہارِ عقیدت میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔

سلطان اولیاء حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہی سے اقبال کی بڑی عقیدت تھی۔ وہ جب دلّی جاتے تھے، مزارِ پُر انوار پر حاضری دیتے تھے، خانقاہ کی دیواروں پر بہ خط جلی خواجہ حسن نظامی مغفور نے اقبال کے بہت سے اشعار جو سلطان اولیاء کی تعریف میں ہیں رقم کرا دیے ہیں۔ آج بھی ہر زائر اس کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ ابھی حال میں (۲ ستمبر ۱۹۵۶ء) جب راقم الحروف دہلی اور لکھنو کے سفر پر ایک ضرورت سے صرف دو دن کے لیے روانہ ہوا تو سلطان الا ولیاء کی بارگاہ فلک پا نگاہ پر بھی حسبِ معمول حاضری دی۔ اس مرتبہ اقبال کے یہ اشعار دیکھ کر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔

بیرسٹری اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لیے جب اقبال نے سفرِ یورپ کا عزم کیا تو سب سے پہلے وہ دلّی آئے اور ''اِلتجائے مسافر'' کے عنوان سے ایک معرکہ آرا نظم انہوں نے نذر کے طور پر خانقاہ میں پیش کی۔ اس طویل نظم کو سب کا سب تو درج نہیں کیا جا سکتا البتہ وہ اشعار جن میں اقبال کی رُوح اور فطرت و شخصیت جھلکتی ہے، ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

مزارِ پُر انوار پر پہنچ کر اقبال کے منہ سے بے ساختہ نکلتا ہے:

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

(بانگِ درا: ۹۶)

محبّت آئین وحدود کی پابند نہیں ہوتی، وہ اپنا راستہ آپ پیدا کرتی ہے۔

مسیح وخضر سے اونچا مقام ہے تیرا

خالص مذہبی نقطۂ نظر سے ممکن ہے بعض لوگوں کے لیے قابلِ اعتراض ہو، لیکن آئین محبت میں اس طرح کی باتیں جائز ہیں۔

اس کے بعد کتنے جوش اور کتنے خلوص کے ساتھ فرماتے ہیں:

اگر سیاہ دلم ، داغ لالہ زارِ توام
وگر کشادہ جبینم، گل بہارِ توام

(بانگِ درا: ۹۶)

اقبال، بہت بڑے سفر پر ایک، بہت بڑا مقصد لے کر جا رہے ہیں، دوستوں کی دعائیں ان کے ساتھ ہیں:

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست
تانہ پنداری کہ تنہا مے روی

ماں کی دعائیں اور عاشق زار بھائی کی دعائیں بھی ہمرکاب ہیں۔۔۔وہی ماں جس کے لیے انہوں نے کہا تھا:

دفترِ ہستی میں تھی زرّیں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

(بانگِ درا: ۲۳۹)

اور وہی بھائی جس کے لیے انہوں نے کہا تھا:

کاروبارِ زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا
وہ محبت میں تری تصویر، وہ بازو مرا

(بانگِ درا: ۲۲۹)

لیکن دعاؤں کے اس توشہ کو وہ ناکافی خیال کرتے تھے۔ان دعاؤں میں، محبت تھی، تعلقِ خاطر تھا اور کوئی شبہ نہیں، یہ دونوں قیمتی چیزیں ہیں، لیکن وہ تقدس اور تصرّف نہ تھا، جو صرف کسی اہل اللہ کی دعا میں ہوسکتا ہے، چنانچہ سفرِ لندن پر روانہ ہونے سے پہلے وہ دتی گئے اور خانقاہِ سلطان الاولیاء اللہ میں حاضری دی اور مزارِ پُر انوار کے سامنے پہنچ کر، دل کی مراد الفاظ کی صورت میں زبان پر لے آئے۔

سب سے پہلے عزمِ سفر کا اظہار کرتے ہیں:

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثلِ نکہتِ گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو

(بانگِ درا: ۹۶)

اور اس عزمِ سفر کا اظہار کرنے کے بعد یہ بات بھی واضح کردیتے ہیں کہ میرے سفر کا مقصد جاہ و منزلت نہیں، منصب اور عہدہ بھی نہیں ہے۔دُنیا اور دُنیا کی رنگینیاں بھی نہیں ہیں۔میں اس لیے نہیں جارہا ہوں کہ وہاں کی ایمان شکست فضا میں کھوجاؤں، خدا کو فراموش کردوں، کوئی اعتراض کرے، تو معذرت کے طور پر کہہ دوں، کیفیت تو یہ تھی کہ:

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش تھا

اس حالت میں غرقِ مئے ناب ہونے کے سوا میں اور کر کیا سکتا تھا؟

وہ صاف الفاظ میں عرض کرتے ہیں، میرے سفر کا مقصد حصولِ علم ہے۔وہی علم جس کے بارے میں خواجۂ کونین ﷺ نے فرمایا ہے:

اطلبوا العلم و لو کان بالصین

علم حاصل کرو، خواہ چین ہی کا سفر کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔

اسی ارشاد کی پیروی میں، یہ دُور دراز کا سفر اختیار کر رہا ہوں:

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

(بانگِ درا: ۹۶)

اور اب التجائے دعا کرتے ہیں:

فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو

اور کون کہہ سکتا ہے یہ التجا قبول نہیں ہوئی؟

مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو

(بانگِ درا: ۹۶)

کیا اقبال اپنی زندگی میں منزلِ کارواں نہیں بن گئے؟

مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دُکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو

(بانگِ درا: ۹۶)

دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر
تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو

(بانگِ درا: ۹۷)

پھر آ رکھوں قدمِ مادر و پدر پہ جبیں
کیا جنہوں نے محبت کا رازداں مجھ کو (بانگِ درا: ۹۷)

اپنے استاد میر حسن کا ذکر کس عقیدت و محبت سے کرتے ہیں:

وہ شمع بارگہ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسماں و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

(بانگِ درا: ۹۷)

بھائی کے ذکر میں لفظ لفظ سے محبت پھوٹی پڑتی ہے:

وہ میرا یوسفِ ثانی، وہ شمع محفلِ عشق
ہوئی ہے جس کی اخوت قرارِ جاں مجھ کو

(بانگِ درا: ۹۷)

جلا کے جس کی محبت نے دفترِ من و تو
ہوائے عیش میں پالا، کیا جواں مجھ کو
ریاضِ دہر میں مانندِ گل رہے خنداں
کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جانِ جاں مجھ کو

(بانگِ درا: ۹۷)

التجائے مسافر ختم ہوتی ہے:

شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے!
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے!

(بانگِ درا: ۹۷)

درسِ خودی

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا
مقامِ رنگ و بُو کا راز پا جا
برنگِ بحر ساحل آشنا رہ!
کفِ ساحل سے دامن کھینچتا جا

(بالِ جبریل: ۸۵)

(۱۹)

تقلید

انقلاب نام ہے، تغیر کا، زندگی کا، جوش اور ولولہ کا، تقلید نام ہے جمود کا، موت کا، افسردگی فکر اور اضمحلالِ آرزو کا۔

اگر تقلید بودے شیوۂ خوب
پیمبرؐ ہم رہِ اجداد رفتے

(پیام مشرق: ۲۲۲)

ہاں وہ تقلید قرار واجب اور ضروری ہے جو ضمیر سے ہم آہنگ ہو۔ دلیل اور برہان کی پابند ہو، حقیقت اور معرفت کا جس سے نشان ملتا ہو۔

اقبال اس تقلید کے مخالف تھے، جو انسان میں جمود اور تعطل پیدا کردے، جو اس کی عقل وخرد پر چھاپہ مارے اور اسے ختم کردے، جو ضمیر کی آواز دبا دے اور دانش وبینش کو بے کار کردے، یہ تقلید ان کے نزدیک مرگِ آفریں تھی اور مسلمان قوم اس لیے دنیا میں مبعوث نہیں کی گئی تھی کہ کھائے پئے اور مر جائے۔ اس لیے بھیجی گئی تھی کہ دُنیا کی رہنمائی کرے، اسے غلط راستہ سے ہٹائے اور صحیح راستہ پر گام زن کردے۔ مسلمان موت کا قاتل ہے، موت مسلمان کو ہلاک نہیں کر سکتی۔

اس لیے ان کا پیام یہ ہے:

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ، خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

(بانگِ درا: ۱۰۷)

ہوشیار

گرمِ فغاں ہے جرس اٹھ کہ گیا قافلہ
وائے وہ رَہرو کہ ہے منتظرِ راحلہ!
تیری طبیعت ہے اور، تیرا زمانہ ہے اور
تیرے موافق نہیں خانقہی سلسلہ!
دل ہو غلامِ خرد یا کہ امامِ خرد
سالکِ رہ ہوشیار! سخت ہے یہ مرحلہ
اس کی خودی ہے ابھی شام و سحر میں اسیر
گردشِ دَوراں کا ہے جس کی زبان پر گِلہ
تیرے نفس سے ہوئی آتشِ گُل تیز تر
مرغِ چمن! ہے یہی تیری نوا کا صِلہ!

(بالِ جبریل: ۷۲)

---

(۲۰)

گریۂ جاں گداز

شمع کی جو چیز اقبال کو بھاتی ہے، وہ اس کا گریۂ جاں گداز ہے۔ وہ سوچتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ اگر زندگی سوز سے خالی، درد سے محروم اور لذتِ آزار سے تہی ہے تو وہ زندگی نہیں، ایسی زندگی اپنے سامنے کوئی مقصد نہیں رکھتی، ایسی زندگی پروان نہیں چڑھ سکتی، ایسی زندگی میں جوش و ولولہ نہیں۔ وہ مسلمان کو درسِ حیات دیتے ہیں اور اس درسِ حیات کی بنیاد اساس یہ ہے کہ مسلمان اپنی خودی کو نہ فراموش کرے، اپنی حقیقت کو نہ بھولے، اپنے مقصد کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دے اور یہ جذبہ اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتا جب تک عشق اور سوز و گداز کی کیفیت ان میں نہ پیدا ہو۔ جب تک وہ شمع کے استقلال سے کام نہ لے۔ نتائج اور ثمرات سے بے پروا ہو کر اپنے مقصد کی دھن میں گام فرسا نہ رہے۔ شمع کی طرح گھلے، گھلتا رہے، لیکن مقصد کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔

یہی بات ہے جسے وہ پیغام کی صورت میں اپنی قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں:

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا
بزم کو مثلِ شمعِ بزم، حاصلِ سوز و ساز دے (بانگِ درا:۱۱۳)

شانِ کرم پہ ہے مدار عشقِ گرہ کشائے کا
دیر و حرم کی قید کیا! جس کو وہ بے نیاز دے (بانگِ درا:۱۱۳)

اور حاصلِ کلام یہ کہ:

صورتِ شمع نور کی ملتی نہیں قبا اُسے
جس کو خدا نہ دہر میں گریۂ جاں گداز دے

(بانگِ درا: ۱۱۳)

صحنِ چمن کنجِ قفس

کمالِ ترک نہیں آب و گِل سے مہجوری
کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری!
میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا
تمھارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری
حکیم و عارف وصوفی تمام مستِ ظہور
کسے خبر کہ تجلّی ہے عین مستوری!
وہ ملتفت ہوں تو کنجِ قفس بھی آزادی
نہ ہوں تو صحنِ چمن بھی مقامِ مجبوری
بُرا نہ مان، ذرا آزما کے دیکھ اسے
فرنگ دل کی خرابی، خرد کی معموری!

(بالِ جبریل: ۴۳۔۴۲)

---

(۲۱)

جذبِ حرم

آج کی قوم کل قبر میں ہوگی اور آج کے لڑکے کل قوم بنیں گے۔

یہ قوم جو قبر میں جانے کی تیاریاں کر رہی ہے، اب جوشِ کردار سے محروم ہو چکی ہے۔ وہ پود جو بہت جلد قوم بننے والی ہے، اپنے تازہ ولولوں سے بہت کچھ کر سکتی ہے، انقلاب لا سکتی ہے، دُنیا کا تختہ اُلٹ سکتی ہے، منزلِ مقصود تک پہنچ سکتی ہے، کاروانِ آرزو کی سالاری کر سکتی ہے۔

اقبال اس حقیقت سے آشنا تھے، وہ نئی پود سے جو امید رکھتے تھے اپنے ہم عمروں اور ہم عصروں سے نہیں رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے بھارت اور پاکستان کے بڑے ''قوم ساز'' ادارے ــــ مسلم یونیوسٹی علی گڑھ ــــ کے طلبہ کو اپنا مخاطب بنایا اور فرمایا:

اوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے
طائرِ زیرِ دام کے نالے تو سن چکے ہو تم
یہ بھی سنو کہ نالۂ طائرِ بام اور ہے
(بانگِ درا: ۱۱۴)

طائرِ زیرِ دام کا نالۂ درسِ غلامی؟ اور طائرِ بام کا نالہ ــــ؟

جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمنِ حجاز کا
اِس کا مقام اور ہے، اُس کا نظام اور ہے (بانگِ درا:۱۱۵)

موت ہے عیشِ جاوداں ذوقِ طلب اگر نہ ہو
گردشِ آدمی ہے اور، گردشِ جام اور ہے

(بانگِ درا:۱۱۵)

بس یہی "ذوقِ طلب" اور یہی "جذبِ حرم" اقبال کا پیام تھا—— پیامِ اقبال کی رُوح تھی۔

دل کی بیداری

دلِ بیدار فاروقی، دلِ بیدار کراری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری
دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری
مشامِ تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشاں اس کا
ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری!

(بالِ جبریل:۳۷)

(۲۲)

حسنِ کامل

شاعر حسن کا دلدادہ ہوتا ہے۔ اس کی جادوِ بیانی، سحر طرازی، قافیہ پیائی، رنگین مزاجی، رہینِ منت ہوتی ہے حسن کی، وہ جہاں، جس جگہ، جس کسی میں حسن کی تجلی پاتا ہے، اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دیتا ہے۔ وہ خرمن ہے اور حسن برق خرمن سوز، پھر بھی اس میں اور حسن میں ایسا رشتہ قائم ہے، جو ناقابلِ انفصال ہے، جو کبھی اور کسی حالت میں نہیں ٹوٹ سکتا۔ وہ حسن کو دیکھ کر مچل جاتا ہے اور پھر قابو میں نہیں آتا، حسن کے پاس سب کچھ ہے اور شاعر کی بساط، عشق کے سوا کچھ نہیں۔ وہ شمع کی طرح پگھلتا، پروانے کی طرح جلتا اور بلبلِ ناشاد کی طرح آہ وفغاں کرتا ہے، اسی آہ وفغاں پر اس کی زندگی قائم ہے اور اپنی اس زندگی پر وہ مغموم نہیں، نازاں ہے، اس کو وہ حاصلِ چاہت سمجھتا ہے۔ یہی اس کی زندگی کا مدار ہے، یہی زندگی کا مقصد، یہی منزلِ مقصود۔

اقبال میں ایک خاص وصف یہ ہے کہ جب وہ کسی نازک موضوع پر زبانِ سخن وا کرتا ہے تو سب سے پہلے وہ زبان کے پجاریوں، الفاظ کے نقش بندوں اور ترکیب و بندش کے متوالوں کے سامنے انہی کی زبان میں گفتگو کرتا ہے، اور جب انہیں اپنے اعجازِ کلام کا قائل کر لیتا ہے تب اپنے خاص رنگ پر آتا ہے۔ وہی رنگ جس میں شیوہ بیانی بھی ہے اور نغز گفتاری بھی، سوز بھی ہے اور ساز بھی، اُپج بھی ہے اور ندرت بھی، کیف بھی ہے اور سحر بھی۔

''حسن و عشق'' کے عنوان سے ایک بڑی ستھری اور پیاری نظم اقبال نے لکھی ہے، پوری نظم حلقۂ ثریا ہے، کوئی شعر بھی پڑھیے اس کا جادو اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہے گا، لیکن جہاں عشق کی زبان میں اپنا اور حسن کا تقابل کیا ہے وہاں تو زورِ بیان اور حسنِ کلام کی انتہا نہیں رہتی۔

میں نے حضرت سودا کو سنا بولتے یارو
اللہ رے اللہ رے کیا لطفِ بیاں ہے

اقبال جب اپنے رنگ میں کچھ کہتا ہے تو اس کے کلام کا تیور ہم زبانوں کو پہلے ہی سے متنبہ کر دیتا ہے۔

اب بزم میں حاضر جو کوئی پیر و جواں ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ میرے منہ میں زباں ہے

چنانچہ اس معرکہ آرا نظم کا آغاز ایسے تیور اور ایسے اسلوب سے ہوتا ہے کہ ذوقِ سلیم سر دُھننے لگتا ہے، وجدان پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، زبان بلائیں لینے لگتی ہے، لطافتِ بیان اور حسنِ کلام کو خود اپنے وجد پر ناز ہونے لگتا ہے اور مدعی بھی یہ ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ہاں زبان اسے کہتے ہیں، بیان یہ ہوتا ہے، ترکیب اور بندش اس کا نام ہے، اسلوب بدیع اور انداز دل آویز اسے کہتے ہیں --- سنیے:۔

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیِ سیمینِ قمر
نورِ خورشید کے طوفان میں ہنگامِ سحر
جیسے ہوجاتا ہے گم، نُور کا لے کر آنچل
چاندنی رات میں مہتاب کا ہم رنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم
موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم
ہے ترے سیلِ محبت میں یوں ہی دل میرا

(بانگِ درا:۱۱۶)

اس قصیدہ خوانی کے بعد پھر اپنا اور حسن کا ربط بتاتے ہیں:

ہے میرے باغِ سخن کے لیے تو بادِ بہار
میرے بے تاب تخیل کو دیا تو نے قرار

جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں
نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں
حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریکِ کمال
تجھ سے سرسبز ہوئے میری امیدوں کے نہال
قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا

(بانگِ درا: ۱۱۶)

سوال

زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟
ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک
نوجواں اقوامِ نَو دولت کے ہیں پیرایہ پوش!
گرچہ اسکندر رہا محروم آبِ زندگی
فطرت اسکندری اب تک ہے گرم ناؤ نوش!
بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ
خاک وخوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش!

(بانگِ درا: ۲۵۶۔۲۵۷)

(۲۳)

اقبال

تعلّی اور خودستائی سے ہٹ کر بھی کبھی شاعر اپنے بارے میں اظہارِ خیال کرتا ہے۔ خاص طور پر اقبال اپنی ذات سے متعلق جب کچھ کہتے ہیں تو اس میں تعلّی اور خودستائی بہت کم ہوتی ہے، حقیقت اور بیانِ واقعہ کا رنگ زیادہ نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ انہوں نے ''عاشق ہرجائی'' کے عنوان سے جو طویل نظم کہی ہے وہ ہمارے دعویٰ کا بہترین ثبوت ہے۔

اس نظم میں پہلے ایک معترض اقبال کے صفات و کردار پر، ذات اور سیرت پر، شخصیت اور رفتار و گفتار پر، فکر و عقیدہ پر، قول و عمل پر اعتراض کرتا ہے اور چُن چُن کے نقائص نکالتا اور عیوب بیان کرتا ہے۔ پھر اقبال اس بلندی پر کھڑے ہو کر جو ہمیشہ اونچی ہی ہوتی رہی ایک ایک کر کے اپنے معترض کو جواب دیتے ہیں اور بڑی آسانی سے اسے لاجواب کر دیتے ہیں۔

''معترض'' کے سارے اعتراضات سننے کا تو وقت آپ کہاں سے لائیں گے، لیکن چند بہر حال سن لیجیے۔ کتنا عاجز آ کر کہتا ہے:

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال! تو
رونقِ ہنگامۂ محفل بھی ہے، تنہا بھی ہے

(بانگِ درا:۱۲۲)

یہی نہیں بلکہ

تیرے ہنگاموں سے اے دیوانہ رنگیں نوا!
زینتِ گلشن بھی ہے ، آرائشِ صحرا بھی ہے
(بانگِ درا:۱۲۲)

اور سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ:

ہم نشیں تاروں کا ہے تو رفعتِ پرواز سے
اے زمیں فرسا،قدم تیرا فلک پیما بھی ہے
(بانگِ درا:۱۲۲)

اس ستم ظریفی پر معترض کو حیران ہونا ہی چاہیے تھا۔

عین شغلِ مے میں پیشانی ہے تیری سجدہ ریز
کچھ ترے مسلک میں رنگِ مشربِ مینا بھی ہے
(بانگِ درا:۱۲۲)

جانبِ منزل رواں ہے نقشِ پا مانندِ موج
اور پھر افتادہ مثلِ ساحلِ دریا بھی ہے
حسنِ نسوانی ہے بجلی تیری فطرت کے لیے
پھر عجب یہ ہے کہ تیرا عشق بے پروا بھی ہے
(بانگِ درا:۱۲۲)

ہے حسینوں میں وفا ناآشنا تیرا خطاب
اے تلوّن کیش! تو مشہور بھی، رُسوا بھی ہے
(بانگِ درا:۱۲۲)

اقبال بڑے صبر وضبط سے کام لیتے ہیں اور یہ سارے اعتراضات بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ہنس ہنس کر سنتے رہتے ہیں لیکن انہیں تسلیم نہیں کرتے اور تسلیم کریں بھی کیوں جب

کہ ان کے پاس ہر اعتراض کا شافی اور کافی جواب موجود ہے۔

معترض کے یہ سارے اعتراضات سننے کے بعد وہ بڑی نرمی اور ملائمت سے اُسے مخاطب کرتے ہیں اور فرماتے ہیں جناب آپ اس حقیقت کو کیا جانیں کہ:

دل نہیں شاعر کا ، ہے کیفیتوں کی رستخیز
کیا خبر تجھ کو، درونِ سینہ کیا رکھتا ہوں میں

(بانگِ درا: ۱۲۳)

کہتے ہیں میں ان حسینوں سے محبت نہیں کرتا حُسن سے کرتا ہوں:

گو حسینِ تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نظر
حسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں

(بانگِ درا: ۱۲۳)

یعنی حسینوں سے رشتۂ ارتباط ٹوٹ سکتا ہے لیکن حسن سے نہیں ٹوٹ سکتا۔

معترض صاحب کو ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اقبال کا عشق بے پروا ہے، اس کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

بے نیازی سے ہے پیدا میری فطرت کا نیاز
سوزوسازِ جستجو مثلِ صبا رکھتا ہوں میں
فیضِ ساقی شبنم آسا ، ظرف دلِ دریا طلب
تشنۂ دائم ہوں، آتش زیرِ پا رکھتا ہوں میں

(بانگِ درا: ۱۲۳)

معترض صاحب نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک سے ایک اعتراض کیا تھا۔ یہ بات تو ان کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگی کہ اس سلسلہ میں اقبال خود ان کی مدد کریں گے۔ یعنی ان کے اعتراضات کی فہرست میں ایک نہایت سخت اور سنگین اعتراض کا اضافہ کردیں گے کہ آپ تو صرف یہی کچھ فرمارہے تھے میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ جانتا ہوں۔ اس اعتراض تک

آپ کو پہنچائے دیتا ہوں جہاں تک کسی طرح آپ کی طبعِ رسا پہنچ نہیں سکتی تھی، آپ کو مجھ سے جو گلہ ہے وہ اپنی اہمیت اور نوعیت کے اعتبار سے بہت ہلکا ہے، میں تو اس سے کہیں بڑا مجرم ہوں جتنا آپ نے سمجھ رکھا ہے:

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
نقش ہوں، اپنے مصوّر سے گِلہ رکھتا ہوں

(بانگِ درا: ۱۲۳)

اور لیجیے:

محفلِ ہستی میں جب ایسا تنک جلوہ تھا حسن
پھر تخیّل کس لیے لا انتہا رکھتا ہوں میں

(بانگِ درا: ۱۲۳)

دیکھ لیا آپ نے؟ بات شروع کہاں سے ہوئی تھی اور پہنچی کہاں؟ آغازِ کلام ہوا تھا نمودِ حسن سے اور بات ختم ہوئی حسنِ ازل پر۔

(۲۴)

خندہ و گریہ

خوشی کا کیف عارضی ہے۔ غم کا کیف مستقل، قہقہہ اٹھتا ہے اور فضا میں گم ہو جاتا ہے۔ آنسو گرتا ہے اور زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔ وہ فضا میں گم ہو کر، فنا کی گود میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو جاتا ہے۔ یہ زمین میں جذب ہو کر، جانِ جاوداں حاصل کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حساس اور دردمند لوگوں کو قہقہہ میں وہ لطف نہیں آتا جو کیفیت اشک سوزاں میں محسوس ہوتی ہے۔ شاعر سے بڑھ کر حساس اور دردمند کون ہوگا۔ اسے خندہ نہیں بھاتا۔ گریہ پسند آتا ہے۔

اسی کیفیت کو اقبال نے ایک نظم میں بڑے دل میں اتر جانے والے اسلوب سے بیان کیا ہے۔

زندگانی ہے مری مثل ربابِ خاموش
جس کی ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش
بربطِ کون و مکاں جس کی خموشی پہ نثار
جس کے ہر تار میں ہیں سینکڑوں نغموں کے مزار
محشرستاں نوا کا ہے امیں جس کا سکوت
اور منت کشِ ہنگامہ نہیں جس کا سکوت

آہ! امید محبت کی بر آئی نہ کبھی
چوٹ مضراب کی اس ساز نے کھائی نہ کبھی

(بانگِ درا: ۱۲۴تا۱۲۵)

لیکن اس کے باوجود

مگر آتی ہے نسیمِ چمنِ طور کبھی
سمتِ گردوں سے ہوائے نفسِ حور کبھی

(بانگِ درا:۱۲۵)

وہ ہوائے نفسِ حور کیا ہے؟

جس طرح رفعتِ شبنم ہے مذاقِ رم سے
میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے!

(بانگِ درا:۱۲۵)

مغربی جمہوریت

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ اِستبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری!
گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری!

(بانگِ درا: ۲۶۱)

(۲۵)

روزگار انسان

انسان کی فطرت ''کیوں؟'' ''کیا؟'' اور کیسے؟'' ہے، جب کوئی چیز اس کی نظر سے گزرتی ہے فوراً اس کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے یہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ کیسے ہے؟ لیکن انسان کا عالم یہ ہے کہ وہ سمندر کی تہہ میں پہنچ جاتا ہے، آسماں تک پرواز کر لیتا ہے، لیکن فطرت کے سربستہ رازوں کی نقاب کشائی اب تک نہیں کر سکا۔ قدرت نے ایک طرف اسے ذوقِ آگہی دیا ہے۔ دوسری طرف معرفت کے تمام دروازے اس پر بند کر دیے ہیں۔ ایک طرف وہ اس دنیا کو دیکھتا ہے۔ اس کے کارخانے کو دیکھتا ہے۔ اس کے نظام کو اور اس کے استحکام کی طرف دیکھتا ہے۔ دوسری طرف علم کے دروازے سے سر ٹکرا کر واپس آ جاتا ہے۔ اللہ تک رسائی نہیں ہوتی۔ بھید نہیں کھلتے۔ اسرار پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ انسان کہیں ناکام نہیں ہوتا، یہاں آ کر بے بس ہو جاتا ہے۔ قدرت کے سامنے اس کی کچھ نہیں چلتی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو ہیچ اور ناکارہ سمجھنے لگتا ہے۔ ایک عقدہ بھی حل نہیں کر پاتا۔

اقبال ایک شاعر اور ایک حکیم کی حیثیت سے کارخانہ قدرت اور اس کے اسرار و رموز پر غور کرتے ہیں مگر کچھ سمجھ نہیں آتا، وہ غور کرتے ہیں یہ نسیم سحر کیا ہے؟ یہ بادِ صرصر کیوں ہے؟ دریا کی یہ روانی، سمندر کا یہ تلاطم، کس نظام کے ماتحت ہے؟ یہ ابر، یہ موسم برشگال، یہ اس کی رعنائیاں کیسے ہیں؟ کس طرح ہیں؟ یہ تارے اور سیارے کیا ہیں؟ ان کے پاؤں میں گردش پرکار کس طرح آ گئی ہے کہ یہ

زندان فلک میں پابہ زنجیر

ہو کر رہ گئے؟ اور یہ سورج، یہ عابد سحر خیز، جس کی روشنی سے دنیا قائم ہے، جس کی حرارت سے دنیا میں نم اور زندگی ہے، جو ہر روز نہایت پابندی وقت کے ساتھ، مغرب کی وادیوں میں چھپ کر

پیتا ہے مے شفق کا ساغر

یہ کیا ہے؟ اس کی ماہیت کیا ہے؟ نوعیت کیا ہے؟ نظام کیا ہے؟ اتنی بڑی طاقت کس طرح اتنی پابند ہے کہ اس کی رفتار میں انچ کا کروڑواں حصہ بھی فرق نہیں آتا۔ اس کے اوقات میں سیکنڈ کا کروڑواں حصہ بھی ادھر سے ادھر نہیں ہوتا۔ ایک بے بس معمول کی طرح، یہ کیونکر مصروف خرام ہے اور وہ کون سی منزل ہے جس کی طرف سیارگان فلک، ماہ تمام، خورشید عالم تاب، رواں دواں بڑھے چلے جا رہے ہیں۔

شاعر اس معمہ کو حل کرنے کی کتنی کوشش کرتا ہے اتنا ہی ناکام ہوتا ہے، کامیابی کی منزل دور تر ہوتی جا رہی ہے، لیکن اس ناکامی میں وہ تنہا نہیں ہے، دنیا کے بڑے بڑے حکیم اور فلسفی، اس راز کی تہہ تک نہ پہنچ سکے۔ ساری زندگی اس عقدہ کشائی میں صرف کر دی، مگر کامیاب نہ ہوئے، آخر یہ راز کبھی کھل بھی سکے گا یا نہیں؟ آخر قدرت کی اس ستم ظریفی پر وہ صدائے احتجاج بلند کرتا ہے:

انسان کو راز جو بنایا
راز اس کی نگاہ سے چھپایا

(بانگِ درا:۱۲۶)

پھر، وہ اس نظام قدرت کی ناقابلِ فہم، عجوبہ کاریاں بیان کرنے کے بعد کہتا ہے اور گویا حقیقت تک پہنچ کر کہتا ہے، کیفیت تو یہ ہے کہ:

لذت گیرِ وجود ہر شے
سرمستِ نمود ہر شے

(بانگِ درا:۱۲۷)

مگر

کوئی نہیں غمگسارِ انساں!
کیا تلخ ہے روزگارِ انساں!

(بانگِ درا:۱۲۷)

انسان کی بے بسی کی یہ کتنی سچی تصویر ہے

(۲۶)

آنسوؤں کے تارے

جلوت وخلوت' ہر ایک کا رنگ اِلگ الگ ہے' جو بات جلوت میں ہے' وہ خلوت میں نہیں' جو خلوت میں ہے' وہ جلوت میں نہیں۔ بزم وانجمن کی رونق' اپنی جگہ مسلّم' لیکن تنہائی قلب میں' جو سکون' جو لذت اور جو یکسوئی ہے' اس کا بھی کوئی جواب نہیں۔

شاعر کو انجمن میں وہ لطف نہیں آتا' جو تنہائی میں آتا ہے۔

انجمن کی ہنگامہ آرائیاں' شور ہاؤ ہو' اس کی یکسوئی فکر میں خللِ انداز ہوتا ہے۔ اگر انجمن میں بیٹھتا ہے تو تنہا۔ اس کا جسم انجمن میں ہوتا ہے' دل کہیں اور یہی بات اقبال اپنے دل کو سمجھاتے ہیں۔

رات کا وقت ہے' بزم شبینہ کی نشاط افروزیاں قائم ہیں۔ مے کدہ میں شور نوشا نوش بلند ہے۔ گھروں میں چہل پہل اور رونق کی کیفیت ہے' لیکن شاعر ان تمام ہنگاموں سے دور ایک گوشہ تنہائی میں بیٹھا ہے۔ دل میں مجلس آرائی کی امنگ اٹھتی ہے' وہ دل کو سمجھاتا ہے' تو اپنے آپ کو تنہا کیوں محسوس کرتا ہے؟ کیا بزم انجم تیری دلچسپی کے لئے کافی نہیں؟

تنہائیِ شب میں ہے حزیں کیا؟
انجم نہیں تیرے ہم نشیں کیا؟

(بانگِ درا:۱۲۹)

اور ذرا دیکھ تو' یہ سکوت' یہ خامشی کوئی بری چیز نہیں۔

یہ رفعتِ آسمانِ خاموش
خوابیدہ زمیں، جہانِ خاموش

(بانگِ درا:۱۲۹)

ہر وہ چیز خاموش ہے، جس میں بلندی ہے، رفعت ہے، لیکن یہ خاموشی بھی اپنے اندر ایک تکلم رکھتی ہے، اور دعوتِ نظارہ دیتی ہے۔

یہ چاند، یہ دشت و در، یہ کہسار
فطرت ہے تمام نسترن زار

(بانگِ درا:۱۲۹)

اور اس ذرا کے لئے، اس نسترن زار سے بھی قطع تعلق کر لے۔ کیا آنسوؤں سے بڑھ کر بھی کوئی رفیق ہو سکتا ہے؟

موتی خوش رنگ پیارے پیارے
یعنی، ترے آنسوؤں کے تارے

(بانگِ درا:۱۲۹)

ان سب پر تو قناعت کیوں نہیں کرتا آخر

کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل!
قدرت تری ہم نفس ہے اے دل

(بانگِ درا:۱۲۹)

جب قدرت تری ہم نفس ہے پھر بزم غیر کی طرف تو کیوں مائل ہوتا ہے؟

(۲۷)

قصہ ایام سلف

اسلام سے اقبال کو والہانہ تعلق خاطر تھا' اور اسی تعلق خاطر نے انہیں عرب قوم کا بھی دیوانہ کر دیا تھا' وہ جب اور جہاں' عربوں کے آثار ونقوش دیکھتے تھے' تڑپ جاتے تھے' خود روتے تھے' دوسروں کو رلاتے تھے' ان کی چشم تصور کے سامنے' وہ بادیہ نشین قوم آجاتی تھی' جو اسلام قبول کرنے سے پہلے کچھ نہ تھی اور اسلام قبول کرنے کے بعد' ارض وسما کی مالک بن گئی۔ قبل از اسلام اس کی حالت یہ تھی کہ وہ قبائل میں بٹی ہوئی تھی' عادات رذیلہ کی شکار تھی' جوا' شراب' زنا' قتل وغارت' کشت وخون یہ اس کی زندگی کا روزمرہ تھا' لیکن اسلام کے بعد اس کا رنگ ہی کچھ اور ہو گیا۔ وہی قوم' اب ایک خدا کی کلمہ گو بن گئی۔ اپنے بت' اپنے ہاتھوں سے اس نے توڑ دیے اور اس جذبہ توحیدِ الہی کا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کے سوا ہر طاقت وقوت سے وہ بے پروا اور مستغنی ہو گئی۔ اس نے روما کا تختہ الٹ دیا۔ پھر اس کی شہنشاہیت کا صفایا کر دیا' اس نے سمندر کھنگال ڈالے اور دور دراز ملکوں پر اپنی عظمت وشوکت کا پرچم لہرایا' حد یہ ہے کہ وہ یورپ کے حدود میں داخل ہوئی اور یہاں بھی اس نے کئی سو برس تک جاہ وجلال اور دبدبہ کے ساتھ حکومت کی' وہ اندلس (اسپین) میں پہنچی اور وہاں کے لوگوں کو ایک نئی تہذیب سے آشنا کیا' یہ تہذیب ہر اعتبار سے بہتر اور برتر تھی' لوگوں نے جوق درجوق اور فوج درفوج اور موج درموج اسے قبول کیا' اس کے من چلے سورما سسلی (صقلیہ) پہنچے اور اطالیہ کے اس جزیرے پر' جہاں صرف بت پرستی ہوتی تھی' انہوں نے مسجدیں تعمیر کیں' محل بنائے' خانقاہیں تیار کیں اور ایسا نظام حکومت دیا جس نے وہاں کے لوگوں کو امن وسکون کی وہ دولت دے دی جس سے وہ مدّت دراز سے محروم چلے آرہے تھے' جب تک عرب' صقلیہ میں فرماں روا کی حیثیت سے رہے' وہاں امن برستا رہا' وہاں کا معیار زندگی اونچا ہو گیا۔

لیکن زمانہ ہمیشہ ایک حالت پر نہیں رہتا' حالات بدلتے رہتے ہیں' عروج وزوال اور اقبال وادبار کا چکر چلتا رہتا ہے' آج ایک قوم سریر حکمرانی پر متمکن ہے اور دوسری قومیں اس کی غلامی کر رہی ہیں' کل ایسا انقلاب آیا کہ حکمران غلام بن گئے اور حکمرانوں نے غلامی کی زندگی اختیار کر لی' جو مالک تاج ودیہیم تھے' ان کے گلے میں غلامی کی رسی پڑ گئی اور جو ایک در سے دوسرے در تک غلام کے روپ میں پہنچتے اور مشقت کی زندگی بسر کرتے رہتے تھے۔ ان کے سر پر تاج شہریاری زیب دینے لگا' قوموں کی زندگی میں اس طرح کے انقلابات آئے دن آتے ہی رہتے ہیں۔ یہ نہ ہوتو کارخانہ قدرت کی یکسانیت سے لوگ اُب جائیں اور غلط کار قوموں کو قدرت کی طرف سے سزا نہ مل سکے اور نیکوکار قومیں انعام نہ پا سکیں۔ یہی بات قرآن مجید کے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

تلك الايام نداولها بين الناس

اس مفہوم کو ایک شاعر نے یوں ادا کیا ہے:

پردہ داری می کند برقصر کسری عنکبوت
بوم نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

اقبال وادبار اور عروج وزوال کا یہ دور مسلمانوں پر بھی گزرا۔ وہ مسلمان' جو حاکم اور کشور کشائی کی حیثیت سے سسلی (صقلیہ) میں داخل ہوئے تھے اور جنہوں نے عرصہ دراز تک وہاں جاہ وجلال اور حشمت وتمکنت کے ساتھ حکومت کی' اپنی کمزوریوں' سازشوں اور غفلت پرستیوں کے باعث وہاں سے نکال دیے گئے۔

کسی قوم کا آنا اور کسی قوم کا جانا' یہ واقعہ اتنا عبرت انگیز نہیں ہوتا' جتنا یہ واقعہ کہ ایک نئی قوم آئے اور آنے کے بعد جانے والی قوم کے آثار ونقوش کے ساتھ وہ سلوک کرے جو میدان جنگ میں دشمن سپاہی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ مسلمان' باہمی سازشوں' مخالفتوں اور دراندازیوں کے باعث وہاں نہ رہ سکے۔ انہیں رخت سفر باندھنا پڑا اور وہ صقلیہ (سسلی) کے حدود سے نکل کر مغرب رقص میں پناہ گزیں ہونے پر مجبور ہو گئے۔

لیکن تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ان کے جانے کے بعد فاتح قوم نے ان کے

ساتھ ان کی قوم کے ساتھ ان کے آثار ونقوش کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

خود فرنگی مورخین نے اس بات کو شرم وندامت کے ساتھ تسلیم کیا ہے کہ مسلمانوں کے چلے جانے کے بعد فاتح قوم نے بڑا عجیب رویہ اختیار کیا' جسے نہ انسانیت سے کوئی سروکار تھا' نہ شرافت اور معقولیت سے' اس رویہ کو صرف وحشیانہ اور سفاکانہ ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔اس میں درندگی تھی' بہیمیت تھی' اصول اور شرافت کا کہیں نام ونشان بھی نہ تھا۔یہ فرنگی مورخین اس اعتراف جرم کے بعد اپنی فاتح قوم کی جو داستان سناتے ہیں وہ بڑی لرزہ خیز ہے۔وہ مانتے ہیں کہ مسلمانوں کے سسلی سے چلے جانے کے بعد ان کے شاندار محلات کھنڈر بنادیے گئے' وہ محلات جہاں سے ایک نئی اور شاندار تہذیب نمودار ہوئی تھی اور جس نے سارے سسلی کو انسانیت کی لڑی میں پرودیا تھا' شاندار مسجدیں ڈھادی گئیں۔وہ مسجدیں جہاں سے دن میں کم از کم پانچ بار صدائے توحید بلند ہوتی تھی' جہاں مسلمان اس لئے حاضر ہوتے تھے کہ خدائے واحد کے حضور میں سر بہ سجود ہوں اور ان مسلمانوں میں ہر ملت' ہر قوم' ہر رنگ اور ہر نسل کے لوگ موجود تھے اس لئے کہ اسلام دوسرے اقوام عالم کی طرح' ذات پات اور رنگ ونسل کا قائل نہیں تھا۔اس کی مسجد کا دروازہ ہر مسلمان کے لئے کھلا رہتا تھا۔خواہ وہ حبشی ہو یا عرب' ہندی ہو یا ترک' مغربی ہو یا مشرقی' آقا ہو یا غلام' یہ سب آتے تھے اور صف بستہ ہو کر خدائے حی وقیوم کے آستانہ پر سر بہ سجدہ ہو جاتے تھے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود وایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

(بانگِ درا:۱۶۵)

خانقاہیں مسمار کردی گئیں' جہاں وہ لوگ قیام فرماتے' جنہیں دنیا سے دنیا والوں کے ابہام طمطراق اور جاہ وجلال سے دنیا کی دولت وثروت' مقام ومنزلت' منصب اور قیادت' وزارت اور بادشاہت کسی چیز سے سروکار نہ تھا۔ہزار ہا ہزار مسلمان عیسائی بنالئے گئے' یہ وہ مسلمان تھے جنھوں نے ساری زندگی خدائے واحد کی پرستش میں گزاری تھی اور اب حالات سے مجبور ہو کر یہاں رہ رہے تھے' ان کے سامنے دو صورتیں رکھی گئیں' یا عیسائی ہو جائیں ورنہ قتل منظور کریں۔یہ عیسائی بننے پر مجبور ہو گئے' حالانکہ اپنے دور حکومت میں انھوں نے کسی عیسائی' کسی غیر مسلم کو جبراً

مسلمان نہیں بنایا تھا۔ کسی غیر مسلم کے ساتھ غیر روادارانہ برتاؤ نہیں کیا تھا۔ ان کے عہد حکومت میں ہر شخص کو عقیدہ اور خیال کی آزادی حاصل تھی انہی لوگوں نے حکومت کی تلوار ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ یہ آزادی چھین لی اور وہ بھی دوسروں سے نہیں اپنے سابق آقاؤں سے ہزاروں عورتیں جبراً عیسائی بنالی گئیں اور انہیں مجبور کیا گیا کہ اپنے مسلمان شوہروں عزیزوں اور رشتہ داروں کو فراموش کر کے عیسائی کنبہ میں عیسائی شوہروں کی بیویاں بن کر رہیں حالانکہ مسلمانوں کے طویل دور حکومت میں ایسا ایک واقعہ بھی نہیں ہوا تھا کہ کسی غیر مسلم عورت کو مسلمان بننے پر یا مسلمان شوہر کی بیوی بننے پر یا غیر مسلم شوہر سے ترک تعلق کرنے پر مجبور کیا گیا ہو۔ لیکن اب ایسا ہوا اور یہ کرنے والے وہ لوگ تھے جن پر اس طرح کا کوئی حادثہ نہیں گزرا تھا اور جن کے ساتھ یہ زیادتی کی جا رہی تھی یہ وہ لوگ تھے جن کا دامن اپنے دورِ فرماں روائی میں اس دھبہ سے بالکل پاک اور صاف تھا۔

آج سسلی (صقلیہ) میں جایئے وہاں مسلمانوں کے لگائے ہوئے درخت اب بھی ملیں گے جنھوں نے سارے انقلابات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کا بنایا ہوا کوئی محل نظر نہیں آئے گا۔ کوئی مسجد دکھائی نہیں دے گی۔ کوئی خانقاہ کھنڈر کی صورت میں بھی موجود نہیں۔ کوئی حمام آثار قدیمہ کے طور پر بھی دستیاب نہیں ہوسکتا۔ سارے جزیرہ کا چکر کاٹ لیجئے باد در کوچہ و بازار باغ و چمن لب جو اور کنارہ ساحل ہر جگہ پہنچ جایئے خواہ دوربین سے کام لیجئے خواہ خوردبین سے آپ کو سب کچھ نظر آئے گا۔ آپ سبزہ زمردیں کا نظارہ کرسکیں گے۔ آپ گل رعنا کے دیدار سے شاد کام ہوں گے۔ آپ سرو چمن کو دیکھیں گے نسرین و نسترن کا نظارہ کریں گے جس رہ گزر کی جلوہ سامانیاں دیکھیں گے۔ شکوہ حکومت کے مناظر آپ کی آنکھوں کے سامنے سے گزریں گے۔ بڑے بڑے گرجا اور کلیسا آپ ملاحظہ فرمائیں گے اور ان میں سے متعدد وہ ہوں گے جو مسلمانوں کے دور حکومت میں موجود تھے اور مسلمانوں نے جن کی رکھوالی کی تھی۔ ننوں اور پادریوں کی وہ خانقاہیں بھی آپ کے پیش نگاہ ہوں گی جنہیں مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں کبھی نہیں چھوا اور ان پر عقیدہ نہ رکھتے ہوئے بھی ان کے تقدس اور اجلال میں کسی طرح کا فرق نہیں آنے دیا۔

لیکن اس سارے جزیرہ کے طول وعرض میں ایک چیز بھی آپ کو ایسی نہیں نظر آئے گی جو مسلمانوں کے عہد سے تعلق رکھتی ہو' جسے دیکھ کر مسلمان یاد آ جاتے ہوں۔ جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ جب مسلمان یہاں حکمران تھے' یہ اس عہد کی نشانی ہے۔

کتنی عجیب بات ہے' بدنام مسلمان ہیں کہ وہ اپنا مذہب تلوار کے زور سے پھیلاتے رہے ہیں اور درحقیقت یہ کارنامہ عیسائیوں کا ہے۔ عیسائیوں نے بت پرستی کا استقبال تلوار کے زور سے کیا اور اپنا مذہب جبراً روم کی آبادی پر ٹھونسا۔ اسپین میں عیسائی یہودیوں کو جبراً یا عیسائی بنا لیتے تھے یا جلاوطن کر دیتے تھے۔ لیکن حیرت کا مقام ہے کہ عیسائیوں کے یہ سارے غیر فانی کارنامے لکھے مسلمانوں کے نامہ اعمال میں گئے ہیں۔

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

نوجوان اقبال' دیار مغرب کے سفر پر روانہ ہو چکا ہے۔ رات کا وقت ہے۔ سامنے دور' اسے کچھ ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں نظر آتی ہیں' جہاز یہاں رکتا نہیں' ادھر سے گزرتا چلا جاتا ہے۔ اقبال کسی ہم سفر سے دریافت کرتا ہے۔

یہ کون سا مقام ہے؟

ہم سفر جواب دیتا ہے

"سسلی"

ہم سفر یہ کہہ کر جہاز کی دنیائے رنگ و بو میں کھو جاتا ہے' رقص' قہقہہ' بے تکلفی' عشوہ فروشی۔۔۔۔۔۔ اور اقبال' یہ سن کر جہاں بیٹھا تھا بیٹھا رہ جاتا ہے۔ جہاز چل رہا ہے یا ڈوب رہا ہے' یا ساکن ہے' اس کی اسے کوئی پروا نہیں۔ جہاز کے لوگ رقص کر رہے ہیں یا نغمہ سرائی میں مصروف ہیں' اس سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ جہاز کے روشن اور تاریک آباد اور ویران حصوں میں ہجر و وصل کی داستانیں کس طرح دہرائی جا رہی ہیں' اقبال کو اس کی بھی فکر نہیں۔ اس کے وطن میں' اس کے گھر پر کیا ہو رہا ہو گا' اس وقت؟ وہ یہ بھی نہیں سوچتا۔ اس کے وہ دوست جن کے ساتھ اس کے اوقات صبح و شام بسر ہوتے تھے' جہاں کہ وہ فرصت کے لمحات

صرف کرتا تھا‘ اس وقت کس ذہن میں ہوں گے؟ اقبال کا اس طرف خیال ہی نہیں جاتا۔

وہ خاموش بیٹھا ہے

اور اس کی چشمِ تصور اپنا کام کر رہی ہے۔

اس کی نگاہِ تصور کے سامنے وہ دَور ہے جب اس جزیرہ پر اسلام کا پرچم لہراتا تھا، جب عرب یہاں حکمران تھے، جب یہاں کے تہذیب نا آشنا لوگوں کو پہلے پہل تہذیب اور مدنیت سے روشناس کیا گیا تھا، جب یہاں مسجدیں تھیں اور وہاں سے اللہ اکبر کی صدائے دل نواز دن میں پانچ مرتبہ بلند ہوتی تھی، جب یہاں خانقاہیں تھیں اور وہاں ذکر و فکر کے حلقے قائم تھے، جب یہاں عرب طرزِ تعمیر کے حامل شاندار اور پر شکوہ محلات تھے‘ جہاں وقت کی عمران۔۔۔۔ مسلمان قوم دبدہ اور طنطنہ کے ساتھ زندگی بسر کر رہی تھی، جب یہ سمندر جس پر آج یہ جہاز چل رہا ہے فرنگیوں کے تصرّف سے بالاتر تھا یہاں اس قوم۔۔۔۔ مسلمان۔۔۔ کی کشتیاں چلا کرتی تھیں، جہاز دوڑا کرتے تھے اور اس کا سینہ چیر کر منزلِ مقصود تک پہنچا کرتے تھے۔

دُنیا کی یہ قومیں جو آج سر بلند نظر آ رہی ہیں جنھوں نے دُنیا کے بہت بڑے حصہ پر اپنی شہنشاہیت اور قیصریت کا تسلّط قائم کر رکھا ہے‘ جاہل تھیں‘ وحشی تھیں، نیم خواندہ تھیں‘ غیر مہذب تھیں۔ مسلمانوں نے یہاں آ کر علم کی روشنی پھیلائی، تہذیب کا دیا جلایا‘ انسانیت کی شمع روشن کی‘ اخوت اور مساوات کی نعمت عطا کی، اقدارِ انسانی کو روشناس کرایا، توحید کی تبلیغ کی‘ لیکن مذاہبِ غیر کے ماننے والوں پر نہ کسی قسم کی زیادتی کی‘ نہ کسی طرح کا جبر۔ لیکن کیسی عجیب بات ہے مسلمانوں کے زوال پذیر ہوتے ہی اور اقوامِ فرنگ کے برسرِ اقتدار آتے ہی حالات کا نقشہ یکسر بدل گیا۔۔۔ جو عیب تھا وہ صواب بن گیا‘ جو صواب تھا وہ عیب قرار پایا۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا‘ جنوں کا خرد

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

یہ مہذّب قومیں‘ جو اپنی تہذیب و حضارت کا ڈنکا اتنے زور سے پیٹتی ہیں کہ کان کے پردے پھٹ جاتے ہیں ان کا احتساب کیجیے تو معلوم ہوگا ان سے بڑھ کر جابر‘ سفاک اور درندہ خو کوئی نہیں اور وہ مظلوم۔۔۔ مسلمان۔۔۔ قوم جس سے انھوں نے سب کچھ چھینا اور مالدار

بنے ہیں، اپنے دَورِ حکومت میں کتنی صالح، نیک، انسانیت دوست اور انسان نواز تھی۔

جہاز کی چہل پہل جاری ہے

رات گزرتی چلی جارہی ہے لیکن اس مختصری دُنیا میں، جو رونق، جو گہما گمی، جو زندگی، آغازِ شام میں نظر آتی تھی اب اس سے بھی کچھ زیادہ نظر آرہی ہے۔

جہاز سمندر کا سینہ چیرتا آگے بڑھ رہا ہے لیکن شاعر کے خیالات اسے پیچھے، بہت پیچھے کئی سو برس پیچھے لیے جارہے ہیں۔ اس کی نظریں اب تک سسلی کا تعاقب کررہی ہیں۔ آج وہاں کی دُنیا بدلی ہوئی ہے، لوگ بدلے ہوئے ہیں، نسل بدل چکی ہے لیکن اقبال کی آنکھیں آج بھی وہاں تہذیبِ حجازی کے نشانات دیکھ رہی ہیں، اس کی نظروں میں ماضی حال بنا ہوا ہے اور وہ وہاں کے بازاروں اور گلیوں میں اب بھی مسلمانوں کو چلتا پھرتا دیکھ رہا ہے اور آخر ایک ٹھنڈہ سانس لے کر کہتا ہے:

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوں نابہ بار!
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار!

(بانگِ درا:۱۳۳)

اور پھر اس کا یہ نالۂ موزوں، تہذیبِ حجازی کے اس مزار کی ساری تاریخ دہراجاتا ہے اور تاریخ کے اوراق اُلٹنے کے بعد وہ کہتا ہے:

نالہ کش شیراز کا بلبل[1] ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہاں[2] آباد پر

(بانگِ درا:۱۳۴)

آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابنِ بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی (بانگِ درا:۱۳۴)

---

[1] سعدی شیرازی [2] دہلی

غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چھن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

(بانگِ درا:۱۳۴)

اس جہاز پر کون ہے جس سے اقبال اپنا دردِ دل کہیں؟ جسے اپنا ہمراز بنائیں؟ لیکن نہیں ہمراز مل ہی جاتے ہیں۔ اقبال نے خود سسلی کو اپنا ہمراز بنالیا:

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں؟
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیاں
درد اپنا مجھ سے کہہ، میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا، میں اس کارواں کی گرد ہوں

(بانگِ درا:۱۳۴)

فرمائش کرتے ہیں:

رنگ تصویرِ کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصہ ایامِ سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

(بانگِ درا:۱۳۴)

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رُلواؤں گا

(بانگِ درا:۱۳۴)

(۲۸)

دیوانگی

اقبال کو خرد سے وہ تعلق نہیں جو دیوانگی سے ہے۔انہیں خرد میں سو عیب نظر آتے ہیں اور دیوانگی اُن کے نزدیک مجموعۂ اوصاف ہے۔اگر دیوانگی نہ ہوتی تو کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی' کوئی منزل سر نہیں ہوسکتی،کوئی معرکہ جیتا نہیں جاسکتا' خرد تو قدم قدم پر مشکلات پیدا کرتی ہے'روڑے اٹکاتی ہے،اس کا ایں وآں اور چناں وچنیں بنے ہوئے کام کو بگاڑ دیتا ہے۔عقل کا تقاضا یہ ہے کہ پیرہن جہاں جہاں سے دریدہ اور شکستہ ہوگیا ہے اسے رفو کرلیا جائے'سی لیا جائے'لیکن دیوانگی کہتی ہے سرے سے پیرہن کی ضرورت ہی کیا ہے؟ دیوانگی کی یہ ادا اقبال کو اتنی محبوب ہے کہ وہ خدا سے دعا مانگتے ہیں'یااللہ!اس عقل زیاں اندیش کو تھوڑی سی دیوانگی کی نعمت عطا فرمادے تاکہ یہ کام کی بن جائے:

الٰہی عقلِ خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھادے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری، مجھے سرِ پیرہن نہیں ہے

(بانگِ درا:۱۳۵)

سوز محبت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ملا محبت کا سوز مجھ کو، تو بولے صبحِ ازل فرشتے
مثالِ شمعِ مزار ہے تو'تری کوئی انجمن نہیں ہے

(بانگِ درا:۱۳۵)

لیکن یہ وہ باتیں ہیں'جو دوسروں کی سمجھ میں مشکل ہی سے آسکتی ہیں اور اس دُنیا

کے لوگ ان باتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔

یہاں کہاں ہم نفس میسّر، یہ دیس نا آشنا ہے اے دل!
وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیر چرخِ کہن نہیں ہے

(بانگِ درا: ۱۳۶)

مَیں اور تو

میرا نشیمن نہیں درگہِ میرو وزیر
میرا نشیمن بھی تُو، شاخِ نشیمن بھی تُو!
تجھ سے گریباں مرا مطلعِ صبحِ نشور
تجھ سے مرے سینے میں آتشِ اللہ ھُو!
تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ
تُو ہی مری آرزو، تُو ہی مری جستجو!
پاس اگر تُو نہیں شہر ہے ویراں تمام
تُو ہے تو آباد ہیں اجڑے ہوئے کاخ و کُو!
پھر وہ شرابِ کُہن مجھ کو عطا کر، کہ مَیں
ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کے جام و سبُو!
چشمِ کرم ساقیا، دیر سے ہیں منتظر
جلوتیوں کے سبُو خلوتیوں کے کدو!

(بالِ جبریل: ۹۲۔۹۱)

(۲۹)

پیمانِ رنگ و بو

اقبال کی نظر وسیع ہے، دل فراخ ہے، خیالات عمیق ہیں، وہ جو کچھ دیکھتا ہے دوسروں کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی، اس کے دل میں جتنی گنجائش ہے دوسرے اس سے یکسر محروم ہیں، اس کے خیالات جتنے گہرے ہیں، دوسروں کی وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی، لیکن اسے کیا کیا جائے کہ وہ اس دُنیا کا رہنے والا ہے، اس دُنیا کے لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔

باہمیں مردماں بباید ساخت

لہٰذا مجبور ہے کہ جو کچھ دل میں آئے اسے آسان سے زیادہ آسان اور عام فہم الفاظ میں زبان تک لے آئے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی نہ سمجھ سکے، تو اس بت سے خدا سمجھے۔

اقبال کوشش کرتے ہیں کہ خاموش رہیں، دل میں خیالات و جذبات کا جو تلاطم اٹھ رہا ہے اسے روکے رکھیں لیکن کامیاب نہیں ہوتے، طوفان جب مچلتا ہے تو اپنی جگہ نکال ہی لیتا ہے۔ اپنی خاموشی کی توجیہہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اٹھے گا گفتگو کا
مری خموشی نہیں ہے گویا مزار ہے حرفِ آرزو کا

(بانگِ درا: ۱۳۶)

لیکن اس حزار سے "قم باذنی" کہہ کر جب وہ اپنے خیالات کو دعوت نمود دیتے ہیں تو وہ اُبھرتے ہیں اور نمایاں ہو جاتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ کارسازِ عالم سے گلہ کرتے ہیں:

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے! نگار خانہ ہے آرزو کا!

(بانگِ درا: ۱۳۷)

اور اس نگار خانۂ آرزو کا مشاہدہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں؟
نگہ کو نظارے کی تمنا ہے، دل کو سودا ہے جستجو کا

(بانگِ درا: ۱۳۷)

یہ نظارے کی تمنا اور سودائے جستجو، یقیناً کسی کی تلاش میں ہے لیکن کس کی؟ یہ میں بھی نہیں جانتا اور کوئی بتاتا ہی نہیں۔ پھر سوچتے ہیں' یہ تمنا اور جستجو کہیں فریب خوردگی آرزو تو نہیں؟ ڈرتے ڈرتے خدا سے کہتے ہیں:

سپاس شرطِ ادب ہے ورنہ کرم ترا ہے ستم سے بڑھ کر
ذرا سا اک دل دیا ہے، وہ بھی فریب خوردہ ہے آرزو کا

(بانگِ درا: ۱۳۷)

نوائے سحر

کیا عجب! میری نواہائے سحرگاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تری خاک میں ہے!
توڑ ڈالے گی یہی خاک طلسمِ شب و روز
گرچہ اُلجھی ہوئی تقدیر کے پیچاک میں ہے!

(بالِ جبریل: ۶۵)

(۳۰)

آہ شرر فشاں

قوم کی بے بسی اور مجبوری، غفلت اور خود فراموشی، غلامی اور خوئے غلامی، ادبار و انحطاط اور تباہی و بربادی نے اقبال کا دل ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ ان سے یہ حالت نہیں دیکھی جاتی، مگر دیکھتے تھے۔ زندگی کا کون سا شعبہ ایسا تھا، جس میں مسلمان پس رو اور تہی دامن نہ ہوں؟ علم کے میدان میں سب سے پیچھے تھے، تجارت اور کاروبار میں ان کا کوئی حصہ نہیں تھا، دولت و ثروت سے وہ محروم تھے، ایجاد و تخلیق کا مادّہ ان میں نہیں رہا تھا، جدّت اور تعمیر کے جذبہ سے وہ عاری ہو چکے تھے اور ان سب خامیوں پر مستزاد غلامی۔۔۔۔ایک غیر قوم کی غلامی نے ان کے قوائے عمل شل کر دیے تھے، وہ زندہ تھے لیکن مُردوں سے بدتر، نہ اُپج تھی نہ اُمنگ، نہ حوصلہ نہ ولولہ، جو رہزن، رہنما کے بھیس میں سامنے آتا تھا اس کے ساتھ ہو لیتے تھے۔ اس کو کعبۂ مقصود اور قبلۂ آرزو سمجھنے لگتے تھے۔

قوم اگر ادبار زدہ ہوتی ہے، اس کے حالات دگرگوں ہوتے ہیں، اس میں کمزوریاں اور خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو اس میں کچھ ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو اس میں زندگی کی حرارت پیدا کرتے ہیں، جو اسے جوشِ پیکار سے آشنا کرتے ہیں، جو ایثار اور قربانی کا نمونہ پیش کر کے ساری قوم کو ایثار پیشہ بنا دیتے ہیں، اس کی کمزوریوں کو رفع کرتے ہیں، اس کی کوتاہیاں دُور کرتے ہیں، اس کے نقائص کی اصلاح کرتے ہیں، اس میں خود شناسی اور خود فکری کا جوہر

اُجاگر کرتے ہیں اور از منہ رفتہ اسے ایک نا قابلِ تسخیر قوم بنا دیتے ہیں۔

بدقسمتی سے اقبال کی قوم کو یہ بات بھی نہیں حاصل تھی۔ رہنما تھے، لیکن مخلص کم منافق زیادہ۔ رہبروں کی بھی کمی نہیں تھی لیکن اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھنے والے بہت زیادہ تھے اور قوم پر جان دینے والے بہت کم' قائدوں کا پورا گروہ تھا، لیکن وہ لوگ تھے جو قوم قوم پکارتے تھے اور جب چیختے چیختے ان کا گلہ پڑ جاتا تھا اور انہیں کوئی منصب مل جاتا تھا تو قوم کو اس طرح فراموش کر دیتے تھے جیسے جس قوم کو زینہ بنا کر اوپر چڑھے ہیں اس میں اور ان میں کوئی ایکا نہیں' کوئی تعلق نہیں۔ واعظ بھی تھے' لیکن ان کے وعظ و پند کا موضوع صرف تکفیر باہمی تھا۔ علما تھے انہیں آپس میں لڑنے سے فرصت نہیں تھی۔ صوفیا تھے' وہ حال وقال کی مجلسوں میں اپنے اوقات عزیز صرف کرتے تھے' بینکر اور ساہوکار بھی تھے لیکن

دین او آئین او سوداگری است

حکومتِ وقت کا اشارہ ہو تو تھیلیوں کے منہ کھول دیں گے، قوم کو ضرورت ہو تو جیب پر تالہ لگالیں۔

اقبال یہ دلدوز اور جگر فگار منظر دیکھتے تھے اور کڑھتے تھے۔ وہ طرح طرح سے اپنی قوم میں حوصلہ اور امنگیں پیدا کرنا چاہتے تھے' اسے زندگی کی حرارت سے آشنا کرنا چاہتے تھے، لیکن نہ قوم سنتی تھی نہ قوم کے لیڈر اور راہ نما، وہ اپنی قوم کو آزاد کرانا چاہتے تھے، اسے اقوامِ عالم میں سربلند کرنا چاہتے تھے، لیکن نہ قوم کو اس کا احساس تھا' نہ قوم کے ناخداؤں میں یہ جذبہ تھا۔ بارہا ان کے دل میں خیال آیا' تو شۂ عزلت ترک کریں اور میدان میں اتر پڑیں۔ لیکن شاعر ہرگز مردِ میدان نہیں ہوتا' بقول انہی کے وہ قول ہوتا ہے حال دوسروں کو آتا ہے۔ بہر حال جب یہ چبھن ان کے دل میں ہوتی تھی تو وہ پکار اٹھتے تھے:

مَیں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری' نفس مرا شعلہ بار ہوگا

(بانگِ درا: ۱۴۲)

نہیں ہے غیراز نمود کچھ بھی جو مدّعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثالِ شرار ہوگا

(بانگِ درا: ۱۳۲)

آخر میں اپنی کیفیت بتاتے ہیں:

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا، ابھی وہی کیفیت ہے اس کی
کہیں سرِ را گزار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

(بانگِ درا: ۱۳۲)

پانی نہ ملا زمزمِ ملّت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز
یہ ذکر حضورِ شہِ یثربؐ میں نہ کرنا
سمجھیں نہ کہیں ہند کے مسلم مجھے غمّاز
خرما نتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم
دیبا نتواں یافت ازاں پشم کہ رشتیم
(سعدیؒ)

(بانگِ درا: ۲۳۵)

(۳۱)

غمِ ملّت

ایک تو قوم کا غم وہ ہوتا ہے جسے اکبر نے بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے:

قوم کے غم میں ڈنر کھاتا ہے حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

اور ایک غمِ ملّت وہ ہے کہ ہر طرح کی سہولتیں حاصل ہوں، نعمتیں موجود ہوں، آسائشیں مہیا ہوں، لیکن قوم کی برگشتہ بختی اور آشفتہ روزگاری ہر عیش کو مکدّر کر دے۔ اقبال جس غمِ ملّت میں گرفتار تھے وہ اسی قسم کا تھا۔

اگر ان کے سامنے صرف ذاتی سربلندی ہوتی تو واقعی وہ عیش و تنعّم کی زندگی بسر کر سکتے تھے، لیکن وہ ان لوگوں میں تھے جو خود تباہ ہو جانا پسند کرتے ہیں لیکن ملّت اور قوم کی بربادی نہیں دیکھ سکتے۔ ان کے پیشِ نظر اپنی سربلندی نہیں ہوتی، ملّت کی سربلندی ہوتی ہے۔ وہ کبھی اور کسی قیمت پر ملّت کا سودا نہیں کر سکتے۔ ان کی زبانِ حال اور زبانِ عمل پر صرف ایک ہی ترانہ رہتا ہے۔

من و تو گرفتا شدیم چہ باک
خرمن اندر میاں سلامت اوست

زندگی اپنی پوری رعنائیوں اور تابانیوں کے ساتھ ان کے حضور میں موجود تھی۔ ان کے دوستوں اور ساتھیوں میں کوئی ہائی کورٹ کا جج بن رہا تھا، کسی کو القاب وخطاب سے نوازا جا رہا تھا، کوئی وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر تھا، کسی دیائی گورنر نے وزارت کے منصب

پر پہنچا دیا تھا، کوئی برطانوی حکومت کا نمائندہ بن کر لندن میں مقیم تھا، کوئی جنوبی افریقہ میں، کسی کو وائسرائے کی نظرِ عنایت نے کسی ریاست کا وزیر اعظم بنا دیا تھا، کوئی سرکار دولت مدار کی توجہ اور عنایت سے کسی کمیشن کا صدر تھا اور دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹ رہا تھا۔ اقبال کے لیے بھی یہ دروازے کھلے ہوئے تھے لیکن انھوں نے اس طرف کبھی توجہ نہیں کی۔

آنچہ فخر تست آں ننگ من است

وہ غریب تھے، دولت سے محروم تھے، پریشان حال اور آشفتہ روزگار تھے، لیکن مگن تھے، خوش تھے، وہ اپنے اوقات کا ہر لحہ صرف قوم کے لیے وقف کیے ہوئے تھے۔ دوسرے روپیہ پیدا کرتے تھے، قوم کا سودا کر کے قوم کو فروخت کر کے، یہ ملنگ اور قلندر بنے ہوئے تھے، قوم کی صلاح وفلاح اور سود و بہبود کے لیے۔ دوسرے اپنی فرصت کے اوقات کلیسا میں باغ وچمن میں، بزمِ احباب میں، انجمنِ رنداں میں صرف کرتے تھے اور ان کے اوقات کا مصرف صرف یہ تھا کہ قوم کی فلاں گتھی کس طرح سلجھے؟ اور فلاں مصیبت کس طرح دُور ہو؟

دوسروں کا عالم یہ تھا کہ ان کے لیے:

ہے رگِ گل صبح کے اشکوں سے موتی کی لڑی
کوئی سورج کی کرن شبنم میں ہے اُلجھی ہوئی
سینۂ دریا شعاعوں کے لیے گہوارہ ہے
کس قدر پیارا لب جو مہر کا نظارا ہے!
محوِ زینت ہے صنوبر، جوئبار آئینہ ہے
غنچۂ گل کے لیے بادِ بہار آئینہ ہے
نعرہ زن رہتی ہے مستور کوئل باغ کے کاشانہ میں
چشمِ انسان سے نہاں پتوں کے عزلت خانہ میں
اور بلبل مطربِ رنگیں نوائے گلستاں
جس کے دم سے زندہ ہے تو یا ہوائے گلستاں
عشق کے ہنگاموں کی اُڑتی ہوئی تصویر ہے
خامۂ قدرت کی کیسی شوخ یہ تحریر ہے (بانگِ درا:۱۵۲)

ان روح افزا اور دل آرا مناظر کا قدرتی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ:

باغ میں خاموش جلسے گلستاں زادوں کے ہیں
وادیٔ کہسار میں نعرے شباں زادوں کے ہیں

(بانگِ درا:۱۵۳)

لیکن اقبال کا دل ان باتوں میں نہیں لگتا۔ وہ کسی اور دُنیا کے رہنے والے ہیں' ان کی دلچسپی کی چیزیں کچھ اور ہیں' فرماتے ہیں:

شورشِ بزمِ طرب کیا ! عود کی تقریر کیا!
دردمندانِ جہاں کا نالۂ شب گیر کیا!
عرصۂ پیکار میں ہنگامۂ شمشیر کیا!
خون کو گرمانے والا نعرۂ تکبیر کیا!
اب کوئی آواز سوتوں کو جگا سکتی نہیں
سینۂ ویراں میں جانِ رفتہ آ سکتی نہیں

(بانگِ درا:۱۵۰)

وہ دیکھتے ہیں اور بہ چشمِ پرنم:

پتیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح
دستِ طفلِ خفتہ سے رنگیں کھلونے جس طرح

(بانگِ درا:۱۵۳)

دُنیا کی اس بے ثباتی اور موت کی اس ارزانی کے بعد ان کا جی کسی کام میں نہیں لگتا۔ انہیں صرف ایک ہی فکر ہے اور وہ فکر ہے قوم کی:

اس نشاط آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے
ایک غم ــــ یعنی غمِ ملت ہمیشہ تازہ ہے

(بانگِ درا:۱۵۳)

(۳۲)

ٹوٹ گیا سازِ چمن

شکوہ۔۔۔ اقبال کی غیر فانی اور معرکہ آرا نظموں میں ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ بچہ بچہ کی زبان پر اقبال کا شکوہ تھا۔ مکتبوں میں، مدرسوں میں، خانقاہوں میں، دانش کدوں میں، علماء کے حلقوں میں، صوفی کے زاویوں میں اقبال کا شکوہ وردِ زبان تھا اور بات بھی یہی تھی:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

(بانگِ درا:۱۹۹)

ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرعہ سے خلوص ٹپک رہا تھا، جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ الفاظ کا دبدبہ منہ سے بولتا تھا۔ اس شکوہ میں اقبال نے امّتِ مرحومہ کا حالِ زار بڑی تفصیل اور بڑی خوبی سے بیان کیا ہے اور خدا سے شکایت کی ہے کہ اس نے مسلمانوں کو کیوں فراموش کر دیا ہے، حالانکہ مسلمان اب بھی مسلمان ہی ہیں:

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں!
زندگی مثلِ بلالِ حبشیؓ رکھتے ہیں!

(بانگِ درا:۱۶۸)

حد یہ ہے کہ یہاں تک کہہ گئے:

عشق کی خیر، وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی
جادہ پیمائی تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی
اور پابندیٔ آئینِ وفا بھی نہ سہی

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے!

(بانگِ درا: ۱۶۸)

جوشِ کلام اور روانیِ سخن میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا گیا ہے، کلام کی حدت اور تیزی بھی بڑھتی گئی ہے۔ فرماتے ہیں:

کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دُنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب
تو جو چاہے تو اُٹھے سینۂ صحرا سے حباب
رہروِ دشت ہو سیلی زدہ موجِ سراب
طعنِ اغیار ہے رُسوائی ہے، ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے؟

(بانگِ درا: ۱۶۷)

مسلمانوں کی زبوں حالی اور نامسلموں کی کامرانی سے اقبال بہت دل برداشتہ ہیں۔ یار باراللہ میاں کو اسی طرف متوجہ کرتے ہیں:

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جو بیٹھے
سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کوکو بیٹھے
دُور ہنگامۂ گلزار سے یک سو بیٹھے
تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ ہو بیٹھے!
اپنے پروانوں کو پھر ذوقِ خود افروزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

غرض بارگاہِ الٰہی میں شکوہ سے فارغ ہو کر اقبال اپنی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اپنے ذہن و دماغ اور قلب و نظر کی کیفیت بتاتے ہیں اور کوئی شبہ نہیں ان الفاظ میں ان کی روح سمٹ آئی ہے اور وہ اپنے تاثرات دل و دماغ کی تصویر کھینچنے میں پورے طور سے کامیاب ہوئے ہیں:

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن
عہدِ گل ختم ہوا ، ٹوٹ گیا سازِ چمن
اُڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن
ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینہ میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

(بانگِ درا: ۱۷۰۔۱۶۹)

ظاہر ہے بلبل سے مراد خود شاعر۔۔۔اقبال۔۔۔کا نالۂ سحر ہاں ہے۔

قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں
پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں
وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں
ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں
قیدِ موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی!

(بانگِ درا: ۱۷۰)

اقبال کو اپنی قوم اور اپنی ملت سے سب سے بڑی شکایت یہی تھی کہ کوئی اس کی فریاد سمجھنے والا نہیں تھا:

لطف مرنے میں ہے باقی نہ مزا جینے میں
کچھ مزا ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں!
کتنے بیتاب ہیں جوہر مرے آئینہ میں
کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینہ میں!
اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینہ میں رکھتے ہوں وہ لالے ہی نہیں (بانگِ درا: ۱۷۰)

اور آخر میں تو انھوں نے جو کچھ کہا ہے اسے رُوح کی زبان سے تو لیے۔

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں
جاگنے والے اس بانگِ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں
پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں
عجمی خُم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری

(بانگِ درا:۱۷۰)

پیامِ عشق

سن اے طلبگارِ دردِ پہلو! میں ناز ہوں تو نیاز ہوجا
میں غزنوی سومناتِ دل کا ہوں تُو سراپا ایاز ہوجا
نہیں ہے وابستہ زیرِ گردوں کمالِ شانِ سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہوجا
غرض ہے پیکارِ زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا
جہاں کا فرضِ قدیم ہے تو، ادا مثالِ نماز ہوجا
نہ ہو قناعت شعار گلچیں، اسی سے قائم ہے شان تیری
وفورِ گل ہے اگر چمن میں، تو اور دامن دراز ہوجا
گئے وہ ایام، اب زمانہ نہیں ہے صحرا نوردیوں کا
جہاں میں مانندِ شمعِ سوزاں میانِ محفل گداز ہوجا

(بانگِ درا:۱۳۰۔۱۲۹)

(۴۳)

بڑی دُور ہے منزل میری

رات اسی لیے آتی ہے کہ آرام کیا جائے، دن کی شورشیں اور ہنگامہ آرائیاں، رات کے نمودار ہوتے ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ دن دعوتِ رزم و پیکار ہے اور رات، دعوتِ سکوت و سکون، امیر ہو یا غریب، بادشاہ ہو یا گدا، سرمایہ دار ہو یا مزدور، کوئی بھی رات بھر نہیں جاگتا۔ دن کی کلفتوں کو رات کے آرام سے دُور کرتا ہے۔۔۔لیکن نہیں، ایک شاعر ہے جسے رات کو بھی قرار نہیں، دوسرے سوتے ہیں وہ جاگتا ہے، خلقت آرام کرتی ہے وہ کروٹیں بدلتا ہے۔ دُنیا نفیر خواب بلند کرتی ہے وہ نالۂ شب گیر میں مصروف ہو جاتا ہے۔۔۔۔آخر کیوں؟

خود رات یہ منظر دیکھتی ہے تو پریشان ہو جاتی ہے۔ ایک طرف وہ یہ دیکھتی ہے اس کا دامن ساری خلقت کے لیے، عام اس کے کہ وہ انسان ہو یا جانور، چرند ہو یا پرند، درندہ ہو یا پانی میں تیرنے والی مچھلی، پیامِ امن و خواب ہے۔ لیکن ایک شاعر ہے جو اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ وہ دن میں مغموم و پریشان تو رہتا ہی ہے، لیکن رات کے آتے ہی اس کی خلش کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔ اس کے اضطراب میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا ہے، اس کی بے قراری، بے کلی کچھ عجیب رنگ اختیار کر لیتی ہے۔

آخر رات سے ضبط نہیں ہو سکتا۔ وہ شاعر کے دروازے پر دستک دیتی ہے وہ با حالِ مضطر پا سوئے پریشان برآمد ہوتا ہے اور دریافت کرتا ہے تو نے مجھے کیوں بلایا ہے؟

رات پوچھتی ہے:

تو سوتا کیوں نہیں، ساری دُنیا میرے نمودار ہوتے ہی مست خواب خرگوش ہو جاتی

ہے ایک تو یہ ہے کہ میرے آتے ہی تیری بے کلی اور بےقراری اور زیادہ بڑھ جاتی ہے' میری چاندنی جب کھیت کرتی ہے تو اِدھر اُدھر پیکر اضطراب بنا ہوا گھومنے لگتا ہے' لیکن

خاموش صورتِ گُل' مانندِ بُو پریشاں

(بانگِ درا:۱۷۲)

میں پوچھتی ہوں ایسا کیوں ہوتا ہے' کیا تو خود اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتا' یہ وہ وقت ہے کہ

دریا کی تہہ میں چشمِ گرداب سوگئی ہے
ساحل سے لگ کے موجِ بیتاب سوگئی ہے

(بانگِ درا:۱۷۲)

پھر آخر' تیری آنکھیں نیند سے کیوں محروم ہیں؟ کیا تو گرداب سے زیادہ آشفتہ اور موجِ بیتاب سے زیادہ پریشان ہے؟ موج کی سرشت بےقراری ہے' گرداب کی فطرت' اضطراب ہے کیا تو اپنی بےقراری اور اضطراب میں موج اور گرداب سے بھی بڑھا ہوا ہے؟ شاعر خاموشی کے ساتھ' لیلائے شب کی یہ باتیں سنتا ہے۔ اسے افسوس ہے کہ جسے سب سے زیادہ میرا رازداں ہونا چاہیے تھا وہی سب سے زیادہ میرے حالات سے ناواقف اور لاعلم ہے۔ ایک آہ سرد کے ساتھ وہ رات کو مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے:

میں ترے چاند کی کھیتی میں گہر بوتا ہوں
چھپ کے انسانوں سے مانندِ سحر روتا ہوں

(بانگِ درا:۱۷۳)

صبح کو اٹھ کر لوگ' پھولوں پر' کلیوں پر' شاخ گل پر یہ شبنم کے قطرے جو دیکھتے ہیں' یہ کیا ہیں۔ یہ صبح کے آنسو ہیں' جو رات کی حکومت میں اس کی آنکھوں سے ٹپکتے ہیں۔ میں بھی اس کی پیروی کرتا ہوں اور تو جب نمودار ہوتی ہے تو اپنا فریضہ پورا کرتا ہوں۔

دن کی شورش میں نکلتے ہوئے شرماتے ہیں
عزلتِ شب میں مرے اشک ٹپک جاتے ہیں

(بانگِ درا:۱۷۳)

اس دُنیا میں کوئی میرا محرم نہیں ہمراز نہیں رفیق و دمساز نہیں میری غیرت اسے گوارا نہیں کرتی کہ ایسے لوگوں کے سامنے یہ موتی ـــــ قطراتِ اشک ـــــ بکھیروں جوان کی قدر و قیمت سے ناواقف ہیں۔ رات کو جب یہ دُنیا کے بندے اور غرض کے پُتلے درد سے ناآشنا اور سوز سے محروم لوگ سو جاتے ہیں لمبی تان کر تو میں اپنا کام کرتا ہوں۔ تیری چاندنی کے کھیت میں موتی بوتا ہوں:

مجھ میں فریاد جو پنہاں ہے سناؤں کس کو؟
تپشِ شوق کا نظارہ دکھاؤں کس کو؟

(بانگِ درا:۱۷۳)

یہ دُنیا سننے والوں اور دیکھنے والوں سے بھری ہوئی ہے مگر نہ یہاں کوئی ایسا ہے جو میری تپشِ شوق کو دیکھ سکے نہ ایسا ہے جو میری آہ و فریاد کا راز داں ہو۔

برق ایمن مرے سینہ پہ پڑی روتی ہے
دیکھنے والی ہے جو آنکھ، کہاں سوتی ہے؟

(بانگِ درا:۱۷۳)

میرا سینہ برق ایمن کی تجلیات کا گہوارہ ہے۔ جو آنکھ تجلی کا نظارہ کر چکی ہو نہ اسے نیند آ سکتی ہے نہ وہ سو سکتی ہے۔

صفتِ شمعِ لحد مُردہ ہے محفل میری
آہ! اے رات بڑی دُور ہے منزل میری

(بانگِ درا:۱۷۳)

شمعِ لحد جلتی ہے، پگھلتی ہے ختم ہو جاتی ہے۔ نہ اسے بادِ صرصر کی پروا ہوتی ہے نہ نسیمِ سحر کی، نہ اسے بزم و انجمن کی شورشوں سے واسطہ ہوتا ہے نہ بت کدہ اور مے خانہ کی رونق سے، نہ وہ زاہد پیر کلیسا اور برہمن کے کاشانہ میں پہنچ پاتی ہے، نہ کسی بُتِ پُرفن، کسی محبوب طرار و گلعذار اور پری رخسار کے بالا خانہ میں اس کا گذر ہوتا ہے، وہ شمعِ لحد ہوتی ہے

صرف شمعِ لحد ـــــ!

اور شمعِ لحد کی تپش کا نظارہ دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا اس کی فریاد پنہاں سننے والا ہی

کوئی نہیں ہوتا۔ یہی حال میرا ہے۔۔۔ شمع لحد کی طرح میری محفل بھی ویران ہے۔ سنسان ہے' خاموش ہے' نہ اس میں شورِ ہاؤ ہُو ہے۔ نہ شور کر نوشانوش اور میں ان سب سے بے نیاز بھی ہوں' میری منزل بہت دُور ہے اور اسی خاموشی کے ساتھ کہ مجھے اس کی طرف بڑھنا ہے' جانا ہے' پہنچنا ہے۔

ضبطِ پیغامِ محبت سے جو گھبراتا ہوں
تیرے تابندہ ستاروں کو سناجاتا ہوں

(بانگِ درا:۱۷۳)

ابھی میں نے کہا تھا' میرا کوئی ہمراز نہیں' میرا کوئی محرمِ اسرار نہیں اور یہ سچ ہی تھا' غلط نہ تھا۔ لیکن ایک بات میں بھول گیا۔ یہ تارے جو میری طرح

خاموش صورتِ گل' مانندِ بُو پریشاں

نظر آتے ہیں' جن کی آواز پاتک نہیں سنائی دیتی اور جو اپنی دُور دراز منزل کی طرف رواں دواں ہیں' یہ میرے دوست ہیں' محرمِ اسرار ہیں' ہمراز داں ہیں' یہ بھی دن کو روپوش رہتے ہیں' رات کو نمودار ہوتے ہیں اور میں جب بہت زیادہ محبت سے گھبرا جاتا ہوں تو ان کی محفل میں پہنچتا ہوں اور اپنا افسانہ انہیں سنا جاتا ہوں۔

کشاکش

سفینہ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ دریا سے پار ہوگا
چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا
جو ایک تھا اے نگاہ! تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا
یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہو گا؟ (بانگِ درا:۱۳۱)

(۳۴)

مقامِ محمود

ذاتی سر بلندی کی خاطر قوم و ملت کو ٹھکرا دینا' اپنی ذات پر قوم کو ترجیح نہ دینا' اپنے مفاد کے سامنے ملی مفاد کو خاطر میں نہ لانا' پیشہ ور لیڈروں کی آج بھی سرشت ہے اور جب انگریز اس دیس کے حکمران تھے' تب تو یہ جذبہ اوجِ کمال پر پہنچا ہوا تھا' جس سے ڈپٹی کمشنر خوش وہ لیڈر، جس سے گورنر خوش وہ لیڈروں کا لیڈر' جس سے وائسرائے بہادر راضی' وہ سارے ملک اور ساری قوم کا ناخدا' عراق میں' انگریز فوجیں مسلمانوں کو پامال کریں' گولہ باری کریں' مسلمانوں کو تباہ و برباد کریں' لیڈر خوش ہے اور سرکار ابد قرار کو دعائیں دے رہا ہے' ایران کو' برطانیہ کی استعماری فوجیں پامال کریں، وہاں کے عوام کے سر و سینہ کو اپنے نیزوں سے چھید ڈالیں' وہاں کے خواص کو دار و رسن سے آشنا کریں، اس کے جس حصہ پر چاہیں اپنا اقتدار اور تسلط قائم کر لیں، لیڈر اس پر شادمانی کے شادیانے بجا رہا ہے' ترکیہ' جو اس زمانہ میں خلافت اسلامیہ کا پایہ تخت تھا اور از روئے مذہب جو مسلمانوں کے نزدیک ایک محبوب اور مقدس ملک کی حیثیت اختیار کر چکا تھا' فرنگی سامراج کے ہتھیاروں سے مجروح ہو' وہاں کی بندرگاہوں پر' شہروں پر' عمارتوں پر' برطانوی پرچم لہرایا جائے، وہاں کے لوگوں کی آزادی چھین لی جائے، وہاں کا نظام بدل دیا جائے اور وہاں وہ نظام مسلط کر دیا جائے جس سے مسلمانوں کو' اسلام کو' مسلمانوں کے ملی مزاج کو کوئی سروکار نہیں' تو بھی لیڈر خوش ہے اور سرکار کو کامیابی اور کامرانی کی دعائیں دے رہا ہے۔ ترکیہ کے خلاف اگر انگریز اعلانِ جنگ کر دیں اور میدانِ جنگ میں اپنی کثرتِ سپاہ اور کثرتِ آلات و اسلحہ سے اسے مغلوب اور تباہ و برباد کرنا شروع کر دیں' تو یہ لیڈر اور زیادہ خوش ہے' اپنے دیس سے' اپنے وطن سے' اپنے شہر سے' اپنے دیہات سے مسلمان'

سپاہیوں کی سستی قیمت پر بھرتی کر کے میدانِ جنگ کی طرف روانہ کر رہا ہے کہ جاؤ مسلمانو' اپنے خلیفۃ المسلمین کا تختہ اُلٹ دو' اپنے مسلمان بھائیوں کے گلے کاٹو' اپنی قوم اور ملّت کے جذبۂ حریت کو پاؤں تلے روند دو اور پورے طور پر پامال کر دو۔

انگریز اپنے مفاد اور مصالح کے پیشِ نظر قبضہ کرنا ضروری سمجھیں اور قوت و طاقت کے بل پر قبضہ کر ہی لیں' وہاں کے مسلمانوں کو پھانسیاں دیں' حریت طلب لوگوں کی گردن کاٹیں، آزادی خواہوں کو جیل میں ٹھونس دیں' بادشاہ کو شاہِ شطرنج بنا دیں' تو یہ لیڈر خوش اور بہت خوش ہیں۔ اپنی طرف سے سپاہیوں کا نذرانہ پیش کر رہا ہے۔ حجاز مقدس میں آ کر انگریز سازشیں کریں اور وہاں خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا کر دیں، ایک کا ساتھ دیں، ایک کو لڑائیں تو اس لیڈر کے گھر میں گھی کے چراغ جل رہے ہیں اور فرطِ مسرت سے اس کے بند قبا ٹوٹے جا رہے ہیں' شام' لبنان' شرق اُردن اور دوسرے مقامات پر اگر فرنگی۔۔۔۔ کاریاں رنگ لائیں، مسلمانوں کے مفادات مجروح ہوں، ان کی آزادی چھینی جائے، انہیں غلام بننے پر مجبور کیا جائے تو یہ لیڈر نہایت سعادت مندی کے ساتھ تائیدِ سرکار کے لیے موجود۔ اس کی فوج بھی ہے اور زرِ نقد کی سپاہ بھی' جس کا جس طرح جی چاہے مقابلہ کر لے۔

سوڈان میں اگر کوئی مہدی پیدا ہوا اور وہ برطانوی استعمار کے خلاف صف آراء ہو کر میدانِ جہاد میں اترے اور بڑی حد تک انگریزوں کو قلع قمع کر دے اور انگریز پھر کر میدان میں اتر آئیں' اور نہایت سفاکی اور درندگی' بہیمیت اور شقاوت کے ساتھ حریت پرستوں کو کچلیں' ماریں' قتل کریں' عورتوں کی بے آبروئی کریں' بچوں پر رحم نہ کریں، بوڑھوں کو شکنجہ تعزیز میں کسیں، حتیٰ کہ مہدی کو دیوانہ مشہور کر دیں اور اس دیوانہ سے انتقام اس طرح لیں کہ جب سوڈانی بالکل کچل دیے جائیں اور وہاں پورے طور پر انگریزی تسلط قائم ہو جائے تو اس کی قبر کھودیں اور ہڈیاں نکال کر ان سے انتقام لیں تو یہ لیڈر مسکرا مسکرا کر ہنس ہنس کر یہ منظر دیکھے گا اور خوش ہو ہو کر اپنی سرکار کی بلائیں لے گا اور ہانکے پکارے کہے گا:

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

اوران سب باتوں سے قطع نظر خود اس کے دیس --- پاک و ہند --- میں انگریز درندگی اور سفاکی پر اتر آئیں، والیان ریاست کی ریاست ضبط کرلیں، تعلقہ داروں کے تعلقے چھین لیں، حریت پرستوں کو پھانسی پر لٹکادیں اور جیل بھیج دیں، رضا کاروں کو کوڑے لگوائیں اور رُوح فرسا اذیتوں میں مبتلا کردیں، عورتوں اور بچوں تک پر رحم نہ کریں، انہیں اسیر زنداں کریں، ان پر بھی ظلم توڑیں، انہیں بھی عبرت ناک سزا دیں، بوڑھوں کے بڑھاپے کا خیال نہ کریں، ان سے پوری پوری مشقت لیں، وہ لوگ جو خاندانی اعتبار سے، خواہ کتنے ہی اونچے ہوں، ان کا پایۂ علم خواہ کتنا ہی بلند ہو، خواہ یہ انگریزی، انگریزوں سے زیادہ فصیح و بلیغ بولتے ہوں، خواہ یہ آئی سی ایس کا امتحان شاندار طور پر پاس کر چکے ہوں، خواہ قوم کی نظر میں ان کے ایثار و قربانی کی کتنی ہی قدر ہو، خواہ قوم انہیں کتنی ہی عزیز و محبوب رکھتی ہو، لیکن انگریز انہیں ستائے، پریشان کرے، ان کی جائیدادیں نیلام کردے، ان کے گھر ضبط کرے، ان کے کھیت چھین لے، ان کے بنک بیلنس کو سربہ مہر کردے، انہیں پھانسی دے، جیل بھیجے اور جیل میں ان کے ساتھ وہ برتاؤ کرے جو خونیوں اور ڈاکوؤں کے ساتھ کیا جاتا ہے، ان سے وہ مشقت لے جو ڈاکوؤں اور لٹیروں سے بھی نہیں لی جاتی --- تو بھی یہ لیڈر رہے، ان حریّت پرستوں کو گالیاں دینے میں پیش پیش، اس ظلم کا مظاہرہ کرنے والے انگریزوں کی تائید میں سب سے آگے، خواہ اس کا گلا پھٹ جائے، سینہ کی کڑیاں ٹوٹ جائیں، رگیں ٹکڑے ہوجائیں، لیکن یہ اپنے آقا --- انگریز --- کی تائید و حمایت میں سب کچھ کہنے اور سب کچھ کرنے کو تیار۔

یہ تھی وہ فضا، جب اقبال نے زندگی کے میدان میں قدم رکھا۔

ایک ناصح اقبال کو دیکھ کر حیرت کرتا ہے کہ اس شخص میں وہ ساری صلاحیتیں موجود ہیں، یہ بیرسٹری اور شاعری چھوڑ کر لیڈری کیوں نہیں کرتا؟ چنانچہ وہ اعتراف کرتا ہے:

میں نے اقبال سے ازراہِ نصیحت یہ کہا

عاملِ روزہ ہے تو ، اور نہ پابندِ نماز (بانگِ درا:۱۷۶)

تُو بھی ہے شیوۂ اربابِ ریا میں کامل

دل میں لندن کی ہوس، لب پہ ترے ذکرِ حجاز

جھوٹ بھی مصلحت آمیز ترا ہوتا ہے
تیرا اندازِ تملق بھی سراپا اعجاز
ختم تقریر تیری مدحتِ سرکار پہ ہے
فکرِ روشن ہے ترا موجدِ آئینِ نیاز
درِ حکام بھی ہے تجھ کو مقامِ محمود
پالسی بھی تری پیچیدہ تر از زلفِ ایاز
اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے
پردۂ خدمتِ دیں میں ہوسِ جاہ کا راز
جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے، وہ ہیں تجھ میں سبھی
تجھ کو لازم ہے کہ ہو اٹھ کے شریکِ تگ و تاز
غمِ صیاد نہیں، اور پر و بال بھی ہیں
پھر سبب کیا ہے، نہیں تجھ کو دماغِ پرواز

(بانگِ درا: ۱۷۷-۱۷۶)

اور یہ سب کچھ سنا کر پھر اسے اُکساتا ہے:

"عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشان است
حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز" (بانگِ درا: ۱۷۷-۱۷۶)

ہم نے پوری نظم نہیں درج کی ہے، چند اشعار پیش کیے ہیں، لیکن ان چند شعروں میں بھی اقبال نے جس طرح کوزے میں دریا کو بند کیا ہے اور اپنے اوپر ڈھال کر جس طرح وقت کے خود پرست لیڈر کا سراپا کھینچا ہے، وہ اقبال کے ذہن ورسا کا کمال ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انسانی قوت نطق و کلام کا اعجاز ہے۔

دیدۂ خونبار

خود تجلی کو تمنا جن کے نظاروں کی تھی
وہ نگاہیں ناامیدِ نورِ ایمن ہوگئیں
اُڑتی پھرتی تھیں ہزاروں بلبلیں گلزار میں
دل میں کیا آئی کہ پابندِ نشیمن ہوگئیں؟
وسعتِ گردوں میں تھی ان کی تڑپ نظارہ سوز
بجلیاں آسودۂ دامانِ خرمن ہوگئیں
دیدۂ خونبار ہو منت کشِ گلزار کیوں؟
اشکِ پیہم سے نگاہیں گل بدامن ہوگئیں

(بانگِ درا:۱۸۸)

(۳۵)

شمع وشاعر

شاعر پر مختلف واردات اور کیفیات طاری ہوتے ہیں اوران کا وہ فاش و برملا اظہار بھی کرتا رہتا ہے۔شمع وشاعر میں بڑی دیرینہ مناسبت ہے،وہ بھی جلتی ہے،یہ بھی جلتا ہے،اس کی سرشت بھی سوز وگداز ہے،اس کی فطرت بھی یہی ہے،وہ بھی اس سے مستغنی اور صلہ سے بے پرواہے،یہی حال اس کا بھی ہے،اسے بھی دوسروں کا غم ہے اور یہ بھی اپنے غم سے سروکار نہیں رکھتا،دوسروں کے۔۔۔قوم کے غم میں جاں بلب رہتا ہے۔

لیکن اس یکسانیت اور مناسبت کے باوجود دونوں میں ایک بہت بڑا فرق بھی ہے۔شمع پر نثار ہونے اس کے غم کی داد دینے اور اس کے سوز وتپش پر مرحبا کہنے کے لیے پروانوں کا جم غفیر موجود ہے۔لیکن شاعر کے غم اور سوز وتپش پر مرحبا کہنے والا کوئی نہیں اس کے غم کی داد پروانے تک نہیں دیتے۔۔۔آخر یہ فرق کیوں ہے؟

ایک روز اسی موضوع پر شمع وشاعر میں بحث وگفتگو شروع ہو جاتی ہے۔دونوں بڑی بے مروتی اور بڑی صفائی سے اپنے اپنے تأثرات کا اظہار کرتے ہیں بلکہ یوں کہیے خوب کھری کھری سناتے ہیں۔اس بحث وگفتگو کی آواز کہیں مدّھم ہے کہیں پُرزور اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں اقبال کی شخصیت اور شخصیت سے زیادہ رُوح بہرحال نمایاں ہے۔

اقبال شمع پیکر حیرت بن کر پوچھتے ہیں:

دوش می گفتم بہ شمع منزلِ ویران خویش
گیسوئے تو از پر پروانہ دارد شانہ

میں نے اپنے ویران گھر کی شمع سوزاں سے کہا تیرے گیسواور زلف کی کنگھی پروانوں کے پر بنے ہوئے ہیں۔

درجہاں مثلِ چراغ لالۂ صحرا ستم
نے نصیبِ محفلے' نے قسمتِ کاشانہ

میرا حال یہ ہے کہ میں بھی تیری طرح سوز وگداز کا پتلا ہوں' جلتا ہوں اور پگھلتا رہتا ہوں، لیکن میری مثال'لالۂ صحرا کے چراغ کی سی ہے' جس کے نصیب میں نہ محفل آتی ہے نہ کوئی کاشانہ:

مدتے مانند تومن ہم نفس می سوختم
درطواف شعلہ ام بالے نہ زد پروانہ

تیرے لیے میں بھی مدتوں جلتا اور پگھلتا رہا' سوختہ ہوتا رہا لیکن میرے شعلہ کا طواف کرنے کے لیے ایک پروانہ بھی نہیں آیا۔

می طپید صد جلوہ درجان امل فرسودہ من
برنمی خیزد ازیں محفل دل دیوانہ

میرئی جان ناتواں کے اندر بھی صدہا جلوے مچل رہے ہیں لیکن اس محفل سے کیا بات ہے کوئی دل دیوانہ نہیں اٹھتا؟

ازکجا ایں آتش عالم فروز اندوختی
کرمک بے مایہ را سوز کلیم آموختی؟

آخر یہ آتش عالم افروز تو نے کس طرح اور کہاں سے حاصل کی ہے؟

یہ بات تیرے اندر کیسے پیدا ہوگئی کہ تو نے ایک حقیر کیڑے۔۔۔ پروانہ۔۔۔ کوسوزِ کلیم بخش دیا؟

اب ذرا غور کیجیے' ان باتوں کا جواب شمع کیا دیتی ہے؟۔۔۔ وہ شاعر کی یہ باتیں توجہ اور التفات سے سنتی ہے اور مسکراتی رہتی ہے۔ پھر جواب دیتی ہے' جواب کیا دیتی ہے' چٹکیاں لیتی ہے' نشتر چبھوتی ہے' دل پر وار کرتی ہے۔۔۔ کہتی ہے:

میں تو جلتی ہوں کہ مضمر ہے مری فطرت میں سوز
تو فروزاں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا

(بانگِ درا:۱۸۴)

کتنا بڑا فرق ہے‘ مجھ میں اور تجھ میں‘ میں اس لیے جلتی ہوں کہ میری سرشت اور فطرت ہی سراپا سوز ہے اور تو اس لیے فروزاں بنتا ہے کہ پروانے تیرے گرد آئیں‘ تیرا طواف کریں اور جان دے دیں۔۔۔۔میں ایثار ہوں تو پروپیگنڈا

گریہ ساماں مَیں، کہ میرے دل میں ہے طوفانِ اشک
شبنم افشاں تو ، کہ بزم گل میں ہو چرچا ترا

(بانگِ درا:۱۸۴)

میں اس لیے روتی ہوں کہ میرے دل میں آنسوؤں کا طوفان مچل رہا ہے اور وہ قطرہ قطرہ بن کر میری آنکھوں سے ٹپکتا ہے۔تو اس لیے شبنم افشاں ہے‘ یعنی قطرات شبنم کی طرح اپنے آنسوؤں کے قطرے ٹپکاتا ہے کہ محفلِ گل۔۔۔محفلِ عالم۔۔۔میں تیرا چرچا ہو‘ لوگ کہیں کہ ہاں‘ واقعی یہ شاعر کیسا دردمند ہے کہ اس کی آنکھوں سے ہر وقت جوئے اشک بہتی رہتی ہے۔ ہر وقت اس کا خونِ جگر‘ اشک سحر گاہی کی صورت منتقل ہوتا رہتا ہے۔۔۔کاش تیرے دل میں یہ تمنا نہ ہوتی کہ بزمِ گل میں تیرا چرچا ہو‘ اس آرزو سے تو بے نیاز ہوتا‘ لیکن تیرا دل طوفانِ اشک کا مرکز ہوتا‘ پھر تیرا چرچا بھی ہوتا اور یہ قطراتِ اشک کچھ قدر و قیمت بھی رکھتے۔

گل بدامن ہے مری شب کے لہو سے میری صبح
ہے ترے امروز سے ناآشنا فردا ترا

(بانگِ درا:۱۸۴)

میرا حال تو یہ ہے کہ میرا خونِ جگر بے اثر نہیں رہ سکتا۔اس لیے کہ اس کی بنیاد چنانچہ دیکھ لے‘ میری صبح‘ میرے اشک شبینہ سے گل بدامن ہو رہی ہے۔یعنی میری رات اور میرے دن میں ایک ربط قائم ہے‘ رات کو روتی ہوں اور دن کو میرے آنسو نمایاں ہوتے ہیں

اور تیری یہ کیفیت ہے کہ تیرا کل' تیرے آج سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا' دونوں میں بیر ہے۔ اس تضاد کے باوجود میں اور تو ایک کیسے ہو سکتے ہیں؟ ہمارے کیفیات میں اشتراک کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟

یوں تو روشن ہے، مگر سوزِ دروں رکھتا نہیں
شعلہ ہے مثلِ چراغ لالۂ صحرا ترا

(بانگِ درا:۱۸۴)

وہ روشنی بیکار ہے جو سوزِ دروں سے محروم ہو' میرا نور' میرے سوزِ دروں اور دردِ پنہاں کا نتیجہ ہے' تو سوزِ دروں اور دردِ پنہاں سے محروم ہے۔ تو شعلہ تو رکھتا ہے لیکن ویسا ہی جیسا لالۂ صحرا کا شعلہ ہوتا ہے۔ رنگ وہی لیکن سوزِ دروں ناپید' لہٰذا تجھے یکسانیت اور اشتراک میرے بجائے لالۂ صحرا میں تلاش کرنا چاہیے۔

بڑی دیر تک شمع' شاعر کی باتوں کا جواب دیتی رہتی ہے' بہت کچھ کہتی ہے اور شاعر گم سُم سنتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایسا تیر لگاتی ہے جس کا کوئی توڑ نہیں۔

سوچ تو دل میں لقب ساقی کا زیبا ہے تجھے؟
انجمن پیاسی ہے اور پیمانہ بے صہبا ترا
اور ہے تیرا شعار' آئینِ ملت اور ہے
زشت روئی سے تری آئینہ ہے رُسوا ترا

(بانگِ درا:۱۸۴)

کعبہ پہلو میں ہے، اور سودائی بت خانہ ہے
کس قدر شوریدہ سر ہے شوقِ بے پروا ترا!!

(بانگِ درا:۱۸۵)

(۳۶)

رکھتے ہیں اہلِ درد مسیحا سے کام کیا

ذات رسالت مآب ﷺ سے اقبال کو بڑی گہری اور غیر معمولی عقیدت تھی۔اسی مناسبت سے خاکِ حجاز کا ذرّہ ذرّہ ان کے لیے سرمۂ چشم کی حیثیت رکھتا تھا۔اپنے اشعار میں متعدد مواقع پر انھوں نے ''غبارِ راہ حجاز'' بن جانے کی تمنا کی ہے‘ گو زندگی میں ان کی یہ مسرت پوری نہ ہو سکی کہ صحرائے بطحا اور دیارِ یثرب میں پہنچے‘ لیکن جب تک زندہ رہے اس تمنا میں جلتے رہے۔

حبِ رسول اللہ ﷺ اور خاکِ حجاز سے عقیدت کے سلسلہ میں اقبال کوئی منفرد حیثیت نہیں رکھتے تھے‘ کون مسلمان ہے جو رسالت مآب ؐ سے محبت نہ کرتا ہو اور خاکِ حجاز کو عزیز نہ رکھتا ہو‘ بہت سے ایسے لوگ ملیں گے‘ جو اس باب میں اقبال سے بھی آگے ہیں‘ یعنی ذاتِ رسالت پناہ سے ان کی شیفتگی اور بطحا و یثرب سے ان کی عقیدت اقبال کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے‘ لیکن ان میں اور اقبال میں ایک فرق ضرور ہے اور وہ فرق بجائے خود خاص اہمیت رکھتا ہے، اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بنیادی اور اساسی فرق ہے‘ اسی لیے اس کی اہمیت زیادہ ہے۔

ایک تحریک شروع ہوئی کہ جدّہ میں‘ جو گویا حجاز کا دروازہ ہے ایک ہسپتال کھولا جائے۔آج کا جدّہ دُنیا کے ترقی یافتہ اور متمدّن شہروں میں سے ایک ہے۔وہاں فلک رفعت کوٹھیاں تعمیر ہو چکی ہیں۔ بلند اور شاندار عمارتوں نے جدہ کو نیو یارک‘ لندن‘ برلن اور پیرس کی

صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ وہاں زمین کی قیمت اتنی بڑھ چکی ہے کہ ایک سو گز زمین ایک ہزار روپیہ میں بہ مشکل ملتی ہے۔ لیکن آج سے ۴۵۔۵۰ سال پہلے کا جدہ اب سے بالکل مختلف تھا۔ وہاں نہ کوئی شاندار عمارت تھی، نہ ہسپتال، نہ ضروریاتِ تمدن کی اور چیزیں۔ لہٰذا، شفا خانہ کی اس تحریک نے عالمِ اسلام میں عام طور پر اور پاک و ہند میں خاص طور پر بڑی ہمہ گیری حاصل کر لی۔ اس مقصد کے لیے چندے ہونے لگے اور یہ طے ہوا کہ یہ رقم وہاں بھیج دی جائے تا کہ ہسپتال اور زیادہ شاندار طور پر تیار ہو سکے۔

یہ خوش خبری لے کر ایک پیشوائے قوم اقبال کے پاس پہنچے اور انہیں اکسایا:

ہوتا ہے تیری خاک کا ہر ذرّہ بے قرار
سنتا ہے تو کسی سے جو افسانۂ حجاز

(بانگِ درا: ۱۹۸)

یہ سن کر اقبال کے کان کھڑے ہوئے کہ ضرور کوئی خاص بات ہے، لیکن اس حقیقت سے کہ ان کی خاک کا ہر ذرّہ افسانۂ حجاز سن کر بے قرار ہو جاتا ہے، وہ انکار نہ کر سکے۔ انھوں نے جواب دیا بے شک ایسا ہوتا ہے اور اس پر مجھے فخر ہے، ناز ہے، لیکن اس ارشادِ گرامی کا مطلب کیا ہے۔ افسانۂ حجاز سے میری وابستگی اور تعلقِ خاطر کو اس وقت زیرِ بحث لانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی آپ کو؟ کوئی خاص وجہ تو ہو گی، جو آپ نے یہ ذکر چھیڑا ہے؟ بتایئے وہ محرک کیا ہے؟ یہ سوال آپ مجھ سے کیوں کر رہے ہیں؟ انھوں نے فرمایا:

دستِ جنوں کو اپنے بڑھا جیب کی طرف
مشہور تو جہاں میں ہے دیوانۂ حجاز

(بانگِ درا: ۱۹۸)

یہاں تک بھی خیریت رہی۔ اقبال نے جواب میں عرض کیا

بجا ارشاد ہوا، میں دیوانۂ حجاز مشہور ہوں اور یہ شہرت کچھ غلط بھی نہیں ہے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اگر دیوانۂ حجاز ہوں، تو دستِ جنوں کو جیب و دامن تک کیوں لے جاؤں؟

ارشاد ہوا:

دار الشفا حوالیِ بطحا میں چاہیے
نبضِ مریض پنجۂ عیسٰی میں چاہیے

جدّہ میں شفاخانہ تعمیر ہو رہا ہے۔ وہاں بیماروں اور ناچاروں کا علاج ہوگا، ان کا روگ دُور کیا جائے گا، انہیں صحت دی جائے گی، ان کے زخموں پر مرہم رکھا جائے گا، ان کی مصیبت کا علاج کیا جائے گا۔ بھلا جو لوگ صحرائے بطحا اور دیارِ یثرب کے آس پاس رہیں، ان کی خدمت ہمارا فرض نہیں ہے؟ کیا ہمیں یہ نہیں چاہیے کہ ان کی صحت، علاج اور تیمارداری کے سلسلہ میں اپنا فرض ادا کریں؟

اقبال نے یہ داستان بڑے مزے لے لے کر سنائی ہے۔ پیشوائے قوم کی ساری باتیں سننے کے بعد وہ فرماتے ہیں:

میں نے کہا کہ موت کے پردے میں ہے حیات
پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں

(بانگِ درا: ۱۹۸)

زندگی مجاز ہے، موت حقیقت۔ موت کوئی گھبرانے اور ڈرنے کی چیز تو نہیں۔ وہ تو درحقیقت ایک نئی، مستقل اور پائدار زندگی کا نام ہے:

تلخابۂ اجل میں جو عاشق کو مل گیا
پایا نہ خضر نے مئے عمرِ دراز میں

(بانگِ درا: ۱۹۸)

عاشق کو جو لذّت اور جو نعمت موت کی تلخی میں مل گئی، اسے عمرِ دراز سے بہرہ ور ہونے کے باوجود خضر والا مقام بھی نہ حاصل کر سکے، یہ کیسی عجیب بات ہے۔ آپ فانی دے کر آنی خریدنا چاہتے ہیں وقتی چیز کو ابدی چیز پر ترجیح دے رہے ہیں۔ کم از کم میں تو آپ کی ہمنوائی سے اپنے آپ کو معذور پاتا ہوں:

اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں (بانگِ درا: ۱۹۸)

ہسپتال بنا کر معالج اور تیمارِدار پیدا کر کے دوسروں کو آپ زندگی کی نوید اور بشارت دیں، مجھے تو سرزمینِ حجاز میں موت کی تمنا ہے۔ میں وہاں زندہ رہنا نہیں چاہتا، مرنا چاہتا ہوں، رنجوریٔ تن کا مداوا حاصل کرنے میں وہاں نہیں جانا چاہتا۔ غم دل کا علاج کرنا چاہتا ہوں اور اس کا علاج موت ہی ہے۔۔۔۔" موت یعنی حیاتِ جاوداں!

(۳۷)

شاعر کا فرض

شاعری کو ''جزویست از پیغمبری'' کہا گیا ہے لیکن کس شاعری کو؟ کیا اس شاعری کو جو رندی اور ہوسنا کی کا پیغام سناتی ہے؟ نہیں وہ شاعری نہیں افیون ہے شراب ہے زہر ہلاہل ہے، کوئی قوم اس سے سرسبز نہیں ہوسکتی، شاد کام نہیں ہوسکتی، حصولِ مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتی، وہ شاعری جسے ''جزویست از پیغمبری'' کہا گیا ہے وہ شاعری ہے جو قوم کی مردہ رگوں میں زندگی کا نیا خون دوڑا دے جو سوئی ہوئی قوم کو زندہ اور بیدار کردے جو بزدلوں میں مر مٹنے اور کٹ مرنے کا جذبہ پیدا کردے جو قوم کی تعمیر اور تشکیلِ نو میں ممد معاون ہو جو قوم پر نکتہ چینی کرے نہ اس کے عیب نمایاں کرے اس کے نقائص بیان کرے اور پھر اسے رفعت اور شکوہ کا پیام دے اس میں ایک ایسا جذبہ پیدا کردے جو طوفانوں کا مقابلہ کرسکے پہاڑوں سے ٹکرا سکے، آفتوں اور تباہیوں کو خاطر میں نہ لائے۔

اقبال اسی قسم کے شاعر تھے وہ اس طرح کی شاعری کو ملک وملت کے لیے مفید اور کارگر سمجھتے تھے۔ انھوں نے ایک مرتبہ کہا تھا

مدیرِ مخزن سے اقبالؔ کوئی جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں، انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

(بانگِ درا:۱۳۶)

تو ان کا مطلب رندی اور ہوسنا کی کی شاعری سے تھا جو قوم پر اضمحلال اور افسردگی کا عالم طاری کردیتی ہے جو اس سے زندگی کی حرارت چھین لیتی ہے اور اسے عمل کی نعمت سے محروم کردیتی ہے وہ شاعری جو قوم کے لیے حیاتِ تازہ کا حکم رکھتی ہو مفید ہے۔ اقبال چاہتے تھے وہ

شاعری یکسر ترک کردینی چاہیے، جس کا مقصد رندی اور ہوسنا کی ہے۔ وہ شاعری اختیار کی جائے جو ملّت کے مفادِ عمومی کی نگہبان ہو۔

اس موضوع پر کئی مقامات پر انھوں نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ کہیں کھل کر، کہیں بند بند، ایک مقام پر اپنے خیالات ذرا وضاحت سے پیش کیے ہیں، بتایا ہے، میں کس طرح کی شاعری کرتا ہوں اور قوم کو کس طرح کی شاعری کی ضرورت ہے۔

بات انھوں نے جوئے کوہسار سے شروع کی ہے، بتاتے ہیں، فرازِ کوہ سے، جو سرودِ آفریں شرابِ لالہ گوں سے مست، میکدۂ بہار کے ایوان سے قدم باہر نکالتی ہے اور پھر زندگی بھر وہ رواں ہی رہتی ہے، اس کی روانی ہی اس کی زندگی ہے، قرار نام ہے موت کا اور بے قراری نام ہے زندگی کا، وہ قرار سے آشنا نہیں ہوتی۔ بے قرار، مضطرب بس اس ایک دھن میں رواں دواں رہتی ہے، وادیوں میں اٹھکھیلیاں کرتی پہنچتی ہے، سبزۂ مرغزار سے عشق بازی کرتی ہے، کھیتوں کو سیراب کرتی ہے، جس سے اناج پیدا ہوتا ہے اور خلقت کا پیٹ بھرتا ہے۔ باغِ چمن میں پھولوں اور کلیوں کو پیامِ نمو دیتی ہے، جس سے آنکھیں طراوت حاصل کرتی ہیں اور دل و دماغ سکون حاصل کرتے ہیں۔ اس کی بے قراری خلقتِ خدا کے لیے امن و سکون اور راحت و آسائش کا پیام ہے۔

یہ سب کچھ بتا چکنے کے بعد اقبال کہتے ہیں شاعر بھی، جوئے رواں کی طرح ہوتا ہے، وہ بھی دلوں کی کھیتی کو پانی دیتا اور روح کے پھولوں میں رعنائی پیدا کرتا ہے۔

شاعرِ دل نواز بھی باتَ اگر کہے کھری
ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری

(بانگِ درا:۲۱۱)

اور شاعر کا کلام زندگی کی کھیتی ہی میں ہریالی نہیں پیدا کرتا، بلکہ

شانِ خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعارِ آزری

پھر کھل کر، صاف صاف کہتے ہیں کہ وہی شاعری، شاعری ہے جو قوم کی آزریت کے لیے

نوائے خلیل کا حکم رکھتی ہے ورنہ وہ شاعری نہیں الفاظ کی طلسم بندی ہے۔

اہلِ زمیں کو نسخۂ زندگی دوام ہے
خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری

(بانگِ درا:۲۱۱)

دُنیا والے اس شاعری سے حیات دوام حاصل کر سکتے ہیں، جس کی تربیت خونِ جگر سے ہوئی ہو اور یہ شاعری اگر دم توڑ دے اس کا وجود اگر مٹ جائے تو پھر نہ قوم کی خیر ہے نہ ناموسِ ملت کی۔

گلشنِ دہر میں اگر جوئے مے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو

(بانگِ درا:۲۱۱)

شورشِ محشر

کہتے ہیں کہ شاعر قوم کو بنا اور بگاڑ سکتا ہے اور یہ قول کچھ غلط نہیں۔ امر واقعہ ہے شعر میں جادو ہوتا ہے۔ اس جادو کو نیک کام میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور برے کام میں بھی۔ جن شاعروں نے اپنی شاعری کا موضوع ساقی سیمیں اور ساعد زرّیں کو بنایا، جنھوں نے گل وبلبل کا افسانہ سنایا' جنھوں نے رندی اور ہوسنا کی کی داستانیں طشت از بام کیں' جنھوں نے امرد پرستی کے قصے مزے لے لے کر بیان کیے' جو ہمیشہ زلف کاکل میں اُلجھے رہے، جن کے منہ سے ہمیشہ رخسار وگلو کی تعریف وتوصیف میں قصیدے جاری ہوتے رہے، جنھوں نے سارا زورِ کلام معاملہ بندی اور عشرت پر صرف کر دیا۔ خود ان کے زمانہ کی سوسائٹی اور سماج پر نظر ڈالیے کون کہہ سکتا ہے ان کا چلایا ہوا جادو بے اثر رہا؟ اس زمانہ کی سوسائٹی میں جو اقدار حیات ہوسنا کی اور رندی کی شاعری نے پیدا کر دیے تھے' آج ان کا تصور کرتے ہی شرم آتی ہے۔ وہ ذکر ہی طبعِ نازک پر بار ہے۔

اقبال نے جس سوسائٹی میں آنکھیں کھولیں' اگرچہ کسی درجہ میں اس کی اصلاح اور تعمیر نو کا کام شروع ہو چکا تھا، لیکن کم وبیش حالات وہی تھے' امرا کی عیاشیاں' غرباء کی بے پروائیاں، خواص کی عشرت پسندی' عوام کی خود پرستی' علماء کا مشغلہ 'پیکار' باہمی مناظرہ اور تکفیر، صوفیا کی خانقاہوں میں ذکر وشغل ہوحق اور نعرۂ تکبیر' دُنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ اس سے کسی کو سروکار نہیں، دُنیا کس نہج پر جا رہی ہے' اسے سوچنے کی کسی کو پروا نہیں، عالمِ اسلام کا کیا حال ہے؟ اس فرسودہ موضوع پر بحث وگفتگو اور غور وفکر کے لیے کسی کے پاس وقت نہیں، خلافتِ اسلامیہ کی قبا کس طرح تار تار کی جا رہا ہے اس کا غم کسی کو نہیں، حجاز مقدس' مقاماتِ مقدسہ اور عتباتِ

عالیات کو فرنگی استعمار پرستوں نے کس طرح ہدفِ جوع الارض بنا رکھا ہے' اس کا کسی کو خیال نہیں، خود پاک و ہند کے مسلمانوں پر ابنائے وطن کے ہاتھوں، فرنگی سامراج کے ہاتھوں' قومی غداروں اور منافقوں کے ہاتھوں کیا گزر رہی ہے؟ اس کا کسی کو دھیان نہیں۔ سب اپنے رنگ میں رنگے ہوئے' اپنی دھن میں مست ہیں اور اپنے غریب خانہ میں ایوانِ امارت میں خاموشی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور اس زندگی میں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتے تھے۔ گویا جو کچھ ہے ٹھیک ہے' جس طرح گزر رہی ہے درست ہے۔

اب تو آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

کہیں شراب کا دَور چل رہا ہے' کہیں کوئی مہ جبیں مصروفِ رقص ہے، کہیں نغمہ کی دلکشی ناہید فلک کا مقابلہ کر رہی ہے، کہیں کنکوے لڑائے جا رہے ہیں، کہیں بٹیروں کی پال ہو رہی ہے، کہیں کبوتر اُڑائے جا رہے ہیں، کہیں دادِ عیش دی جا رہی ہے، کہیں تھیٹر سے دلچسپی لی جا رہی ہے، کہیں جوا کھیلا جا رہا ہے، کہیں مشاعرے اور مناظمے ہو رہے ہیں، کہیں نعت پڑھی جا رہی ہے، کہیں سوز خوانی ہو رہی ہے، کہیں میلاد شریف کی محفلیں ہیں، کہیں محرم کی مجلسیں۔ اور کہیں امیر حمزہ کی داستانیں۔

کسی کو یہ نہیں معلوم کہ صیاد گھات میں ہے۔ دام ہمرنگ زمین ہے۔ بہت سے ساتھی گرفتار ہو چکے ہیں اور جو باقی ہیں وہ ایک لحہ میں گرفتار بلا ہو سکتے ہیں۔۔۔ "آج" بس یہی سب کچھ تھا۔ گذرا ہوا کل اور آنے والا کل کسی کی دلچسپی اور غور و فکر کا موضوع نہ تھا۔

یہ فضا تھی' جب سید احمد خاں ایک مصلح کے روپ میں نمودار ہوئے۔ شبلی کے تاریخ کی محفل کیا تھی۔ حالی نے قوم کے عزاخانے میں مرثیہ ملی پڑھنا شروع کیا۔ نذیر احمد نے حکایت اور لطافت لسانی کے جوہر دکھائے۔ محسن الملک' وقار الملک اور دوسرے اکابر نے قوم کے کان میں صورِ بیداری پھونکا' لیکن وہ کسمسا کر رہ گئی۔ اس کے خواب خرگوش میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ صرف کچھ نیند کے ماتے ایسے تھے جنھوں نے انگڑائی لی اور اٹھ بیٹھے' ورنہ زیادہ تر ایسے تھے جنھوں نے آواز سُنی کی اَن سُنی کر دی اور گھوڑے بیچ کر سوتے رہے۔

اس کے بعد دوسرا دَور شروع ہوا۔

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی؟

یہ دَور گو جلد شروع ہوا اور جلد ہی ختم بھی ہو گیا' لیکن اس کے نقوش اتنے گہرے اور پائدار تھے کہ شائد کئی نسلوں تک اس کے آثار قائم رہیں گے۔

اسی دَور میں محمد علی کی صالح' مخلصانہ اور ہمہ گیر قیادت منظر عام پر آئی اور اس نے پاک و ہند کے طول و عرض میں ہلچل مچادی' اس دَور میں شوکت علی کا سا سراپا' ایثار و عمل اور کوہ وقار شخص نمودار ہوا' اور اس نے پاک و ہند کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ کو زیر وزبر کر کے رکھ دیا' اس دور میں ابوالکلام کی یگانہ فرد فرید خطابت فضا میں گونجی اور اس نے صرف سوتوں ہی کو نہیں جگایا' بلکہ جو مر چکے تھے انھیں بھی زندگی اور زندگی کی حرارت سے مالا مال کر دیا۔ ابوالکلام کی خطابت سے در و دیوار گونجے' اس کی آواز' جھونپڑیوں میں بھی پہنچی اور ایوانوں میں بھی' گھروں میں بھی اور قصور ولایت میں بھی' یہاں تک کہ

تزلزل در ایوان کسرے فتاد

قصر شہریاری کے کنگرے اور ایوان خسروی کے منارے' اس کی شہیب خطابت سے لرزنے لگے' کانپنے لگے اور اسی دور میں اقبال اُبھرا' نمایاں ہوا اور چھا گیا۔ اس کی شاعری وطن پرستی سے شروع ہوئی تھی لیکن اسلام پر ختم ہوئی' ذرا غور تو کیجیے اس آغاز و انجام پر

گنگا سے جو پھسلا' لبِ کوثر نکلا

کوئی شبہ نہیں ان سب کے اثرات ہیں اور اپنی جگہ مستقل' یادگار اور دیرپا اثرات ہیں لیکن ''خدمت'' اور کام کا جو موقع اقبال کو ملا' وہ کسی کو نہیں ملا۔ جس یکسوئی اور تسلسل کے ساتھ اقبال نے اپنا مشن جاری رکھا وہ بات کسی بزرگ کو نہ حاصل ہو سکی۔

محمد علی کی قومی زندگی کا بڑا حصہ نظر بندی' جیل اور پیکار باہمی میں گزرا۔ اسے ''حق'' کے لیے صرف دشمنوں ہی سے نہیں اپنوں سے بھی لڑنا پڑا' ان سے بھی جو اس کے دوست تھے' محبوب تھے' رفیق تھے۔ اس نے استعمار فرنگ سے ٹکر لی' اس نے ہندو سامراج کا مقابلہ کیا اور اس نے مسلمان سرکار پرستوں کے وار سہے۔ اس کی ساری زندگی جہاد' پیکار' حملے' جوابی حملے اور

دفاع میں گزر گئی۔قدرت کی طرف سے عمر ہی کم لکھا کر لایا تھا۔۵۲ سال کی عمر میں اس جہان گزراں سے رخصت ہو گیا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(بانگِ درا:۲۳۶)

شوکت علی قد وقامت کے اعتبار سے جیسا کوہ پیکر تھا' اتنا ہی بڑا اس کا دل تھا۔اسے محمد علی سے عشق تھا' لیکن ملّتِ اسلامیہ کو وہ محمد علی سے بھی زیادہ چاہتا تھا۔محمد علی کا غمِ مرگ مردانہ وار اس نے جھیل لیا اور اپنے رنگ میں' اپنے اسلوب سے قوم کی خدمت کرتا رہا' لیکن اسے جو زمانہ ملا وہ انتشار اور افتراق کا زمانہ تھا' وہ اکیلا تھا اور ہر طرف سے اس پر حملے ہو رہے تھے' کانگرس اس کے خلاف صف آرا تھی' مسلم نیشلسٹ پارٹی کے تیر براہ راست اس کا سینہ چھیدتے تھے' مجلسِ احرار کی سنگینیں اس کے دست وبازو پر چرکے لگاتی تھیں' نیلی پوش تحریک کی طرف سے اس پر بمباری ہوتی تھی،وہ مسلمانوں کی اور ملت اسلامیہ کی خدمت کرنا چاہتا تھا اور ان محاذوں کی طرف سے اسے دعوتِ مبارزت دی جاتی تھی۔وہ ہمت کا پکا' ارادہ کا سچا اور محبت کا کھرا آدمی تھا۔خندہ جبینی کے ساتھ ان حملوں کو برداشت کرتا رہا۔کبھی کبھی اپنا سیاہ آبنوسی ڈنڈا ہی فضا میں گھما کر دو چار سر زخمی کر دیتا تھا۔اس نے چارسدہ اور اتمان زئی میں عبدالغفار خاں اور ڈاکٹر خان کو جا کر للکارا اور یہ حضرات اس کے سامنے نہ آ سکے' اس نے کانگرس کے سب سے بڑے مرکز ۔۔۔ بمبئی ۔۔۔ میں بیٹھ کر گاندھی' پٹیل اور نہرو کا مقابلہ کیا اور شکست نہ کھائی ۔اس نے لکھنؤ' پٹنہ' الہ آباد اور دوسرے مقامات پر نیشلسٹ مسلمانوں کے حملے سہے' وار کیے اور سرخرو نکلا لیکن وہ اکیلا کیا کیا کرتا' کس کس سے لڑتا یا کہاں کہاں پہنچتا' پھر بھی ......زندگی کی آخری سانس تک میدان میں ڈٹا رہا۔بوڑھا ہو چکا تھا' تھک چکا تھا' عاجز آ چکا تھا' آخر ایک روز بستر پر ایسا لیٹا کہ پھر آنکھ نہ کھولی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ابوالکلام جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پرچم لے کر میدانِ عمل میں گام فرسا

ہوئے تھے جنھوں نے ''حزب اللہ'' قائم کر کے امت اسلامیہ کو سر فروشی اور جہاد کی دعوت دی تھی، جنھوں نے الہلال اور البلاغ نکال کر ملّتِ مسلمہ کو بہت سی نئی چیزیں دی تھیں ---نئی زبان، نیا لب ولہجہ، نئے الفاظ، نئے محاورات، نئے خیالات، نیا پیام --- بہت کچھ--- جن کی دعوت اور جن کے پیام کا مقصد ومنشا، صرف مرد مسلمان کی انفرادیت کا تحفظ اور ناموسِ اسلام کا دفاع تھا، کانگرس میں پہنچے تو وہیں کے ہو رہے اور اب تو یہ عالم ہے کہ

نکل گیا ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے

مسلمانانِ ہند اور امام الہند میں غور ونظر کا ایسا اختلاف پیدا ہوا کہ پھر وہ رفع نہ ہوسکا۔ امام الہند قومیت متحدہ کے راستے پر گامزن ہو گئے تھے۔ مرد مسلمان کی انفرادیّت اب ان کے نزدیک ایک بے معنی لفظ ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن مسلمانانِ ہند کو امام الہند کا دیا ہوا پچھلا سبق کچھ اس عقیدت اور خلوص سے یاد کیا تھا کہ وہ بھولتا ہی نہیں تھا، قوم اسرار کے ساتھ امام الہند کے بتائے ہوئے راستہ پر استقلال وعزیمت کا پرچم لیے ہوئے گامزن تھی، لیکن امام الہند دوسرا راستہ اختیار کر چکے تھے---- کوئی شبہ نہیں ان کا یہ اقدام خلوص پر مبنی تھا۔

لیکن اقبال نے ایک مختصر سی مدت تک وطن کے بُت کی پوجا کی اور پھر جو وہ راہِ حجاز پر پڑے تو زندگی کی آخری سانس تک اس راستہ پر گامزن رہے۔

پاک وہند میں بڑے بڑے طوفان آئے، بڑی بڑی قیامت خیز تحریکیں اٹھیں، انقلابات آئے لیکن اقبال نے ان کی طرف توجہ بھی نہ کی۔ جیسے مریخ میں کوئی طوفان آئے وہ خواہ کتنا ہی بڑا اور کتنا ہی مہیب کیوں نہ ہو، لیکن ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں، اسی طرح اقبال ان تمام طوفانوں انقلابوں اور تحریکوں سے الگ رہے۔ وہ عملی آدمی نہیں تھے اور اپنی اس کمزوری یا خوبی کا انہیں اعتراف واحساس بھی تھا۔ وہ گوشۂ تنہائی میں بیٹھے دیکھتے سب کچھ رہے لیکن عمل کے میدان میں کودنے کی نہ انھوں نے ہمت کی، نہ ضرورت محسوس کی۔ البتہ اپنے کام میں فرق نہیں آنے دیا۔ اپنی نغمہ سرائی اور حدی خوانی سے ایک دن کیا ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہوئے۔ حد یہ ہے کہ بسترِ مرگ تک پر وہ اپنا پیام قوم کے کانوں تک پہنچاتے رہے۔

مذکورہ حضرات میں اقبال کے سوا کسی کو اتنا موقع نہ ملا کہ وہ اتنے تسلسل اور یکسانیت

اور استقلال کے ساتھ اپنی خدمت اور اپنے ''کام'' کا سلسلہ جاری رکھ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ محمد علی شوکت علی اور ابوالکلام کے مقابلہ میں اقبال کا نقش بہت گہرا ہے اور یہ نقش نہ دوستوں کے مٹائے مٹ سکتا ہے۔۔۔۔اس لیے کہ دوستوں نے بھی کچھ کم کوشش نہیں کی۔۔۔۔اور نہ دشمنوں کے مٹائے۔ اس پس منظر کو پیش کرنے کے بعد اب میں آپ کو اقبال کی ایک نظم کے چند اشعار کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔ ان اشعار کو پڑھیے اور غور کیجیے۔ کیا اقبال کے سوا یہ باتیں کسی اور کے منہ سے بھی نکل سکتی تھیں' ان میں جو زور ہے' جو اثر ہے' جو سحر ہے' وہ صرف حق اور صداقت اور حسنِ نیت کا ثمرہ ہے۔ ہر شعر کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف سے اقبال کی وہ دعوت نمایاں ہے جس کے لیے وہ زندہ تھے۔

اقبال خدا سے دعا کرتے ہیں:

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے
پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرّے کو چمکا دے
پھر شوقِ تماشا دے پھر ذوقِ تقاضا دے
محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو، پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو، پھر وسعتِ صحرا دے
پیدا دلِ ویراں میں، پھر شورشِ محشر کر
اس محملِ خالی کو، پھر شاہدِ لیلیٰ دے
رفعت میں مقاصد کو ہمدوشِ ثریا کر
خود داریٔ ساحل دے، آزادیٔ دریا دے
بے لوث محبت ہو، بے باک صداقت ہو
سینوں میں اجالا کر، دل صورتِ مینا دے (بانگِ درا:۲۱۲)

جس شعر پر نظم کو ختم کرتے ہیں اس کا اثر اور سوز و گداز دیکھیے۔

میں بلبلِ نالاں ہوں اک اُجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں، محتاج کو داتا دے

(بانگِ درا:۲۱۳)

الفاظ کی سادگی، مفہوم کی بلندی، مقصد کی رفعت، اس ایک شعر میں کیا کچھ نہیں ہے۔

اسی کو تو کہتے ہیں: ان من البیان السحر

مقصدِ قدرت

پریشاں ہوں مَیں مشتِ خاک، لیکن کچھ نہیں کھلتا
سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں
یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا
سراپا نور ہو جس کی حقیقت، میں وہ ظلمت ہوں
خزینہ ہوں، چھپایا مجھ کو مشتِ خاکِ صحرا نے
کسی کو کیا خبر ہے میں کہاں ہوں، کس کی دولت ہوں؟
نظر میری نہیں ممنونِ سیرِ عرصۂ ہستی
میں وہ چھوٹی سی دُنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں
نہ صہبا ہوں، نہ ساقی ہوں، نہ مستی ہوں، نہ پیمانہ
میں اس میخانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں

(بانگِ درا:۶۹)

(۳۹)

پھر کیا؟

یہ زندگی کتنے دن کی ہے؟ زندگی کا یہ ٹھاٹھ کتنے روز کا مہمان ہے؟ آنکھ بند ہوئی اور سب کچھ دوسروں کا' نظیرا کبرآبادی نے سچ تو کہا ہے۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

لیکن اس چند روز کی زندگی کے لیے ہم نے کیسے کیسے حدود قائم کر رکھے ہیں؟ یہ غریب ہے' وہ امیر ہے' یہ مزدور ہے' وہ سرمایہ دار ہے۔ یہ کاشتکار ہے' وہ زمیندار ہے' یہ رعایا ہے وہ راعی ہے' یہ گدائے بے نوا ہے' وہ شاہ کج کلاہ ہے' یہ اپنے گھر کی حفاظت نہیں کر سکتا' وہ ملکوں اور ملتوں کو فتح کر لیتا ہے۔ یہ اپنا بچاؤ نہیں کر سکتا۔ وہ سما سے لے کر سمک تک' ہر چیز کو اپنا ہدف بنا لیتا ہے۔ یہ نہتا ہے' وہ موٹر کا مالک ہے' طیاروں میں اُڑتا ہے۔ اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں، اس کا بنک بیلنس حدِ شمار سے خارج ہے، یہ پیادہ پا ہے' وہ شہسوار ہے' یہ ایک ایک نوالہ کو ترستا ہے' وہ اپنے دستر خوان پر دُنیا جہان کی نعمتیں رکھتا ہے' یہ فاقہ کشی کے باعث دم توڑ رہا ہے' وہ شکم پُری کے سبب لبِ گور ہے' اس کے پاس پیسہ نہیں کہ کتاب لے اور پڑھے اس کے پاس روپیہ ہے لیکن وہ علم و مطالعہ کی اہمیت نہیں محسوس کرتا۔

غرض اس دُنیا میں لوگوں نے از خود برتری اور کمتری کے حدود قائم کر رکھے ہیں، اونچ نیچ کی دیواریں تعمیر کر لی ہیں' مگر کوئی نہیں سوچتا اس چندروزہ زندگی میں یہ افتراق' یہ جذبہ تفوق' یہ احساسِ برتری کوئی معنی نہیں رکھتا، ایک دن موت آئے گی اور کون کہہ سکتا ہے وہ خود بخود ختم ہو جائے' گوشۂ قبر ایک ایسی دُنیا ہے جہاں شاہ گدا ایک ہو جاتے ہیں' امیر و غریب

کا امتیاز قائم نہیں رہتا۔ موت ہر کسی کو آتی ہے اور مرنے کے بعد ہر ایک کا بدن سڑتا' گلتا اور کیڑوں مکوڑوں کی غذا بنتا ہے' جب ہماری کائنات صرف یہ ہے کہ پھر ایک مختصر سی مدت کے لیے' انسانیت میں تفریق کرنا اور پست و بلند کے مدارج قائم کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟

اقبال نے اسی خیال کو بڑے ستھرے اور شائستہ انداز میں ایک مقام پر پیش کیا ہے فرماتے ہیں:

رہینِ شکوۂ ایّام ہے زباں میری
تری مراد پہ ہے دَور آسماں، پھر کیا؟

(بانگِ درا:۲۲۰)

ہاں۔۔۔میں ناکام ہوں' نامراد ہوں' حرماں نصیب ہوں' جو چاہتا ہوں نہیں پاتا' جو مانگتا ہوں نہیں ملتا۔ میری ہر خواہش ہیچ' میری ہر آرزو بیکار' اور تو کامیاب ہے' بامراد ہے' جو چاہتا ہے ہوتا ہے' جو مانگتا ہے پاتا ہے' جو مانگتا ہے ملتا ہے۔ مجھ میں اور تجھ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔۔۔۔لیکن کیا یہ فرق میرے اور تیرے انجام میں بھی قائم رہے گا۔

رکھا مجھے چمن آوارہ مثلِ موجِ نسیم
عطا فلک نے کیا تجھ کو آشیاں، پھر کیا؟

(بانگِ درا:۲۲۰)

مانتا ہوں' میں آشفتہ حال اور پریشان روزگار ہوں' میرا کوئی ٹھکانا نہیں۔ کوئی مقام نہیں' کوئی مسکن نہیں' موجِ نسیم کی طرح ادھر ادھر مارا پھرتا رہتا ہوں اور تجھے خدا نے آستان و ایوان عطا کر رکھا ہے' تو صاحبِ نشیمن ہے تو کاشانہ کا مالک ہے' جہاں صرف تو ہی نہیں رہتا تیرے بہت سے متوسلین بھی رہتے ہیں' لیکن یہ تو بتا' کیا میری طرح تو بھی نہیں مرے گا؟ کیا میری طرح تو بھی اس دُنیا سے خالی ہاتھ نہیں جائے گا؟

فزوں ہے سود سے سرمایۂ حیات ترا
مرے نصیب میں ہے کاوشِ زیاں، پھر کیا

(بانگِ درا:۲۲۰)

یہ بھی درست ہے کہ روپیہ، روپیہ کو کھینچتا ہے، تیرا ہاتھ نہیں پارس پتھر ہے، تو مس خام کو کیمیا بنا سکتا ہے، تو خاک کو سونا بنا سکتا ہے، تیرے گھر میں ہن برستا ہے، دولت تیرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے، امارت تیرے جلو میں چلتی ہے اور میرا یہ حال ہے کہ کنگال ہوں، سعی کرتا ہوں، محنت کرتا ہوں، لیکن نقصان اور خسارہ کے سوا کچھ میرے ہاتھ نہیں آتا، تیرا سرمایہ لحہ بہ لحہ بڑھتا رہتا ہے اور میری پونجی جو پہلے ہی کچھ نہ تھی، گھٹتے گھٹتے ختم ہوتی جارہی ہے۔ لیکن کیا اس صورت حال کو موت آ کر ختم نہیں کردے گی؟ کیا موت کا فیصلہ ہم دونوں میں مساوات نہیں قائم کردے گا؟ کیا پھر وہ من وتو کا یہ امتیاز قائم رہے گا؟

ہوا میں تیرتے پھرتے ہیں تیرے طیارے
مرا جہاز ہے محروم بادباں، پھر کیا؟

اس سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا، تو وہ ہے کہ فضا کی پنہائیاں تیرے طیاروں کے لیے تنگ ہے اور میری ٹوٹی پھوٹی کشتی بادبان تک سے محروم ہے۔ تو منزل مقصود تک لحوں میں پہنچ سکتا ہے اور میں ناخدا کی منت سماجت کے باوجود منزل تک پہنچنے کی آس قائم نہیں کرسکتا، لیکن انجام کار، گوشۂ قبر میں جب ہم دونوں ملیں گے تو بالکل یکساں ہوں گے۔

بہ ہیچ گونہ دریں گلستاں قرارے نیست
تو گر بہار شدی، ما خزاں شدیم چہ شد

اس گلزار حیات میں ایک لحہ بھی ثبات وقرار کا میسر نہیں آتا تو بہار ہے، میں خزاں ہوں، لیکن کل یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں بہار بن جاؤں اور تو خزاں کی صورت میں نظر آئے۔ انقلابات عالم کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے اور ایسا نہ بھی ہو تو بھی زندگی کے چند دن گزار لینے کے بعد ابدی زندگی کے دروازے پر ہم دونوں جب قدم رکھیں گے، تو یہ فرق و امتیاز مٹ چکا ہوگا۔ پھر یہ پندار کیوں؟ اور نخوت کس لیے؟

(۴۰)

جواب لاجواب

وہ تمام صلاحیتیں جو ایک لیڈر میں ہونی چاہئیں، اقبال میں موجود تھیں۔ وہ انگریزی زبان پر۔۔۔۔ خواہ تقریر ہو یا تحریر۔۔۔۔ غیر معمولی قدرت رکھتے تھے، علوم عصریہ سے بہت اچھی طرح واقف تھے، بلکہ ماہرانہ دسترس رکھتے تھے، سیاسیات عالم اور سیاستِ وطنی کے ایک ایک پہلو پر ان کی نگاہ تھی۔ مسلمانوں کی تجدیدِ حیات کے لیے وہ سرگرمِ عمل تھے۔ سحرِ فرنگ کے خلاف اپنے اشعار میں جادو بھرے خیالات ظاہر کیا کرتے تھے، غلامی کے خلاف وہ مسلسل شاعرانہ جہاد میں معروف تھے، غرض اگر وہ پلیٹ فارم پر آتے تو کسی سے پیچھے نہ رہتے، بہت جلد اور بڑی آسانی سے، وہ عوام میں بھی اقتدار حاصل کر لیتے اور حکومت کی نظر میں بھی چڑھ جاتے۔ پھر ان کے لیے وائسرائے یا گورنر کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر ہونا نامزد ہونا اور پانچ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ لینا بہت آسان ہو جاتا۔ لیکن یہ باتیں ان کی طبیعت اور مزاج کے خلاف تھیں۔ وہ قیادت کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہونے کے باوجود اس طرف کبھی متوجہ نہیں ہوئے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

وہ جانتے تھے لیڈری کتنی منفعت بخش چیز ہے اور ان کے بہت سے ساتھیوں اور دوستوں نے اس سونے کی چڑیا سے کتنا غیر معمولی فائدہ اٹھایا ہے۔ پھر بھی وہ اس طرف ملتفت نہیں ہوتے تھے۔

اقبال کے معزز دوست اصرار کے ساتھ انہیں سیاسیات میں حصہ لینے اور پلیٹ فارم پر آ جانے کی ترغیب دیا کرتے تھے، یقیناً ان کا یہ اصرار خلوص ہی پر مبنی ہوگا۔ چنانچہ ایک مرتبہ وہ اس سے متاثر ہو کر کچھ دنوں کے لیے پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بھی بھاری کثریت آرا سے اپنے دولت مند حریف اور مقابل کو پچھاڑ کر منتخب ہو گئے تھے۔ لیکن یہ ایک عارضی اور اتفاقی حادثہ تھا۔ دراصل ان چیزوں پر نہ وہ مائل تھے نہ مشتاق، وہ اپنے گوشۂ عزلت میں بڑے آرام سے تھے۔

نے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کمیں میں
گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اگر وہ سیاست کے کارزار سے اپنا دامن اُلجھاتے، تو ان کی وہ صلاحیتیں پردۂ اخفا میں رہ جاتیں، جن کے بارے میں گرامی نے کہا ہے:

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد پیمبر نتواں گفت

یہی وجہ ہے کہ جب ان سے اس طرح کا مطالبہ کیا جاتا تھا تو وہ بے تأمل صاف اور واضح الفاظ میں معذرت کر دیتے تھے۔

چنانچہ ایک مرتبہ ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ ان کے کسی دوست نے از راہِ اخلاص صلاح دی کہ شاعری سے قطع تعلق کیجیے، بیرسٹری کو سلام کیجیے، میدان میں آیئے، اپنی قیادت کا جوہر چمکایئے اور حریفوں کو بڑی آسانی سے مات دے دیجیے۔ لیکن اقبال نے شکریہ کے ساتھ یہ پیشکش مسترد کر دی:

ہزار شکر، طبیعت ہے ریزہ کار مری
ہزار شکر نہیں ہے دماغ فتنہ تراش

(بانگِ درا:۲۳۹)

اور لیڈر دماغ فتنہ تراش کے بغیر بیکار ہے۔

مرے سخن سے دلوں کی ہیں کھیتیاں سرسبز
جہاں میں ہوں میں مثالِ سحاب دریا پاش

(بانگِ درا:۲۳۹)

لہٰذا اے دوست!

یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں
کہ فیضِ عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

(بانگِ درا:۲۳۹)

(۴۱)

مایوسی

کبھی کبھی اقبال مایوس بھی ہو جاتے تھے وہ سوچتے تھے، جس چمن میں نوائے بلبل اور صدائے گل نہ سنی جاتی ہو تو وہاں رہنے سے کیا فائدہ؟ کبھی کبھی وہ یہ بھی غور کرتے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں یہ زمین ہی شور ہے۔ یہاں چاہے جتنے اچھے بیج ڈالے جائیں۔ لیکن فصل نہیں اُگ سکتی؟ انھوں نے زندگی کا بڑا حصہ، اپنی قوم کو بیدار کرنے میں صرف کیا، لیکن ان کی آنکھوں کے سامنے کوئی ایسا منظر نہیں آیا جسے دیکھ کر وہ خیال کر سکتے کہ ان کی آہ رنگ لا رہی ہے، ان کا نالہ سنا جا رہا ہے؟ ان کے پیام پر توجہ کی جا رہی ہے۔

اقبال ان لوگوں میں تھے، جو نتائج سے بے پروا ہو کر میدانِ عمل میں گام فرسا ہوتے ہیں

احسان ناخدا کا اٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

انھوں نے اپنا ایک راستہ متعین کر لیا تھا اور اس پر استقلال و عزیمت کے ساتھ گام فرسا تھے لیکن جب یہ دیکھتے تھے کہ ان کی نوائے جگر خراش پر کان نہیں دھرے جاتے تو مایوسی ان پر غالب آ جاتی تھی۔ چنانچہ اس عالم میں کہتے ہیں:

کہاں اقبال تو نے آ بنایا آشیاں اپنا
نوا اس باغ میں بلبل کو ہے سامانِ رسوائی

(بانگِ درا: ۲۴۴)

یعنی اے اقبال! تو کس مقام پر آ کر پھنس گیا ہے' تو وہاں نغمہ سرائی کر رہا ہے جہاں سننے والے نہیں' جنھیں تو اپنے نغمے سناتا ہے یہ گو کان رکھتے ہیں' لیکن بہرے ہیں، دل رکھتے ہیں، مگر احساس کی نعمت سے محروم ہیں' دماغ کے مالک ہیں لیکن سوچنا گناہ سمجھتے ہیں، صاحب دل بھی ہیں لیکن ان کا دل گوشت کا لوتھڑا نہیں' پتھر کا ٹکڑا ہے' ایسے لوگوں کے سامنے نغمہ سرائی کرنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے' خود اپنے آپ کو رسوا کرنا اور اپنے اخلاص کو متہم کرنا ہے' تو نے نغمہ سرائی کے لیے جو مقام منتخب کیا ہے وہ بالکل غلط اور قطعاً ناموزوں ہے۔ اگر آشیاں بنانا ہی تھا تو کسی ایسی جگہ بنایا ہوتا جہاں احساس اور دردمند لوگ ہوتے جو نوائے شاعر پر توجہ کرتے۔

شرارے وادی ایمن کے تو بوتا تو ہے لیکن
نہیں ممکن کہ پھوٹے اس زمیں سے تخمِ سینائی!

(بانگِ درا:۲۴۴)

جو زمین اتنی بنجر ہو چکی ہے کہ وہاں چارے اور اناج کی تخم ریزی بھی بیکار اور لاحاصل ہے' تو اس کے بارے میں اتنا حسن ظن رکھتا ہے کہ وہاں وادی ایمن کے شرارے بو رہا ہے' نادان عقل سے کام لے یہ وہ زمین نہیں جو سرسبز ہو سکے' جہاں تیرے شرارے برگ و بار لاسکیں اور تیری ملت میں گدازِ قلب پیدا کر سکیں۔

کلی زورِ نفس سے بھی وہاں گل ہو نہیں سکتی
جہاں ہر شے ہو محروم تقاضائے خود افزائی

(بانگِ درا:۲۴۴)

جہاں کی زمین اتنی بنجر ہو' جہاں کا پانی اتنا شور ہو' وہاں تو فصلِ گل کی توقع کرتا ہے؟ تیرا خیال ہے وہاں نسرین و نسترن کی کلیاں پھولیں گی۔ گلاب اور یاسمن کے پھول کھلیں گے وہاں ۔۔۔ یہ تیری سادہ لوحی ہے' جہاں ہر چیز خود افزائی کے تقاضے سے محروم ہو' یعنی زندگی اور زندگی کی تڑپ سے ناآشنا ہو' وہاں کسی طرح اگر کلی نکل بھی آئے اور وہ لاکھ زور مارے لیکن پھول نہیں بن سکتی۔ وہاں کبھی اور کسی صورت سے شاخِ گل سرسبز نہیں ہو سکتی۔

قیامت ہے کہ فطرت سوگئی اہلِ گلستان کی
نہ ہے بیدار دل پیری نہ ہمت خواہ برنائی

(بانگِ درا:۲۳۳)

حالت تو یہ ہے کہ جہاں تو نے آشیانہ بنایا ہے' جہاں تو نغمہ سرائی کر رہا ہے' وہاں کے لوگ خواب ابد میں مصروف ہو چکے ہیں، ان کی فطرت مر چکی ہے، ان میں کوئی حوصلہ نہیں' کوئی امنگ نہیں' جہاں نہ بوڑھوں کے دل بیدار ہیں نہ جوانوں میں ہمت اور ذوق وشوق ہے' ان حالات میں خاموش ہی رہنا بہتر ہے۔

تمہید میں یہ ساری باتیں بیان کر کے یعنی مایوسی اور ناکامی کی داستان سنا چکنے کے بعد خود اپنے آپ کو مشورہ دیتے ہیں۔

نہیں ضبطِ نوا ممکن تو اُڑ جا اس گلستان سے
کہ اس محفل سے خوشتر ہے کسی صحرا کی تنہائی

(بانگِ درا:۲۳۴)

اور اگر تو ضبطِ نوا پر قادر نہیں' تو کہنا مان' یہاں نہ رہ' پر پرواز پیدا کر اور اُڑ جا' یہاں کی محفل آرائیوں کے مقابلہ میں صحرا کی تنہائی ہزار درجہ غنیمت ہے۔

(۴۲)

دین ومذہب

حقیقت یہ ہے کہ لادینی قومیں، مادّی نقطۂ نظر سے خواہ کتنی ہی ترقی کرلیں، لیکن ان کے اخلاقی اقدار حددرجہ پست ورکیک ہوتے ہیں۔ یہ قومیں خدا کو نہیں مانتیں لہٰذا خدا کے بنائے ہوئے نظامِ حیات کو بھی تسلیم نہیں کرتیں، انھوں نے اپنے دماغ سے سوچ کر، کچھ ضابطے مقرر کرلیے ہیں، کچھ قاعدے بنالیے ہیں، ایک نظام تیار کردیا ہے اور سمجھ لیا ہے کہ کام ہوگیا۔ انسانیت سدھر گئی اور کائنات کے تمام دکھوں کا علاج ہوگیا۔

لیکن ان رہنمایانِ اقوام کے کردار وسیرت پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو بہت جلد یہ حقیقت واشگاف ہوجائے گی کہ یہ خود بہت زیادہ اخلاقی اعتبار سے علیل ومریض ہیں۔ جب انہیں کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے تو یہ خود اپنے بنائے ہوئے اصولوں پر بھی پوری نہیں اترتیں۔ جنگ سے متعلق "انسانی" نقطۂ نظر سے انھوں نے بہت سے قاعدے اور قانون بنا رکھے ہیں اور انہیں بین الاقوامی طور پر تسلیم بھی کیا جاچکا ہے لیکن جنگ شروع ہوتی ہے تو یہ ضابطے اور قاعدے بالائے طاق دھرے رہ جاتے ہیں اور بُری طرح ان کا بھرم کھل جاتا ہے:

بھرم کھل جائے گا ظالم ترے قد کی درازی کا
اگر اس طرۂ پرپیچ خم کا پیچ خم نکلے

جنگ کے زمانہ میں اس طرۂ پرپیچ خم کا پیچ خم نکل جاتا ہے اور حقیقت آئینہ کی طرح واضح ہوجاتی ہے۔ یہ قومیں، جنھیں اپنی انسانیت نوازی پر ناز ہے اور جنھیں اپنے بارے میں یہ غلط فہمی ہے کہ ان سے بڑھ کر انسان دوست کوئی نہیں جنگ کے زمانہ میں، ہسپتالوں پر بمباری کرنے سے نہیں چوکتیں۔ جاپان کے ہیروشیما پر بم پھینکنے والا کوئی غیر مہذب ملک نہ تھا، بلکہ دُنیا

کا سب سے بڑا اور مہذب ملک امریکہ تھا۔ جو لوگ اسیرانِ جنگ کی حیثیت سے شکنجۂ تعزیز‘ عقوبت میں کسے جاتے ہیں‘ ان کی داستانِ درد کسے نہیں معلوم؟ دوسری جنگ عظیم میں صرف ہٹلر‘ مسولینی‘ سٹالن اور ٹوجوہی نے اپنے جنگی قیدیوں کے ساتھ سفاکانہ‘ اور غیر انسانی اور لرزہ خیز برتاؤ نہیں کیا‘ امریکہ اور برطانیہ اور فرانس نے بھی موقع پانے کے بعد کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ ان لوگوں نے ایک اصول یہ بھی وضع کیا ہے کہ جو لوگ شکست کھا جائیں ان کی کمر توڑ دو، انہیں ذلیل کرو، انہیں عبرت انگیز سزا دو اور آغازِ جنگ سے پہلے کے جرائم میں انہیں متہم کرو اور خود صرف انہیں بلکہ ان کے متعلقین تک کو ناقابلِ برداشت سزا دو‘ تاکہ دوسرے سبق حاصل کریں۔ غور کیجیے‘ تو یہ سب کچھ کرشمہ ہے لادینی نظامِ حکومت اور اندازِ جہاں بانی کا۔

اسلام‘ ایک دین ہے‘ ایک مذہب ہے، ایک ضابطۂ حیات ہے اور اس کی یہ حیثیتیں کسی انسانی ذہن کی تخلیق نہیں ہیں بلکہ تمام تر خدا کے احکام و فرمان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف لفظ و عبارت کے لحاظ سے یہ آئین آسمانی ہے بلکہ اس پر عمل کرنے والوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ صرف آسمانی نظام ہی اتنا انسانیت دوست اور اتنا مکمل ہو سکتا ہے۔ ذرا تصور تو کیجیے آج سے چودہ سو برس پہلے کی جنگوں کا‘ اس وقت نہ کوئی برطانیہ تھا نہ امریکہ‘ نہ فرانس‘ نہ روس‘ ساری دُنیا پر عام طور پر اور عرب خطہ پر خاص طور پر جنگل کی حکومت کارفرما تھی‘ جو میدانِ جنگ میں گرفتار ہوا وہ یا قتل کر ڈالا گیا یا غلام بنا لیا گیا۔ لیکن اسلام‘ ایک خدائی مذہب نے اسے یکسر بدل ڈالا۔ اس نے اعلان کر دیا جنگ کے دوران میں کسی عورت کو‘ کسی بچہ کو‘ کسی بوڑھے کو‘ اور کسی غیر جنگ آزما شخص کو‘ خواہ وہ کتنا ہی تندرست و توانا ہو اور جنگ کی غیر معمولی صلاحیتوں سے کیوں نہ بہرہ ور ہو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ کسی درخت کو نہیں کاٹا جا سکتا‘ کسی کھیت کو نہیں جلایا جا سکتا‘ کوئی مکان نہیں ڈھایا جا سکتا‘ کسی پر ناقابلِ برداشت تاوانِ جنگ نہیں عائد کیا جا سکتا۔ صرف مالِ غنیمت ہی کو تاوانِ جنگ خیال کیا جا سکتا ہے‘ اور جنگ ختم ہونے کے بعد‘ جو لوگ میدانِ جنگ میں گرفتار ہوں‘ ان کے ساتھ صرف دو ہی سلوک کیے جا سکتے ہیں:

ا۔ یا تو فدیہ لے کر انہیں رہا کر دیا جائے۔

۲۔ یا احسان رکھ کر انہیں آزادی عطا کر دی جائے۔

اس کے سوا کوئی تیسری صورت اسلام نے نہیں تجویز کی۔ مکہ میں ۱۲ سال تک جن لوگوں نے رُوح فرسا اذیتیں رسالت مآب کو پہنچائی تھیں اور مسلمانوں پر خواب وخور حرام کردیا تھا، جنھوں نے دعوت اسلام کو ناکام بنانے کے سلسلے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا اور ہر ننگ انسانیت حرکت کا مظاہرہ کیا تھا، ایسی حرکتیں اگر وہ آپ کے زمانہ میں کرتے، تو امریکہ، برطانیہ، فرانس اور روس مل کر ان سب کو مجتمع کرتے اور ان پر ہائیڈروجن بم کی مشق کردیتے، لیکن ایک آسمانی مذہب کے پیغمبرؐ نے ایسا نہیں کیا۔ اسؐ نے بھرے مجمع میں ان خطاکاروں اور بدنہادوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

لا تثریب علیکم الیوم فاذاهبوا کلکم احرار

آج کے دن پر کوئی الزام نہیں ہے، جاؤ تم سب آزاد ہو

جو لوگ یہ سوچ کر جمع ہوئے تھے کہ مرنے کے لیے جا رہے ہیں، وہ زندگی کی سوغات لے کر اپنے گھر واپس آ گئے ۔۔۔ صلی اللہ علیہ وسلم

یہ تھیں وہ چیزیں، جنھوں نے اقبال کے دل میں گھر کرلیا تھا اور وہ دُنیا کو یہ دعوت دینے پر مجبور ہو گئے تھے کہ وہ اسلام کے بتائے ہوئے راستہ پر چلے اور مسلمانوں سے تو وہ صرف یہی ایک حرف بار بار نئے لہجہ اور نئے الفاظ میں کہا کرتے تھے۔

ہو تری خاک کے ہر ذرّہ سے تعمیرِ حرم
دل کو بیگانۂ اندازِ کلیسائی کر

(بانگِ درا:۲۷۹)

جب تک تو اے مردِ مسلمان اپنے دل کو فرنگی اثر سے آزاد نہیں کر لیتا، تیری خاک کے ذرّے تعمیرِ حرم کا فریضہ انجام نہیں دے سکتے، حالانکہ ضرورت اسی کی ہے کہ وہ صرف اسی میں لگے رہیں۔

پھر اُبھارتے ہیں:

اے رہرو فرزانہ رستے میں اگر تیرے
گلشن ہے تو شبنم ہو، صحرا ہے تو طوفاں ہو (بانگِ درا:۲۸۰)

جانتے ہیں اور ہر اہلِ دل کو بتاتے ہیں کہ دارالامان صرف رحمت اللعالمین کا دامن ہے، اور کچھ نہیں۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

(بانگِ درا:۲۸۱)

اپنا جائزہ لیتے ہیں تو کہتے ہیں:

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدۂ زخم ہائے عجم رہا
وہ شہیدِ ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی (بانگِ درا:۲۸۲)

مسلمان کو یقین دلاتے ہیں:

اے مسلماں ہر گھڑی پیشِ نظر
آیہ لاَ یُخْلِفُ الْمِیْعَاد رکھ (بانگِ درا:۲۸۳)

اور جب دیکھتے ہیں مسلمان اس سبق سے غافل ہے تو بادِ صبا کو پیامبر بناتے ہیں:

اے بادِ صبا! کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا، دُنیا بھی گئی

(بانگِ درا:۲۷۷)

پھر مسلمان سے مخاطب ہوتے ہیں، اپنا اور اس کا تقابل کرتے ہیں:

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری، تو قتیل شیوۂ آزری
میں نوائے سوختہ در گلو، تو پریدہ رنگ رمیدہ بو،
میں حکایتِ غمِ آرزو، تو حدیثِ ماتمِ دلبری
مرا عیش غم، مرا شہد سم، مری بود ہم نفسِ عدم
ترا دل حرم، گرو عجم، ترا دیں فریدۂ کافری!

(بانگِ درا:۲۵۲)

(۴۳)

کچھ اپنے متعلق

پیامِ مشرق اقبال کی معرکہ آرا کتابوں میں ہے یہ وہی دیوان ہے جو شاعر المانوی (جرمنی) گوئٹے کے جواب میں اقبال کے قلم سے نکلا ہے اس کے دیباچہ میں اقبال کہتے ہیں۔

"پیامِ مشرق" کی تصنیف کا محرک جرمن "کلیم حیات" گوئٹے کا مغربی دیوان ہے جس کی نسبت جرمنی کا اسرائیلی شاعر ہائنا لکھتا ہے کہ "یہ ایک گلدستۂ عقیدت ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے۔ اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینہ سے حرارت کا متلاشی ہے۔"

آگے چل کر علامہ فرماتے ہیں:

"۱۸۱۲ء میں فان ہیمر نے خواجہ حافظ کے دیوان کا پورا ترجمہ شائع کیا اور اسی ترجمہ کی اشاعت سے جرمن ادبیات میں مشرقی تحریک کا آغاز ہوا حافظ کے ترنم نے اس کے (گوئٹے کے) تخیلات میں اک ہیجان عظیم برپا کر دیا۔ بعض بعض جگہ اس کی نظم خواجہ حافظ کے اشعار کا آزاد ترجمہ معلوم ہوتی ہے۔ گوئٹے کا سوانح نگار بنل سوشکی لکھتا ہے۔۔ بلبل شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی۔ اس کو کبھی کبھی یہ احساس ہوتا تھا کہ شاید میری روح حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے۔

حافظ کے علاوہ گوئٹے اپنے تخلیات میں عطار، سعدی، فردوسی اور عام

اسلامی لٹریچر کا بھی ممنون احسان ہے' ایک آدھ جگہ ردیف وقافیہ کی قید سے غزل بھی لکھی ہے' اپنی زبان میں فارسی استعارات بھی' مثلاً گوہر اشعار' تیر مژگان' زلف گرہ گیر بے تکلف استعمال کرتا ہے' بلکہ فارسیت کے جوش میں امرد پرستی کی طرف اشارات کرنے سے بھی احتراز نہیں کرتا' اس کے دیوان کے مختلف حصوں کے نام بھی فارسی ہیں مثلاً مغنی نامہ' ساقی نامہ' عشق نامہ۔

پھر علامہ اپنے دیوان ''پیامِ مشرق'' کے بارے میں فرماتے ہیں:

''پیامِ مشرق'' مغربی دیوان سے سو سال بعد کہا گیا ہے۔ اس کا مدّعا زیادہ تر ان اخلاقی' مذہبی اور ملی حقائق کو پیش کرنا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے' سو سال پیشتر کے جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ مماثلت ضرور ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب ایک بہت بڑے رُوحانی اور تمدّنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دُنیا کے نظام کو تقریباً اس پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب وتمدن کی خاکستر سے فطرت ایک نیا آدم اور ایک نئی دُنیا تعمیر کر رہی ہے۔ مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے خودی میں کسی قسم کا انقلاب نہیں پیدا کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دُنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو' فطرت کا یہ اٹل قانون' جس کو قرآن نے **ان اللّٰہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا مابانفسھم** کے سادہ اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ میں نے اپنے فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی

کوشش کی ہے۔"

اقبال نے جو دیباچہ پیامِ مشرق کا لکھا ہے اس کا خلاصہ انہی کے الفاظ میں ہم نے پیش کر دیا ہے۔ اس سے یہ آسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ پیامِ مشرق کا محرک کیا ہے؟ کس فضا اور کن حالات میں اقبال کی زبان پر' یہ اشعار نازل ہوئے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ "پیامِ مشرق" اپنی اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے' اپنے پیام اور روح کی حیثیت سے اپنے فکر و خیال کے لحاظ سے' ایک مقامِ خاص پر فائز ہے۔ جس زمانہ میں "پیامِ مشرق" منظر عام پر آئی ہے (۱۹۲۳ء) اس وقت غازی امان اللہ خاں کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ اسلامی دُنیا میں ایک ہیرو کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے فرنگی استعمار کے پنجہ سے اپنے ملک کو نیا نیا آزاد کرایا تھا۔ ان کے ولولے تازہ تھے، حوصلہ بلند تھے، ہر شخص انہیں عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتا تھا اور ہندوستان کے مظلوم و غلام مسلمان تو خاص طور پر انہیں آیت من آیات اللہ سمجھ رہے تھے۔ اقبال نے اپنی یہ معرکہ آرا کتاب انہی کے نام معنون کی۔

یہ تہدیہ بڑا دلکش ہے' شاعر نے ایک ایک شعر میں اپنی روح سمو دی ہے۔ اس وقت امان اللہ خان کی شخصیت اور ان کے بارے میں اقبال کے خیالات سے ہمیں بحث نہیں ہے یہ ایک الگ موضوع ہے۔ اور خدا کو منظور ہوا تو اس پر کسی دوسری مجلس میں گفتگو ہو گی۔ اس کتاب میں ہم جو چیز زیرِ بحث لائیں گے وہ وہی ہو گی جس کا تعلق اقبال کی ذات سے ہے' یا ان خیالات سے جو اقبال نے وقتاً فوقتاً اپنے بارے میں ظاہر کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں ضمنی طور پر' اگر کچھ اور مباحث آ جائیں تو دوسری بات ہے کیونکہ اس کتاب میں' ہم جو کچھ بتانا چاہتے ہیں وہ یہی ہے کہ اپنے اشعار کے آئینہ میں اقبال کیسے دکھائی دیتے ہیں؟ یعنی کلام اقبال پڑھ کر اگر کوئی شخص اقبال کو پرکھنا' جانچنا اور جاننا چاہے تو وہ کیا رائے قائم کرے گا؟

اقبال "پیامِ مشرق" کا نذرانہ لے کر' شاہ افغانستان' امان اللہ خاں غازی کے حضور میں گویا پہنچے ہیں اور ایک عقیدہ مدحیہ کے ساتھ اسے پیش کرتے ہیں۔ اس وقت وہ سراپا جذبات بنے ہوئے ہیں۔ اس لیے کہ جانتے ہیں میری بات اگر اس کے دل میں اتر گئی تو کام

بن گیا' میں فقیر بے نوا ہوں' صرف نغمہ سرائی کرسکتا ہوں۔ یہ تاجدار اور شہریار ہے' جو چاہے کرسکتا ہے میرے افکار وخیالات کو عملی جامہ بھی پہنا سکتا ہے۔ میرے پیش کردہ نظام کو صرف یہی بروئے کار لاسکتا ہے، جو خواب میں ایک عرصہ سے دیکھ رہا ہوں اور جو میری زندگی کا مقصد بن چکا ہے، اس کی تعبیر اس شاہ کج کلاہ کے ہاتھ میں ہے۔

لیکن میری بات اس کے دل میں اس وقت تک نہیں اتر سکتی جب تک یہ میرے ظاہر و باطن سے' میری صورت اور سیرت سے' میری گفتار و کردار سے واقف نہ ہو جائیں۔ اگر اس نے مجھے صرف ایک قصیدہ گو شاعر سمجھا تو کیا سمجھا؟ پھر نہ میرا مقصد حاصل ہوگا نہ یہ کوئی ترقی کرسکے گا۔ لہٰذا اس قصیدہ میں کافی زور اس پر لگاتے ہیں کہ صحیح طور پر اپنا تعارف کرا دیں' تاکہ غازی امان اللہ خاں مغالطہ میں نہ رہیں۔ شاعر کے اصل مقام اور حیثیت سے آشنا ہو جائیں' اپنے تعارف پر جو زور انھوں نے صرف کیا ہے' وہ تعلّی اور خودستائی کے لیے نہیں بلکہ ایک نیک اور اچھے مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے۔

بادشاہ کی تعریف و توصیف سے عہدہ برآ ہونے کے بعد یہ کہتے ہیں:

تا مرا رمزِ حیات آموختند
آتشے در پیکرم افروختند

(پیامِ مشرق:۱۴)

خدا نے مجھے رمزِ حیات کا محرم بنادیا ہے اور میرے تن میں ایسی آگ بھردی ہے جس نے مجھے شعلہ بنادیا ہے۔

یک نوائے سینہ تاب آوردہ ام
عشق را عہدِ شباب آوردہ ام

(پیامِ مشرق:۱۶)

اور اس شعلہ نے مجھے نوائے سینہ تاب عطا کردی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں نے عشق کو جو مردہ دلوں میں رہ کر مردہ افسردہ ہو چکا تھا عہدِ شباب عطا کیا ہے۔ اب پھر وہ جوان ہے اور اس میں امنگ ہے' حوصلہ ہے' ولولہ ہے' حصول مقصد کی تڑپ ہے۔

اس کے بعد وہ گوئٹے کا تعارف بادشاہ سے کراتے ہیں:

پیرِ مغربؔ شاعرِ المانوی
آں قتیلِ شیوہ ہائے پہلوی

(پیامِ مشرق:۱۶)

جرمنی کا شاعر بے بدل۔۔۔گوئٹے جو فارسی ادبیات اور شعروسخن کا دلدادہ تھا

بست نقشِ شاہدانِ شوخ وشنگ
داد مشرق را سلامے از فرنگؔ

(پیامِ مشرق:۱۶)

اس نے مغربی دیوان لکھ کر' مشرق کی خدمت میں سلام کا نذرانہ پیش کیا ہے۔

در جوابش گفتہ ام پیغامِ شرقؔ
ماہتابے ریختم برشام شرقؔ

(پیامِ مشرق:۱۶)

میں نے "پیامِ مشرق" اس کے جواب میں لکھا ہے اور یہ لکھ کر مشرق کی اندھیری رات میں چاند جگمگا دیا ہے۔

اب' اپنا اور گوئٹے کا تقابل کرتے ہیں۔

اوز افرنگی جواناں مثلِ برق
شعلہ من از دمِ پیرانِ شرقؔ

(پیامِ مشرق:۱۶)

وہ فرنگ کا رہنے والا تھا' چالاک' چست' برق جہندہ میرا شعلہ' پیرانِ مشرق کے فیضِ صحبت کا نتیجہ ہے۔

او چمن زادے چمن پروردۂ
من دمیدم از زمینِ پژمردۂ

(پیامِ مشرق:۱۶)

وہ ایک زندہ قوم کا فرد تھا' ایک زندہ قوم کے آغوش میں اس نے تربیت پائی تھی۔ وہ بے جھجک تھا، بے باک تھا' من چلا تھا، میں ایک مردہ زمین میں پیدا ہوا ہوں، زندگی سے نا آشنا، زندگی کی امنگوں سے محروم' زندگی کی تڑپ سے خالی۔۔۔ یہی تو خصوصیت ہے اس زمین کی۔

او چو بلبل در چمن "فردوسِ گوش"
من بہ صحرا چوں جرس گرمِ خروش

(پیامِ مشرق:١٦)

وہ بلبل کی طرح چمن میں نغمہ سرائی کرتا تھا' چہچہاتا تھا' اس پر کوئی پابندی نہیں تھی' اسے کوئی پروا نہیں تھی، کسی طرح کا اندیشہ نہیں تھا، ہر قسم کی فکر سے اس کا دماغ خالی تھا' جو کچھ کہتا تھا' اس کی قوم گوش ہوش سے سنتی تھی، اس کی آواز پر کان دھرتی تھی، اس کی ترنم ریزیوں سے لطف لیتی تھی، اس کی نغمہ سرائی کا اثر قبول کرتی تھی، اس کے پیام پر کان دھرتی تھی، اس کی بات مانتی تھی، میری یہ حالت ہے کہ جس طرح صحرا اور ریگستان میں گھنٹہ بجتا ہے جس کی آواز کوئی نہیں سنتا' جس کی آواز کا جواب کوئی نہیں دیتا' صحرا میں سننے والے' ماننے والے' جواب دینے والے کہاں سے آئیں۔ میں بھی جرس کی طرح اگرچہ سرگرمِ فغاں ہوں لیکن بے نتیجہ'

گوش سخن شنوئی؟ دیدۂ اعتبار تو
صحرا اور ریگستان میں لاکھ ترنم ریزیاں کروں لیکن ان کا حاصل؟

ہر دو خنجر صبح خندٔ آئینہ فام
او برہنہ ، من ہنوز اندر نیام

(پیامِ مشرق:١٦)

میں اور گوئٹے' فکر وخیال کے اعتبار سے یکساں بلندی پر فائز ہیں۔ ہم دونوں خنجر براں کی مانند' صیقل زدہ اور با آب وتاب ہیں۔ لیکن وہ ایک آزاد قوم کا فرد ہے۔ اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شمشیر عریاں، میں بھی شمشیر آبدار ہوں' خنجر براں ہوں' میری کاٹ کا بھی

کوئی جواب نہیں۔ میری آب وتاب سے ہی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن میں ایک غلام ملک کا باشندہ ہوں' ایک غلام قوم کا فرد ہوں' لہٰذا میری مثال اس شمشیر کی مانند ہے جو نیام کے اندر ہو، جسے نیام کے اندر سے باہر نکلنے اور اپنے جوہر دکھانے کا موقعہ نہ ملا ہو۔ میرے خیالات سے' میرے فکر بلند سے' میرے پیام سے غفلت برتی جاتی ہے۔ مجھے ہیچ سمجھا جاتا ہے۔ میں اگرچہ تلوار ہوں لیکن زنگ آلود تلوار کی طرح اب تک کونے میں پڑا ہوں۔

آگے چل کر اس مفہوم کو اور زیادہ دل دوز انداز میں بیان کرتے ہیں:

ہر دو گوہر ارجمند و تاب دار
زادۂ دریائے ناپیدا کنار
روز شوخی در تہِ قلزم تپید
تا گریبانِ صدف را بردرید

(پیامِ مشرق:۱۶)

من بآغوشِ صدف تابم ہنوز
در ضمیر بحرِ نایابم ہنوز

(پیامِ مشرق:۱۷)

یعنی ہم دونوں ایک ہی دریائے ناپیدا کنار کے گوہر ارجمند ہیں۔ لیکن دونوں کا نصیب الگ الگ اور مقدور جدا جدا ہے۔ وہ دریا کی تہ میں مچلا اور گریبانِ صدف کے اس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور میں آغوشِ صدف میں اب تک محبوس ہوں۔ میری چمک اور آب و تاب رائیگاں جا رہی ہے۔ نہ کوئی دیکھنے والا ہے نہ کوئی پوچھنے والا۔

آشنائے من زمن بیگانہ رفت
از خمستانم تہی پیمانہ رفت

(پیامِ مشرق:۱۷)

میرا کوئی آشنا نہیں اور جو ہے بھی' وہ آشنا ہونے کے باوجود' میرے لیے اجنبی اور غیر ہے۔ اس لیے کہ مجھے پہچانتا نہیں نہ میری آواز کو' نہ میرے پیام کو' وہ میرے خم کدہ میں آتا

ہے لیکن اپنا پیمانہ خالی واپس لے جاتا ہے۔ یہ پیمانہ بھرے تو اس وقت جب وہ میری شرابِ فکر کا جلوہ دیے۔

من شکوہِ خسروی اورا دہم
تختِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم

(پیامِ مشرق:۱۷)

میں تو اسے شکوہ خسروی عطا کرتا ہوں، تخت کسریٰ اس کے قدموں کے نیچے لا کر ڈال دیتا ہوں، یعنی اگر وہ میری بات سمجھے، میرے پیام پر غور کرے اور اپنی زندگی اس انقلاب سے آشنا کرے، جو میں لانا چاہتا ہوں تو وہ شکوہ خسروی اور تخت کسریٰ کا مالک بڑی آسانی سے بن سکتا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں کرتا، بلکہ

او حدیثِ دلبری خواہد زمن
رنگ و آبِ شاعری خواہد زمن

(پیامِ مشرق:۱۷)

وہ چاہتا ہے کہ میں اسے عشق و ہوس کی داستانیں نظم کر کر کے سناؤں، اس میں اسلامیت کی جو روح میں پیدا کرنا چاہتا ہوں اس سے دستبردار ہو جاؤں اور اسے عیش و عشرت، فسق و معصیت، نجاست اور آلودگی کی زندگی کی طرف راغب کروں۔ اس وقت کے دوسرے شعراء جس طرح ہوسنا کی اور رندی، عیاشی اور عشرت پسندی کے خیالات، دل آویز انداز میں پیش کرتے ہیں، میں بھی وہی کروں۔

کم نظر بیتابیِ جانم نہ دید
آشکارم دید و پنہانم نہ دید

(پیامِ مشرق:۱۷)

اس نے میری بیتابی جان پر نظر نہ ڈالی صرف میرا سراپا دیکھنے پر اکتفا کیا۔ اس نے یہ تو دیکھ لیا کہ میں شاعر ہوں، لیکن میرا پیام کیا ہے؟ اس پر غور نہ کر سکا۔ اس نے یہ دیکھ لیا کہ میں ساز ہوں، لیکن میرے اندر سے لے کس طرح کی نکلتی ہے، یہ اس نے کبھی نہیں سوچا۔ اس

نے اپنی عیش وعشرت کی فکر رکھی، میری تاب وتواں اور سوز وساز کی طرف ذرا بھی راغب نہ ہوا۔

حق رموزِ ملک ودیں برمن کشود
نقشِ غیر از پردۂ چشمم ربود

(پیامِ مشرق:۱۷)

خدا نے ملک ودیں کے اسرار ورموز مجھ پر فاش کرائے، حکمرانی کس طرح ہوتی ہے؟ قومیں کس طرح بنتی ہیں؟ ملتوں کی تعمیر کیوں کر ہوتی ہے؟ انقلاباتِ عالم سے کیا سبق ملتا ہے؟ ملتِ اسلامیہ اپنی وضع وتشکیل میں کس اسلوب خاص کی حامل ہے؟ یہ ساری باتیں خدائے بزرگ وبرتر نے مجھ پر فاش کردیں اور دوسروں کے شکوہ وتجمل کا رعب میرے دل سے ہٹالیا۔ کوئی غیر الٰہی طاقت، کوئی لادینی نظام کوئی بادشاہ، جو اصولِ اسلام سے تعلق نہ رکھتا ہو، میری نظر میں نہ اس کی کوئی وقعت ہے نہ اہمیت

برگِ گل رنگین زمضمونِ من است
مصرعۂ من قطرۂ خونِ من است

(پیامِ مشرق:۱۷)

اور میں کسی دوسرے کی پرواہی کیوں کروں؟ خدا کا دیا میرے پاس کیا نہیں ہے؟ یہ برگِ گل کی رنگینی جس سے خلقت کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں کہاں سے آتی ہے؟ میرے مضمون سے یہ رنگین لباس میرے کلام رنگیں ہی نے تو برگِ گل کو پہنایا ہے۔ میری زبان سے جو شعر نکلتے ہیں وہ صرف تک بندی نہیں ہوتی، قافیہ پیائی نہیں، موزونی طبع کا مظاہرہ نہیں ہوتا، بلکہ میرا ہر مصرعہ میرے خونِ جگر کا ایک قطرہ ہوتا ہے اور

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعت مژگانِ یار تھا

کیا یہ کائنات میں کسی چیز سے کچھ کم حیثیت رکھتا ہے؟

از ہنر سرمایہ دارم کردہ اند
در دیارِ ہند خوارم کردہ اند (پیامِ مشرق:۱۷)

قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو' ایک طرف تو مجھے صاحب ہنر بنایا' دوسری طرف ایسے ملک میں پیدا کر کے خوار و رسوا کیا جہاں با ہنر ہونا عیب ہے۔

لالہ و گل از نوایم بے نصیب
طائرم در گلستانِ خود غریب!

(پیامِ مشرق:۱۷)

میرے نوا سنجی سے' میرے چمن کے لالہ و گل لطف نہیں لیتے۔ فائدہ نہیں اٹھاتے' میرا طائر فکر خود اپنے چمن میں اجنبی ہے۔۔۔ کیا یہ بہت بڑی ٹریجڈی نہیں؟ کیا اس سے بڑا بھی کوئی المیہ ہو سکتا ہے؟ اور بات تو یہ ہے کہ:

بس کہ گردوں سفلہ دوں پرور است
وائے بر مردے کہ صاحب جوہر است

(پیامِ مشرق:۱۷)

جب حال یہ ہے' تو پھر شکایت کیوں ہے اور شکوہ کیوں زبان پر لایئے۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے یہ نہ سوچا کہ پیر گردوں ہمیشہ سے سفلہ پرور ہے۔

(۴۴)

سوز و ساز آرزو

اقبال ہی نے کہا تھا

الٰہی تیرا جہان کیا ہے نگار خانہ ہے آرزو کا

لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ جہانِ گزراں نگار خانہ آرزو ہو یا نہ ہو، لیکن شاعر۔۔ قبال ۔۔۔۔۔کا دل ضرور تھا، اس کا دل سچے معنوں میں محشر ستانِ جذبات اور نگار خانہ آرزو بنا ہوا تھا، یہی آرزو تھی جو اسے حسن بو پریشان رکھتی تھی، یہی حسرت تھی، جس نے اسے آشفتہ اور حیران و پریشان کر رکھا تھا۔ وہ اس سے بے نیاز تھا کہ آرزو پوری ہوتی ہے یا نہیں، وہ اس کی پروا بھی نہیں کرتا تھا۔ آرزو کی تعیین کرلے۔ معلوم یا نامعلوم آرزو کی، سوز وساز میں زندگی گزار دینا، بجائے خود ایک مقصد ہے ایک منزل ہے اور وہ اسی طرف رواں دواں اور اسی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا۔ آرزو کی لذت بجائے خود بہت بڑی نعمت ہے، خواہ وہ پوری ہو یا نہ خواہ اس کا حصول ممکن ہو یا نہ ہو۔ اقبال کی زندگی شرارہ آرزو بن کر رہ گئی تھی۔ کبھی یہ شعلہ بھڑک اٹھتا تھا، کبھی افسردہ ہو جاتا تھا۔ جب بھڑکتا تھا، تو جان و تن کو خاک کر دیتا تھا۔ جب افسردہ ہوتا تھا تو بھی اس کی تب و تاب خورشیدِ جہاں تاب سے چشمک زن رہتی تھی۔

اقبال کی زندگی پر ایک نظر ڈالی جائے تو ایسا محسوس ہوگا، ان کی زندگی کا ہر دور، خواہ لب علمی کا ہو، قیام ہند کا ہو، یا انگلستان اور جرمنی کا، پروفیسری کا دور ہو یا بیرسٹری کا، مفکر کی حیثیت سے وہ روشناس ہو یا شاعر کی حیثیت سے۔ سیاست دان بن کر نظر آئے ہوں، یا لحسلٹو کونسل کے ممبر بن کر، گول میز کانفرنس لندن میں شرکت کی ہو یا دیار اندلس (اسپین) کے

گورنر بن کر الحمراء اور قصر زہرا' غرناطہ اور قرطبہ کے گلی کوچوں اور بام و در کا گشت کر رہے ہوں، عطیہ بیگم سے خط و کتابت کرتے نظر آتے ہوں' یا علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا شاہ سلیمان پھلواروی' اکبر الہ آبادی اور دوسرے مشاہیر سے نامہ و پیام میں مصروف ہوں، مسلم کانفرنس کے اسٹیج پر تقریر کر رہے ہوں یا مسلم لیگ کا خطبۂ صدارت پڑھ رہے ہوں، ہندو استبداد سے مسلمانوں کو نجات دلانے کے وسائل پر غور کر رہے ہوں یا پاکستان کا تخیل پیش کر کے اسے عملی جامہ پہنانے کی ترغیب ملّتِ اسلامیہ کو دے رہے ہوں، فلسطین میں عرب یہود کشمکش کے ہولناک اور جگر خراش مناظر دیکھ رہے ہوں یا عالمِ اسلام کے حالِ زار پر خون کے آنسو رو رہے ہوں۔ مسلمانوں میں ''نیشنلزم'' قومیت' وطنیت'' اور اصولِ اسلام سے بیزاری کے مظاہر دیکھ رہے ہوں یا بعض عربی ممالک کے نوجوانوں کی اولوالعزمیاں ان کی رگوں میں نیا خون پیدا کر رہی ہوں' خلافت اسلامیہ ترکیہ مٹ رہی ہو یا ایران پر تباہی' بربادی اور ہلاکت کے بادل منڈلا رہے ہوں' یا عراق ہوسِ فرنگ کا تختۂ مشق بن رہا ہو یا شام و لبنان پر فرانس کے طیارے بمباری کر رہے ہوں ہر دور ہر حال اور ہر عہد میں اقبال کا وجود سراپا اضطراب رہا ہے۔

یہ سچ ہے کہ اقبال نے کبھی کسی تحریک میں عملی حصہ نہیں لیا' یا کم از کم یہ کہ قید و بند کی منزل تک وہ شریک نہیں رہے۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ کم ہمت اور کم حوصلہ تھے۔ یہ تھا کہ وہ عملی آدمی نہیں تھے اور شاعر عملی آدمی ہوتا بھی نہیں' دُنیا کا سارا کام تقسیم عمل کے اصول پر چلتا ہے۔ ہر شخص نہ ہر کام کر سکتا ہے' نہ کرنا چاہیے۔ سیاست داں کا کام شاعر نہیں کر سکتا۔ شاعر کا کام لیڈر نہیں کر سکتا۔ دونوں کے راستے جدا جدا ہیں' ہوا ہیں' الگ ہیں' گو مقصد ایک ہی ہے۔ اقبال نے بے شک کسی تحریک میں عملی حصہ نہیں لیا، لیکن سیاسی تحریکوں کے لیڈروں سے کہیں بڑا کارنامہ انھوں نے انجام دیا۔ انھوں نے قوم کو مقصد دیا' منزل مقصود کی طرف رہنمائی کی، ایک نیا جذبہ دیا، بیداری پیدا کی۔ ''بھٹکے ہوئے آہو'' کو ''سوئے حرم'' پہنچا دیا اور یہ وہ کارنامہ ہے جو کسی لیڈر' کسی قائد' کسی رہنما سے نہیں وجود اس پر بجا طور سے اقبال فخر کر سکتے ہیں اور شاید انہیں فخر تھا ہی۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا' اقبال کی ساری زندگی تب وتاب میں گزری اور یہ میں ہی نہیں کہتا وہ خود کہتے ہیں۔

دریں گلشن پریشاں مثلِ بویم
نمی دانم چہ می خواہم' چہ جویم
برآید آرزو یا بر نیاید
شہیدِ سوز و ساز آرزویم

(پیامِ مشرق:۲۷)

☆

جب پیرِ فلک نے ورق ایام کا اُلٹا
آئی یہ صدا ، پاؤ گے تعلیم سے اعزاز!
آیا ہے مگراس سے عقیدوں میں تزلزل
دُنیا تو ملی' طائرِ دیں کر گیا پرواز
دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر، زمیں تاز
مذہب سے ہم آہنگی افراد ہے باقی
دیں زخمہ ہے، جمعیتِ مِلّت ہے اگر ساز
بنیاد لرز جائے جو دیوارِ چمن کی
ظاہر ہے کہ انجام گلستاں کا ہے آغاز

(بانگِ درا:۲۴۵)

(۴۵)

نگاہم برتر از گردوں تنم خاک

رباعی بڑا مشکل فن ہے' چار مصرعوں کے قطعہ اور چار مصرعوں میں بھی آخری مصرعہ کو رُوحِ کلام اور جانِ سخن بنا دینا' ہر شخص کا کام نہیں۔

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

ہر شاعر رباعی گو نہیں ہو سکتا اور ہو بھی تو کامیاب نہیں ہو سکتا' فارسی اور اردو کے شعراء کی فہرست بڑی طویل ہے اور اس طویل فہرست میں چند ہی ایسے نام ملیں گے جو اس باب میں امتیاز و اختصاص کے حامل ہیں۔

اقبال نے رباعیات پر بھی توجہ کی ہے اور حق تو یہ ہے کہ خوب کہی ہیں۔ سیاست' تصوف' فلسفہ' نفسیات' کونسا موضوع ہے جس کے سمندر کو انھوں نے رباعی کے کوزہ میں نہیں بند کیا ہے اور جہاں خودی اور خودنگری اور خودشناسی سے تعلق فرمایا ہے' وہاں تو' اتنے اونچے اُڑے ہیں کہ ہر کہ و مہ کی نظر بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی' ایسی دُور کی کوڑی لاتے ہیں اور ایسے پتہ کی بات کہتے ہیں کہ لطف آ جاتا ہے۔۔۔۔۔ فرماتے ہیں:

چو ذوقِ نغمہ ام در جلوت آرد
قیامت افگنم در محفلِ خویش
چومی خواہم دمے خلوت بگیرم
جہاں را گم کنم اندر دلِ خویش

(پیامِ مشرق: ۳۷)

اب ذرا اس رباعی سے اس رباعی کو ملا کر پڑھیے:

سریرِ کیقباد ، اکلیلِ جم خاک
کلیساؤ و تبستان و خرمِ خاک
دلیکن من ندانم گوہرم چیست
نگاہم برتر از گردوں ، تنم خاک

(پیامِ مشرق: ۳۶)

ہے کوئی جواب اس بات کا

نگاہم برتر از گردوں، تنم خاک

شعاعِ آفتاب

"خفتہ ہنگامے ہیں میری ہستی خاموش میں
پرورش پائی ہے میں نے صبح کی آغوش میں
مضطرب ہردم مری تقدیر رکھتی ہے مجھے
جستجو میں لذتِ تنویر رکھتی ہے مجھے
برقِ آتش خو نہیں فطرت میں گو ناری ہوں میں
مہرِ عالم تاب کا پیغامِ بیداری ہوں میں
سرمہ بن کر چشمِ انساں میں سما جاؤں گی میں
رات نے جو کچھ چھپا رکھا تھا دکھلاؤں گی میں،
تیرے مستوں میں کوئی جویائے ہوشیاری بھی ہے؟
سونے والے میں کسی کو ذوقِ بیداری بھی ہے"

(بانگِ درا: ۲۳۷)

(۴۶)

حال وقال

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر اپنی کیفیت بیان کرتا ہے، اپنے احوال مقامات کی طرف اشارہ کرتا ہے، اپنے واردات اور تاثرات کی جھلک دکھاتا ہے۔ جو دیدۂ بینا رکھتا ہے وہ دیکھ لیتا ہے اور تڑپ اٹھتا ہے' محسوس کر لیتا ہے، شاعر کس بلندی سے اپنا الہامی کلام سنا رہا ہے۔

اور جب اس پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو وہ تنہائی میں ہجوم پیدا کر لیتا ہے اور ہجوم میں تنہائی اختیار کر لیتا ہے' جو کچھ دل پر نازل ہوتا ہے' زبان پر آ جاتا ہے' جو پیام وہ اپنی قوم اور ملّت کو دینا چاہتا ہے' بے تامل' اور بے اندیشہ اسے پابندِ گفتار کر دیتا ہے، پھر وہ ایک نئی دُنیا میں پہنچ جاتا ہے اور اپنے ہر مخاطب کو اس دُنیا کا آدمی بنا دینا چاہتا ہے' جیسا خود ہے' چاہتا ہے' ایسا ہی ہر شخص ہو جائے' اس لیے نئے نئے طرز و اسلوب سے وہ اپنے مخاطب کو متوجہ کرتا ہے اور اس میں حوصلہ کی بلندی اور ہمت کی رفعت پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا ہے۔۔۔ کہتا ہے:

اگر در مشتِ خاکِ تو نہادند
دلِ صد پارۂ خوں نابہ بارے
ز ابرِ نو بہاراں گریہ آموز
کہ از اشکِ تو روید لالہ زارے

(پیامِ مشرق:۳۶)

اور پھر یہ پیام دے کر وہ خاموش نہیں بیٹھ جاتا اس میں اور زیادہ گرمی اور زیادہ شدت اور زیادہ جوش وخروش پیدا کرتا ہے۔ اصطلاحیں مختلف ہیں الفاظ بدلے ہوئے ہیں، انداز جدا ہے، اسلوب میں فرق ہے طرز میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، لیکن بات نہیں بدلتی، بات وہی ہے جہاں تھی بات وہی ہے جو تھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، کوئی تغیر نہیں ہوتا اور وہ بات کیا ہے؟ وہ پیام کیا ہے یہی کہ اس سینۂ خالی میں دل پیدا کرو دل میں شرارہ آرزو پیدا کرو اور شرار آرزو سے اپنے آپ کو بھی پھونک دو اور خاشاک غیر اللہ کو بھی خاکستر کر کے رکھ دو۔

تا یہ چنگاریٔ فروغ جاوداں پیدا کرے

(بانگِ درا:۲۶۰)

اقبال کے ہر پیام کا مقصد صرف یہی ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔ زندگی کی حقیقت و ماہیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں اور کتنی سچی بات فرماتے ہیں کہ:

دمادم نقش ہائے تازہ ریزد
بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است
بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

(پیامِ مشرق:۳۷)

اس طرح سے وہ بار بار مختلف حقائق کی طرف اپنے مخاطب کو متوجہ کرتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ نتیجہ حسبِ دل خواہ برآمد نہیں ہوا تو پھر اپنی بیزاری اور بےگانگی اس دُنیائے دوں سے بے پروائی اور بے تعلقی کے اظہار میں بھی تأمل نہیں کرتے اور اس بیزاری کے اعلان میں بھی گویا جاتے جاتے بھی وہ اہلِ چمن پر اپنا احسان دھر جاتے ہیں اور بتا جاتے ہیں کہ

نہ پیوستم دریں بستاں سرا دل
ز بندِ این و آں آزادہ رفتم

(پیامِ مشرق:۳۸)

چمنِ دہر سے میں نے اپنا دل نہیں اٹکایا اور یہ جو چناں وچنیں این وآں اور قیل و

قال کا چکر چلتا رہتا ہے' اس سے میں الگ ہی رہا۔

چو بادِ صبح گردیدم دمے چند
گلاں را آب و رنگے دادہ رفتم

(پیامِ مشرق:۳۸)

جس طرح بادِ صبحگاہی اور نسیمِ سحر سے پھولوں کی نئی آب وتاب اور رونق اور زندگی مل جاتی ہے، وہ اٹکھیلیاں کرتی آتی ہے اور نعمت بانٹتی ہوئی رخصت ہو جاتی ہے، اسی طرح میں نے بھی اس دُنیا میں تھوڑی مدت کے لیے ذرا دیر کے لیے پھولوں کو آب و رنگ کی نعمت عطا کی اور رخصت ہو گیا۔

انجم گردوں فروز

آہ! سیمابِ پریشاں ' انجمِ گردوں فروز
شوخ یہ چنگاریاں' ممنونِ شب ہے جن کا سوز
عقل جس سے سر بہ زانو ہے وہ مدّت ان کی ہے
سر گزشتِ نوعِ انساں ایک ساعت ان کی ہے
پھر یہ انساں آں سوئے افلاک ہے جس کی نظر
قدسیوں سے بھی مقاصد میں ہے جو پاکیزہ تر
جو مثالِ شمع روشن محفلِ قدرت میں ہے
آسماں اک نقطہ جس کی وسعتِ فطرت میں ہے

(بانگِ درا:۲۳۲)

(۴۷)

نوائے سادہ

شاعر یہ دُنیا دیکھتا ہے، یہاں کے لوگوں کو دیکھتا ہے اور ان لوگوں کے قائم کیے ہوئے معیار سود و زیاں کو دیکھتا ہے اور حیران رہ جاتا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں کہاں آ کر پھنس گیا ہوں، میں جو کچھ سوچتا ہوں اس سے یہ دُنیا کتنی مختلف ہے، دُنیا کے سارے لوگ کتنے الگ ہیں؟ شاید یہ لوگ میری بات سمجھ ہی نہیں سکتے؟ یا شاید میں ان کے درمیان بالکل اجنبی ہوں، یہ میرے رازداں نہیں ہو سکتے، میں ان کا ہم زبان نہیں بن سکتا، یہ کچھ اور ہیں میں کچھ اور ہوں، ان کے سوچنے کا طرز کچھ اور ہے، میرا اندازِ فکر الگ۔

لیکن مجھ میں اور ان میں ایک فرق اور بھی ہے اور وہ بہت بڑا فرق ہے، اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، وہ فرق ہے کہ میں اس وسیع و عریض دُنیا میں بالکل تنہا ہوں، نہ میرا کوئی ہم نفس ہے نہ ہم زباں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں دُنیا کو اپنی نگاہ سے نہیں دوسروں کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہوں۔

ز خوب و زشت تو ناآشنایم
عیارش کردهٔ سود و زیاں را
دریں محفل زمن تنہا ترے نیست
بہ چشمِ دیگرے بینم جہاں را

(پیامِ مشرق: ۴۳)

(۴۸)

منزل

منزل -------- یہ ایک لفظ ہے' اس کا مفہوم معروف و متعین ہے' کون ہے جسے منزل مقصود تک پہنچنے کی دھن نہ ہو؟ اس زندگی کا مقصد کیا ہے؟ یہی تو کہ انسان اپنی منزل تک پہنچ جائے۔ ہر شخص کی منزل جدا ہوتی ہے' کوئی غریب سے لکھ پتی بننا چاہتا ہے' کوئی لکھ پتی ہے کروڑ پتی بننا چاہتا ہے۔ کوئی جاہل ہے' عالم بننا چاہتا ہے' کوئی عالم ہے' فاضل بننا چاہتا ہے' کسی کو بیرسٹری کی دھن ہے' کسی کو ججی کی، کوئی خطاب حاصل کرنا چاہتا ہے' کوئی صنعت کار بننا چاہتا ہے' کسی کو آرزو ہے کہ محبوب و مطلوب کو حاصل کرے اور اس کے پہلو میں ساری زندگی گزار دے، کسی کو فراق میں لذّت ملتی ہے' لطف آتا ہے' وہ وصل سے کتراتا ہے اور فراق و سحر کی مدت کو زیادہ سے زیادہ طول دینا چاہتا ہے' کسی کو قائد اور افسر بننے کی ہوس ہے، کوئی زمامِ اقتدار و اختیار اپنے ہاتھ میں لینے کا متمنی ہے، کوئی کسی معمولی عہدے پر فائز ہے' اور بڑے سے بڑے منصب پر فائز ہو جانے کی آرزو میں بے قرار ہے۔

غرض جس طرح انسان اپنے رنگ کے اعتبار سے' نسل کے اعتبار سے' خاندان کے اعتبار سے، ملک' وطن اور قوم کے اعتبار سے' دوسرے انسان سے الگ ہے' اسی طرح اپنے مقصد کے اعتبار سے بھی وہ دوسروں سے جدا ہے۔ ہر شخص اپنا ایک خاص مقصد رکھتا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے وہ سراپا جہد و عمل بنا ہوا ہے۔ جب تک وہ اپنا مقصود نہیں حاصل کر لیتا' یعنی اپنی منزل تک نہیں پہنچ جاتا' اسے کسی چیز میں لطف نہیں آتا، کسی پہلو قرار نہیں آتا۔

لیکن اس دُنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو منزل کو کوئی خاص حیثیت اور اہمیت نہیں

دیتے' بلکہ کبھی کبھی تو سنگ راہ سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں' جنہیں بارگاہِ الٰہی کی طرف سے جنون' یا عشق' یا جستجو کی نعمت عطا فرمائی گئی ہے۔ان کا خیال ہے اگر ہم منزل تک پہنچ گئے تو فنا ہو گئے۔ جذبہ ختم' جستجو ناپید' حرارت نابود' عشق قصہ ماضی' جنون' ایک داستان بے معنی۔۔۔یہ لوگ اپنی منزل کو راہ کا روڑا سمجھتے ہیں' اسے حاصل کرنے کی' اس تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے' اس سے گھبراتے ہیں۔اسے اچھے الفاظ میں یاد تک نہیں کرتے' اقبال کہتے ہیں:

مگو از مدّعائے زندگانی
ترا بر شیوہ ہائے او نگہ نیست
من از ذوقِ سفر آں گونہ مستم
کہ منزل پیشِ من جز سنگِ رہ نیست

(پیامِ مشرق:۴۵)

اے شخص۔۔۔۔۔!
تو زندگی کا مقصد اور مدعا کیا جانے؟ زندگی کے شیوہ ہائے گوناگوں پر تیری نظر کب ہے؟

میرا حال تو یہ ہے کہ میں ذوقِ سفر میں مست ہو رہا ہوں۔میرا مقصد یہ ہے کہ بس چلتا رہوں' چلتا رہوں، قرار نہ ہو' قیام نہ ہو، میرے سامنے اگر منزل آ جاتی ہے تو میں اسے سنگِ راہ سمجھنے لگتا ہوں' اسے ٹھکراتا ہوں' پامال کرتا ہوں اور آگے بڑھ جاتا ہوں' اپنا سفر جاری رکھتا ہوں اور یہ سب اس لیے ہے کہ عشق کا تقاضا جستجو ہے' قرار و قیام نہیں:

مپرس از عشق و از نیرنگی عشق
بہر رنگے کہ خواہی سر برآرد
درون سینہ بیش از نقطۂ نیست
چو آید بر زباں پایاں ندارد

(پیامِ مشرق:۴۶)

اور جس چیز کا پایان کار نہ ہو' انتہا نہ ہو وہ زبان و کلام کی محتاج کب ہو سکتی ہے؟

ہاں تو بات منزل کی ہو رہی تھی، وہی منزل جسے اقبال سنگِ رہ سمجھتے ہیں، ایک اور موقع پر منزل کے لیے اس سے بھی زیادہ "سخت" الفاظ اقبال نے استعمال کیے ہیں:

خیال او درونِ دیدہ خوش تر
غمش افزودہ، جاں کاہیدہ خوش تر
مرا صاحب دلے ایں نکتہ آموخت
زمنزل جادۂ پیچیدہ خوش تر

(پیامِ مشرق:۴۹)

عُرفی

مرے دل نے یہ اک دن اس کی تربت سے شکایت کی
نہیں ہنگامہ عالم میں اب سامانِ بے تابی
مزاجِ اہلِ عالم میں تغیر آگیا ایسا
کہ رخصت ہوگئی دُنیا سے کیفیت وہ سیمابی
فغانِ نیم شب شاعر کی بار گوش ہوتی ہے
نہ ہو جب چشم محفل آشنائے لطف بے خوابی
کسی کا شعلہ فریاد ہو ظلمت. رُبا کیونکر؟
گراں ہے شب پرستوں پہ سحر کی آسماں تابی
صدا تربت سے آئی" شکوۂ اہلِ جہاں کم کو
نوارا تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل راگراں بینی"

(بانگِ درا:۲۳۸)

(۴۹)

تمیز رنگ وبُو

اقبال کی ساری زندگی ایک ہی پیام کی تبلیغ وتلقین میں بسر ہوئی ہے

اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے (بانگِ درا:۱۶۰)

وہ روح کی گہرائیوں سے مسلمانوں کو بار بار بتاتے رہے ہیں:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

(بانگِ درا:۱۶۰)

وہ ہر معاملہ میں سمجھوتہ کر سکتے ہیں، لیکن اگر مفاہمت نہیں کر سکتے تو وطنیت کے معاملہ میں، اس لیے کہ ان کے نزدیک

قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے (بانگِ درا:۱۶۰)

وہ پرجوش اور پرخروش انداز میں مسلمانوں کو ہوشیار کرتے ہیں، اکساتے ہیں اور کہتے ہیں:

نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

(بانگِ درا:۱۶۰)

وہ مختلف انداز واسلوب سے اس زہر کا تریاق مہیا کرتے ہیں۔ اس تحریک کے

خلاف لب کشائی کرتے ہیں۔ کبھی نرم و ملائم الفاظ میں، کبھی سنگ و درشت الفاظ میں، لیکن مطلب ایک ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور دیکھیے کتنے سرمست انداز میں کہتے ہیں:

چمن زادیم و ازیک شاخساریم
تمیز رنگ و بو برما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

(پیامِ مشرق:۵۴)

موت کا راز

آہ! غافل! موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے!
نقش کی ناپائیداری سے عیاں کچھ اور ہے!
جنت نظارہ ہے نقش ہوا بالائے آب
موج مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب
موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے یہ!
کتنی بیدردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ!
پھر نہ کرسکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا
توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا
فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو

(بانگِ درا:۲۳۲)

(۵۰)

دلِ من اے دلِ من

جنون کی تمکنت، دیوانگی کا وقار، قلندری کی شان صرف اس ذرا سے نقطۂ موہوم پر قائم ہے جسے دل کہتے ہیں۔ زندگی کی رونق اسی سے ہے، رُوح کی تمکنت اسی سے ہے، جسم کا شکوہ اسی سے ہے۔ دُنیا کی چہل پہل اسی سے ہے، یہ ہے تو سب کچھ ہے۔ یہ نہیں تو کچھ نہیں، سب کچھ ہیچ۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اس آفت کے ٹکڑے کو جس کا نام دِل ہے، بہت عزیز رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں اور معترف ہیں:

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

اس لیے وہ اپنے دل کو بہت سنبھال کر رکھتے ہیں، اسے مرنے نہیں دیتے، اس کے جوش اور ولولہ کو قائم رکھتے ہیں، اس کی تازگی اور رعنائی میں فرق نہیں آنے دیتے۔ مولانا روم نے عشق کے بارے میں فرمایا ہے:

اے طبیب جملہ علت ہائے ما

اقبال عشق کے مرکز اور اس چشمہ کو طبیب ہر مرض سمجھتے ہیں اور اسے اپنی ساری کائنات قرار دیتے ہیں:

دلِ من! اے دلِ من! اے دلِ من!!!
یم من، کشتی من، ساحلِ من!

(پیامِ مشرق: ۵۳۱)

میرے دل!

اے میرے دل!

تو میرا بحرِ ناپیدا کنار ہے' تو میرا سفینۂ آزاد ہے' تو میرا ساحلِ مراد ہے۔

چو شبنم بر سرِ خاکم چکیدی؟
دیا چوں غنچہ رستی از گلِ من؟

(پیامِ مشرق: ۵۳)

چمنستانِ جہاں

اے تارو! نہ پوچھو چمنستانِ جہاں کی
گلشن نہیں' اک بستی ہے وہ آہ و فغاں کی
آتی ہے صبا واں سے پلٹ جانے کی خاطر
بے چاری کلی کھلتی ہے مرجھانے کی خاطر
کیا تم سے کہوں کیا چمن افروز کلی ہے
ننھا سا کوئی شعلۂ بے سوز کلی ہے
گل نالۂ بلبل کی صدا سن نہیں سکتا
دامن سے مرے موتیوں کو چن نہیں سکتا
ہیں مرغِ نواریز گرفتار' غضب ہے
اُگتے ہیں تہِ سایۂ گل خار' غضب ہے!

(بانگِ درا: ۲۱۶۔۲۱۵)

(۵۱)

میں کیا ہوں؟

یہ سوال کہ "میں کیا ہوں" بہت پرانا اور بہت اہم ہے اور اس پر فکر ونظر کی ساری اساس قائم ہے۔ اگر کوئی یہ نہیں جانتا کہ میں کیا ہوں؟ تو وہ کچھ نہیں جانتا اور اگر کوئی خود شناس مرحلہ طے کر لیتا ہے تو پھر خدا شناسی میں دیر نہیں لگتی۔ "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" بڑی تابندہ حقیقت ہے۔

عام لوگ، جس طرح دوسرے بہت سے مسائل پر غور نہیں کرتے اسی طرح خود شناسی اور خود نگری بھی ان کی نظر میں کار بیکاراں ہے، لیکن جن لوگوں کو فطرت کی طرف سے طبع سلیم عطا ہوئی ہے، جو فکر ونظر کے حامل ہیں، وہ اپنی فکر وتامل کا مرکز ومحور جس چیز کو بناتے ہیں وہ بھی خود شناسی ہے۔ پھر اس سے وہ ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکے۔

دُنیا کے حکیموں اور مفکروں کے حالات وسوانح اپنے سامنے رکھیے، جو شخص جتنا بڑا ہوگا، اتنا ہی زیادہ وہ اس مسئلہ پر غور کرے گا، صوفیا کے ہاں تو خاص طور پر خود شناسی اور خود نگری پر زور دیا جاتا ہے۔

اقبال بھی بہت بڑے مفکر اور حکیم تھے۔ انھوں نے ہی سب سے زیادہ زور جس چیز پر دیا ہے وہ بھی خود شناسی ہے۔ وہ اپنے مخاطب کو بار بار اس طرف متوجہ کرتے ہیں اس لیے کہ جانتے ہیں یہ مرحلہ سر کیے بغیر کوئی شخص، نہ علم حاصل کر سکتا ہے نہ معرفت، نہ اپنے کام آ سکتا ہے نہ دوسروں کے، نہ اچھا بندہ بن سکتا ہے، نہ اچھا انسان۔ وہ انسان کو اس کا مقام بتاتے ہیں، اُسے متوجہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی ہستی اپنے وجود کی غرض وغایت پر غور کرے، اپنے آپ کو

پہچانے، دیکھے، سمجھے، وہ بتاتے ہیں:

دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

(بانگِ درا:۱۹۳)

وہ چاہتے ہیں یہ شوکتِ طوفاں ابھرے، بڑھے، نمایاں ہو۔انسان نے اپنی خودی بیچ رکھی ہے، اپنے آپ کو غلام بنا رکھا ہے، غیر الٰہی قوتوں نے اس پر غلبہ و تسلط حاصل کر لیا ہے اور وہ ایک بے بس معمول کی طرح ان کے اشاروں پر ناچتا ہے۔یہ صورتِ حال صرف اس لیے ہے کہ اس کی خودی کم ہے۔اس گوہر نایاب کو اگر وہ تلاش کرے تو پھر اسے کوئی غلام نہیں بنا سکتا، پھر کوئی اس پر غلبہ و تسلط نہیں حاصل کر سکتا، پھر وہ کائنات پر حکمرانی کر سکتا ہے، پھر وہ بحر و بر کو اپنا غلام بنا سکتا ہے، پھر وہ تحت الثریٰ اور فلک الافلاک پر اپنا پرچم لہرا سکتا ہے، لیکن اس طرف سے وہ غافل ہے، اس مسئلہ پر وہ غور نہیں کرتا، اس میں یہ لگن نہیں پیدا ہوتی کہ اپنے آپ کو پہچانے، معرفتِ نفس حاصل کرے، خودشناسی کی نعمت سے مالا مال ہو۔یہ کیفیت دیکھ کر ان کا دل کڑھتا ہے، وہ مغموم و ملول ہو جاتے ہیں۔چاہتے ہیں وہی جذبہ جوان کے سینہ میں مچل رہا ہے دوسروں تک جس طرح بھی ہو منتقل کر دیں تاکہ انسان، انسان بن جائے۔اپنی حقیقت سے غافل نہ رہے۔۔۔ملاحظہ کیجیے، انسان کو کس تیور سے کام لے کر ابھارتے ہیں:

تو می گوئی کہ آدم خاک زاد است
اسیرِ عالم کون و فساد است

(پیامِ مشرق:۵۶)

شاید تیرا یہ خیال ہے کہ انسان صرف خاک زاد ہی ہے۔اس میں کوئی قوت پنہاں نہیں، وہ ایک بے بس معمول کی طرح، اسیرِ عالم کون و فساد ہے۔اس زنجیر سے باہر قدم نہیں نکال سکتا۔

ولے فطرت ز اعجازے کہ دارد
بنائے بحر و بر جوتش نہاد است

(پیامِ مشرق:۵۶)

لیکن نہیں

امر واقعہ یہ نہیں ہے۔

انسان بہت کچھ ہے۔ وہ حقیقتِ اعلیٰ کا مظہر ہے، وہ اس کائنات کی سب سے بڑی ہستی ہے، یہ ساری کائنات، یہ سارا کارخانہ ہست و بود اسی کے دم سے قائم ہے، اسی کے لیے ہے، اسی کے تصرف میں ہے، وہ ایسی ہستی، ایسا وجود ہے کہ یہ بحر بیکراں اس کی آب جو رسے قائم ہے۔

وہ طرح طرح سے، نئی نئی تشبیہوں اور استعاروں سے کام لے کر، نئے نئے نکتوں کو پیش نظر رکھ کر، انسان میں معرفتِ نفس کا جذبہ پیدا کرتے ہیں، کبھی یوں کہتے ہیں:

مشوائے غنچہ نورستہ دلگیر
ازیں بستاں سرا دیگر چہ خواہی

(پیامِ مشرق: ۴۷)

اے غنچہ نورستہ! تو ملول و غمگین کیوں ہوتا ہے؟ اس بستان سرائے عالم میں سب کچھ تو تجھے حاصل ہے، پھر اور کیا چاہتا ہے؟ اور کس چیز کی جستجو ہے تجھے؟

لب جو، بزمِ گل، مرغ چمن سیر
صبا، شبنم، نوائے صبح گاہی

(پیامِ مشرق: ۴۷)

کیا ان نعمتوں کے علاوہ بھی تجھے کچھ درکار ہے؟

کبھی اندازِ بیان فلسفیانہ ہو جاتا ہے اور وہ وجودِ ہستی کو ایک نقطہ موہوم سمجھنے لگتے ہیں کہ معرفتِ نفس کی ایک منزل یہ بھی ہے۔

چہ پرسی از کجایم چیستم من؟
بخو پیچیدہ ام تا زیستم من

(پیامِ مشرق: ۵۴)

اے دوست!۔۔۔ مجھ سے یہ کیا سوال کرتا ہے کہ میں کہاں سے آیا ہوں؟ کیا

ہوں؟ میری حقیقت تو بس صرف اتنی ہی ہے کہ اپنے آپ سے اُلجھا ہوا ہوں اور جب تک زندہ رہوں گا یہ خود پیچیدگی قائم رہے گی۔

دریں دریا چو موج بے قرارم
اگر بہ خود نہ پیچم نیستم من

(پیامِ مشرق:۵۴)

دریائے ہستی میں میری حیثیت صرف وہ ہے جو ایک موج بے قرار کی طرح ہوتی ہے۔ اگر اپنے آپ میں نہ الجھا رہوں تو اگر خود پیچیدگی کا شغل نہ اختیار کروں تو یہ زندگی ہی اس لمحہ ختم ہو جائے۔

اور یہ کہہ کر پھر وجودِ ہستی پر غور کرتے ہیں تو فرماتے ہیں:

ندانم بادہ ام یا ساغرم من
گہر در دامنم یا گوہرم من

(پیامِ مشرق:۵۷)

کچھ پتہ نہیں چلتا میں کیا ہوں؟ بادہ ہوں یا ساغر، ظرف ہوں یا مظروف؟

چناں بینم چو بر دل دیدہ بندم
کہ جانم دیگر است و دیگرم من

(پیامِ مشرق:۵۷)

اور جب زیادہ غور کرتا ہوں تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں کچھ اور ہوں اور یہ حیات کوئی الگ چیز۔

(۵۲)

تراشیدم پرستیدم شکستم

اقبال ایک فلسفی تھے'ایک دیدہ ور فلسفی'ایک نکتہ بیں حکیم'ایک رقیقہ سنج مفکر۔۔۔۔ ساتھ ہی ساتھ'سقراط سے لے کر برگساں تک'ہر دور کی تاریخ فلسفہ وحکمت بھی ان کے پیشِ نظر تھی۔ان تمام ادوار کے حکیموں'فلسفیوں اور مفکروں کے احوال ومقامات'خیالات ونظریات اور اسلوبِ فکر ونظر سے بھی وہ واقف تھے۔اقبال کو معلوم تھا حقیقت کی تلاش میں دُنیا کے بڑے بڑے انسانوں نے کتنی تگ ودو کی،کس کس طرح انھوں نے فطرت کے رازِ سربستہ پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی،کیسے کیسے نئے نظریئے اور خیالات دُنیا کے سامنے پیش کیے'لیکن اس ساری تگ ودو کا حاصل کیا نکلا؟

کیا حقیقت مل گئی؟۔۔۔کیا تلاشِ حقیقت کا مقصد پورا ہوگیا؟ واقعات کا جواب بہر حال نفی میں ہے۔واقعہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے سوچا'نظریات قائم کیے اور ان سے دست بردار ہو گئے'پھر کسی فیصلہ تک پہنچے مگر اس پر قائم نہ رہ سکے'جس بات کو جس شدت کے ساتھ پیش کیا'دلائل وبراہین کی جس قوت کے ساتھ ثابت کیا،عقل ومنطق کے جس زور سے منوایا'تھوڑی ہی مدت کے بعد غلطی واضح ہوگئی'نظریات کمزور اور بے بنیاد ثابت ہوئے،دلائل وبراہین کا تار وپود بکھر گیا،عقل ومنطق کی نارسائی کا اعتراف کر لینا پڑا۔

جب سے یہ دُنیا قائم ہوئی ہے'یہی ہوتا چلا آ رہا ہے'اب تک حقائق عالم اور معارفِ فطرت سے متعلق ہزاروں نظریئے فیصلہ کن صورت میں دُنیا کے سامنے پیش کیے جا چکے ہیں لیکن عقل وفکر کے ان مستحکم اور سر بہ فلک قلعوں کو کسی دشمن نے نہیں'خود اس برادری

کے لوگوں نے توڑا اور پاش پاش کر دیا' جب یہ قطعیت کے ساتھ آگے بڑھے' جب جزم و یقین کے جلو میں یہ گام فرسا ہوئے ابھی چند قدم بھی نہ چلنے پائے تھے کہ معلوم ہوا جس راستہ پر چل رہے تھے وہ غلط تھا۔

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
ایں راہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

جس مقصد کو اپنا منتہائے نظر بنایا تھا وہ ہیچ اور ناکارہ ثابت ہوا' جن لوگوں نے اس پر ایمان و یقین کا اعلان کیا تھا' وہی اس کے بارے میں شک اور تذبذب بلکہ انکار کا اظہار کرنے لگے' گویا یہ عقل جس پر اتنا غرّہ کیا جاتا ہے نہ موصل الی المطلوب ہے' نہ بجائے خود جادہ و منزل' یہ خود ہی تاریکی میں بھٹکتی پھرتی ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتی رہتی ہے۔اس کے ہاتھ میں اگر زمامِ کار دے دی جائے تو یہ کبھی بھی فلاح و نجاح سے بہرہ ور نہ ہو سکیں' جو لوگ صرف اس پر تکیہ کرتے ہیں انہیں بہرحال بعد میں پچھتانا اور پشیمان ہونا پڑتا ہے اور وہ پھر ایک نئے مقصد کی تلاش میں' ایک نئی منزل کی جستجو میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر اسی طرح رہبری کرتے ہوئے ایک مدت گزر جاتی ہے، ایک دور ختم ہو جاتا ہے، ایک جگ بیت جاتا ہے اور جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ منزل قریب آ گئی، مقصد حاصل ہو گیا' تو پھر وہی ناکامی کا اعتراف' وہی داغِ حسرت۔۔۔ یہ ایک سلسلہ ہے جو برابر جاری ہے۔اس کے تواتر اور تسلسل میں کوئی فرق نہیں آتا۔

اقبال چونکہ خود بھی بہت بڑے حکیم اور مفکر ہیں، فلسفہ کے سمجھنے اور سمجھانے میں ان کی عمر گزری ہے، اس لیے ایسے واردات کو وہ بڑی خوبی سے بیان کرتے ہیں اور بڑے دل آویز انداز میں پیش کرتے ہیں اور ماضی کے اکابر کے ساتھ اتنی رعایت کرتے ہیں کہ سب کچھ اپنے اوپر اوڑھ کر بیان کرتے ہیں۔۔۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

ہزاراں سال با فطرت نشستم
باو پیوستم و از خود گسستم

(پیامِ مشرق:۶۵)

ہزاروں سال بیت گئے، میں رازِ فطرت کو معلوم کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہوں اور اس طرح سرگرداں ہوں کہ جو کچھ سمجھا اسے مان لیا، اس پر یقین کر لیا۔ اپنے آپ کو، اپنی حقیقت کو بھول بیٹھا اور ان اصنام خیالی کو پوجتا رہا۔

ولیکن سرگزشتم ایں دو حرف است
تراشیدم ، پرستیدم ، شکستم

(پیامِ مشرق:٦٥)

لیکن ان ہزار ہا سال کی میری تلاش و جستجو کا نتیجہ کیا ہے؟ یہ طویل تاریخ اگر مختصر کر کے بیان کرنا چاہوں تو کہہ سکتا ہوں۔

- میں نے بت تراشے
- میں نے ان کی پرستش کی
- اور میں نے انہیں توڑ دیا

یہ ہے میری سرگزشت ـــــ میری ہی نہیں ہر فلسفی کی، ہر حکیم کی۔

(۵۳)

گدائے بے نیاز

شاعر۔۔۔اقبال۔۔۔جب اپنے وجود پر، اپنی شخصیت پر، اپنے کارناموں پر، اپنی خدمت پر اور اپنی خدمت کے نتائج پر غور کرتا ہے تو اس کا دل فخر و نازش کے جذبات سے مملو ہو جاتا ہے اور وہ نعرہ لگاتا ہے:

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

وہ اس بات پر فخر محسوس کرتا ہے کہ خدا نے اسے عشق کا جذبہ دیا اور اس جذبہ کو اس نے صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا اپنی قوم میں تقسیم کر دیا۔ وہ اس لذّتِ جنوں سے ناآشنا تھی، وہ حقیقتِ عشق سے بہرہ ور نہ تھی، وہ خوابِ خرگوش میں مست تھی، اسے نہ اپنا ماضی یاد تھا نہ اپنے حال کی فکر تھی، نہ اپنے مستقبل کا خیال تھا۔ وہ زندہ تھی لیکن اس پر موت طاری ہو چکی تھی، نہ اس میں امنگ باقی رہ گئی تھی، نہ حوصلہ، اس نے اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیا تھا۔

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

حالانکہ اسے خَیْرُ اُمَمْ بنا کر اس دُنیا میں بھیجا گیا تھا۔ اس میں یہ طاقت تھی کہ وہ خود اپنی تقدیر کی خالق بن سکتی تھی اس لیے تو انھوں نے کہا تھا:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

(بالِ جبریل:۵۵)

لیکن وہی قوم اب راضی بہ رضا ہو کر بیٹھ گئی تھی، زندگی کی لذت سے ناآشنا' زندگی کے ذوق سے بے خبر۔

یہ حالات تھے' جب میں نے نغمہ سرائی شروع کی۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے (بانگِ درا:۱۹۹)

میرے نغمہ نے سوتے ہوؤں کو جگا دیا، ان میں عشق کی آگ جو بجھ چکی تھی پھر بھڑک اٹھی، وہ ایک نئی زندگی سے ہمکنار ہو گئے۔ میں نے اپنے آپ کو فنا کر دیا' پروانے کی طرح جلتا رہا لیکن اپنی قوم کو موت کے پنجہ سے بچا لیا۔ کیا میرا یہ کارنامہ ایسا نہیں ہے جس پر میں فخر کرسکوں؟ جس پر مجھے ناز ہو۔

شاعر کچھ نہیں کرتے' مگر فخر کرتے ہیں' تعلّی کا اظہار کرتے ہیں، شاندار قصیدے وہ امیروں' بادشاہوں اور شہریاروں کی توصیف میں زیبِ قرطاس وقلم کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ زوردار اور پراثر اشعار اپنے بارے میں کہتے ہیں۔ اپنے مفاخر کے اظہار میں زمین سمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ پھر اگر اقبال کسی موقعہ پر اپنے لیے تفاخر کا اظہار کرتا ہے تو کیا غلط کرتا ہے؟ کیا غلط کہتا ہے؟ سچ پوچھیے اور نگاہِ حقیقت سے دیکھیے' تو وہ اپنے بارے میں جو کچھ کہتا ہے وہ حقیقت سے بہت کم ہے۔ صرف اظہارِ انکسار ہے' اظہارِ واقعہ نہیں' اظہارِ واقعہ ہوتا تو اس سے کہیں زیادہ پرزور اور پرشور طور پر وہ اپنی مدحت سرائی کرسکتا تھا۔ بہر حال کہتا ہے:

بہ خود نازم' گدائے بے نیازم
تپم' سوزم' گدازم' نے نوازم

(پیامِ مشرق:٦٦)

میں ایک گدائے بے نیاز ہوں' لیکن اپنے وجود پر نازاں بھی ہوں۔ میں دُنیا کو' دُنیا حقیقت کو جانتا ہوں' اسے منہ نہیں لگاتا، اس کی پروا نہیں کرتا، اسے کام میں نہیں لاتا' اس لیے کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ دُنیا کے پاس نہیں ہے، دُنیا کے پاس مال و دولت ہے' جاہ و منزلت ہے' اقتدار و اختیار ہے' حشمت و سطوت ہے' لیکن یہ سب چیزیں آنی اور فانی ہیں، یہ دولت رہنے والی نہیں، یہ جاہ و منصب کی نمائش بھی چند روزہ ہے، یہ اقتدار و اختیار کہ جس کی

مسند پر بیٹھ کر انسان خدائی کے خواب دیکھنے لگتا ہے عارضی اور وقتی چیز ہے۔ آج ہی بازار میں جا کر دیکھ لو بہت سے بادشاہ جو تخت و تاج سے محروم ہو چکے ہیں ٹھوکریں کھاتے اور در در مارے مارے پھرتے نظر آئیں گے۔ یہ حشمت و سطوت بھی زمانہ کی طرح بدلتی رہتی ہے۔ آج کچھ ہے، کل کچھ ہے۔ آج کسی کے پاس ہے کل کسی کے پاس، یہی وجہ ہے کہ میں ان چیزوں کو خاطر میں نہیں لاتا، انہیں حقیر سمجھتا ہوں، لائق تریں نہیں سمجھتا۔ اس کے برعکس میرے پاس جو کچھ ہے وہ غیر فانی ہے، میری متاعِ عشق ہے اور عشق کو زوال نہیں، یہ وہ چیز ہے، جو قدرت نے از راہِ عنایت مجھے عطا فرمائی ہے اور مجھے اس پر ناز ہے، فخر ہے، آتشِ عشق نے مجھے تڑپ دی ہے، سوز دیا ہے، گداز عطا کیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نغمہ سرائی کی دولت عطا کی ہے۔ وہ نغمہ جو دل سے نکلتا ہے اور دل کے گوشہ میں جا کر اپنا نشیمن بنا لیتا ہے۔

ترا از نغمہ در آتش نشاندم
سکندر فطرتم ، آئینہ سازم

(پیامِ مشرق:۷۶)

اور اے میری قوم!

اے میری قوم کے نوجوانو!

یہ میری نغمہ سرائی اس لیے نہیں ہے کہ تم اسے مایۂ تفریح سمجھو، ایک دل بہلاوا۔۔۔۔ نہیں، یہ وہ نغمہ سرائی ہے، جو میری آتشِ عشق کی ترجمان ہے۔ اس نغمہ سرائی کے ذریعہ میں تیری ہی اس منزلِ عشق کی طرف رہنمائی کر رہا ہوں، جو اصل حیات ہے، اصل مقصود ہے۔ حاصلِ کائنات ہے۔

میں وہ سکندر فطرت ہوں کہ میں نے تیرے لیے ایک ایسا آئینہ بنا دیا ہے، جس میں تو سب کچھ دیکھ سکتا ہوں۔ اقوام عالم کی کیفیت بھی اپنا ماضی بھی، حال بھی اور مستقبل بھی۔۔۔۔ کیا یہ میرا کارنامہ ایسا نہیں ہے، جس پر میں ناز کرسکوں؟ فخر کرسکوں؟

(۵۴)

جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

اقبال کے کلام اور پیام میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ تعمیرِ خودی ہے' انھوں نے اپنی قوم کو صرف ایک ہی درس دیا ہے۔ یہ کہ' وہ خودی کی لذت آشنا بن جائے، اپنی حقیقت کو پہچانے' اپنے مقصدِ وجود سے آشنا ہو اور جو ذمہ داریاں اسے سونپی گئی ہیں' انھیں خوبی اور شائستگی کے ساتھ انجام دے' خوش قسمتی سے مسلمان قوم کو ایک سعادت ایسی حاصل ہے جس میں کوئی دوسری قوم اس کی شریک و سہیم نہیں۔ وہ سعادت یہ ہے کہ اسلام جو کچھ کہتا ہے، وہ جیسی قوم تیار کرنا چاہتا ہے' اقبال بار بار' جس رستے کی طرف دعوت دیتے ہیں وہ کوئی لامعلوم اور غیر معروف چیز نہیں ہے۔ دُنیا اس سے واقف ہے' اسے جانتی ہے' مانتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ گرامی میں اور آپ کے بعد خلفائے راشدین کے عہدِ حکومت میں دُنیا ایسے لوگوں کو دیکھ چکی ہے جو خودی کی نعمت سے بہرہ ور تھے اور اس قوت سے مستحکم ہو کر انھوں نے دُنیا کی کایا پلٹ دی تھی' گویا جو نظریہ اقبال ملت کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ نیا نہیں ہے۔ برتا جا چکا ہے، پرکھا جا چکا ہے' آزمایا جا چکا ہے اور نہایت کامیابی کے ساتھ عمل میں لایا جا چکا ہے' دوستوں کو چھوڑیئے دشمنوں نے اعتراف کیا ہے کہ اس سے اچھا زمانہ انسانیت کے لیے کوئی نہیں گزرا' یہی وہ زمانہ تھا' جب انسان کو اس کے چھینے ہوئے حقوق ملے، پست و بلند کا امتیاز مٹا، غلامی کا استیصال کیا گیا' عورت کو وہ مرتبہ دیا گیا' جس سے اس کے پہلے اور اس کے بعد وہ کبھی آشنا نہیں ہوئی' رواداری کا ایسا نمونہ دُنیا کے سامنے پیش کیا گیا جو آج بھی سرمہ چشم صاحب نظراں ہے' غرض جس نہج' جس اسلوب اور جس انداز سے بھی اس نظام کو آزمایا گیا' اسے برتر اور بہتر پایا گیا۔ اقبال پوچھتے ہیں جب ایک مرتبہ اتنا کامیاب اور شاندار تجربہ کیا

جا چکا ہے تو اب پھر اس کا اعادہ کیوں نہیں کیا جاتا' وہ قوم جس کے اجداد نے' دُنیا پر اتنا بڑا احسان کیا تھا' آج دُنیا پر ایک بوجھ بنی ہوئی ہے، وہ اپنی رفعتیں کھو چکی ہے اور ادبار و انحطاط کے غار میں گرتی چلی جا رہی ہے۔ پہلے دُنیا کی قومیں اعزاز و احترام کے ساتھ اس کا نام لیتی تھیں اب اس کا مذاق اڑاتی ہیں، تمسخر کرتی ہیں، اسے حقیر اور ہیچ اور ناکارہ خیال کرتی ہیں۔

اقبال' اپنی قوم کو یہی بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں اور بار بار یاد دلاتے ہیں۔ وہ عرفی کے اس شعر پر عامل ہیں:

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

ان کی نوا میں تلخی بھی ہے اور ان کی حدی خوانی میں تیزی بھی۔

اقبال اپنی قوم کو بتاتے ہیں:

سکندر رفت و شمشیر و علم رفت
خراجِ شہر و گنج و کان و یم رفت

(پیامِ مشرق: ۷۰)

سکندر بڑی آب و تاب کے ساتھ دُنیا کے پردہ پر نمودار ہوا' اس نے فتوحات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کیا' وہ دور دراز مقامات پر پہنچا اور اس نے اپنی فتح کا جھنڈا لہرایا' لیکن آج سکندر کہاں ہے؟ جو خراج' اونٹوں اور خچروں سے لد کر اس کے حضور میں پہنچا کرتا تھا وہ کیا ہوا؟ بحر و بر کی جو دولت سمٹ سمٹ کر اس کے دامن تک پہنچتی تھی اور جسے اس نے دونوں ہاتھوں سے لوٹا تھا اور دونوں ہاتھوں سے لٹایا تھا' کس خزانہ میں ہے؟

اُمم را از شہاں پایندہ تر داں
نمی بینی کہ ایراں ماند و جم رفت؟

(پیامِ مشرق: ۷۰)

قومیں بادشاہوں سے زیادہ پائندہ ہوتی ہیں' کیا تو نہیں دیکھتا' جم رخصت ہو گیا لیکن ایرانی قوم اب تک باقی ہے۔

یہ کہہ کر انھوں نے ایک بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ کیا۔اب وہ اپنے خاص موضوع پر آتے ہیں،ارشاد ہوتا ہے:

عجم از نغمہ ہائے من جواں شد
ز سودایم متاع او گراں شد

(پیامِ مشرق:۷۱)

میں نے اپنے نغمہ سرائی سے عجم کی پیری کو شباب سے،موت کو زندگی سے بدل دیا ہے،وہ کچھ نہ تھا لیکن میں نے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے:

ہجوے بود ، رہ گم کردہ در دشت
ز آواز درایم کارواں شد

(پیامِ مشرق:۷۱)

اس کی حالت اس ہجوم کی سی تھی جس نے صحرا میں اپنا راستہ گم کر دیا ہو،لیکن وہی گم کردہ راہ ہجوم،میری بانگِ درا سے ایک کارواں کی صورت میں تبدیل ہو گیا اور یہ کارواں، منزل مقصود کی طرف اب بڑھ رہا ہے،جس کی نظر سے منزل اوجھل ہو چکی تھی اب وہ منزل کا شناسا بن چکا ہے۔

پھر اسی مفہوم کو دوسرے الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

عجم از نغمہ ام آتش بجان است
صدائے من درائے کارواں است

(پیامِ مشرق:۷۲)

میری نغمہ سرائی نے عجم کو آتش بجاں کر دیا ہے،وہ اب ایک پیکرِ خاکی نہیں ہے۔اس میں سوز و ساز ہے،شرارِ آرزو ہے،جوشِ تمنا ہے،میری آواز اس کے لیے درائے کارواں ثابت ہوئی اور کارواں رواں دواں منزل کی طرف بڑھنے لگا۔

حُدی را تیز تر خوانم چو عرفی
کہ راہ خوابیدۂ محمل گران است (پیامِ مشرق:۷۲)

میں بھی عرفی کے نقش قدم پر چل رہا ہوں یعنی حدی خوانی میں میں نے شدت اور جوش کے عناصر بڑھا دیے ہیں، اس لیے کہ محمل گراں ہے، راستہ دشوار ہے، جب تک جذبہ و جوش کارفرما نہ ہو یہ راستہ نہیں طے کیا جا سکتا۔

پھر اور زیادہ جوش و ولولہ کے ساتھ یہی بات کہتے ہیں:

ز جانِ بے قرار آتش کشادم
دلے در سینۂ مشرق نہادم

(پیام مشرق:۷۲)

میں جوشِ عشق سے ایک پیکر آتش بنا ہوا ہوں۔ یہ آگ میں نے سینۂ مشرق میں بھی سلگا دی ہے وہ بھی اب گل کدہ نہیں گلخن بن گیا ہے۔

گلِ او شعلہ زار از نالۂ من
چو برق اندر نہادِ او فتادم

(پیام مشرق:۷۲)

میرے نالۂ جان کاہ کا اثر یہ ہے کہ اب مشرق کا گلستاں بھی گلستاں نہیں رہا شعلہ زار بن گیا ہے اس کے بدن میں میں نے وہ بجلی دوڑا دی ہے جس نے اس کے اندر ایک نئی زندگی پیدا کر دی ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

مرا مثلِ نسیم آوارہ کردند
دلم مانندِ گل صد پارہ کردند

(پیام مشرق:۷۲)

عشق میں میری مثال نسیم آوارہ کی سی ہے اور میرا دل صد سہ فراق سے صد پارہ ہو رہا ہے۔

نگاہم را کہ پیدا ہم نہ بیند
شہیدِ لذتِ نظارہ کردند (پیام مشرق:۷۲)

مجھے جو نگاہ دی گئی ہے وہ ایسی ہے کہ اس دُنیائے آب وخاک کو نہیں دیکھ سکتی، اس کی حقیقت بھی نہیں سمجھ سکتی، نہ اس کی تہہ معلوم کر سکتی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ شوق نظارہ بھی ودیعت کر دیا گیا ہے، وہ ایسا کہ میں شہیدِ نظارہ ہو کر رہ گیا ہوں۔

یہ باتیں کرنے کے بعد وہ پھر دوسری چیزوں کو فراموش کر کے، اور ان سے قطع نظر کر کے ایک نظر اپنے آپ پر ڈالتے ہیں اور پھر اپنی قوم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ، تو سب کچھ ہے، لیکن اپنے آپ سے غافل ہے، خودنگر اور خودشناس بن جا، یہ دنیا تیرے تابع اور مطیع ہو جائے گی۔ تجھے اس پر حکومت کرنے کا حق پھر مل جائے گا، جیسا اس سے پہلے مل چکا ہے۔

چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

زمین خاکِ درِ میخانۂ ما
فلک یک گردشِ پیمانۂ ما

(پیامِ مشرق:٦٩)

یہ زمین کیا ہے؟ ----- میرے میخانہ کی خاک۔
یہ آسمان کیا ہے؟ ----- میرے پیانہ کی ایک گردش۔

حدیثِ سوز و سازِ ما درازاست
جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

(پیامِ مشرق:٦٩)

میرے سوز وساز کا افسانہ بہت طویل ہے۔

یہ جہانِ رنگ و بو، یہ عالم ہست و بود، یہ دُنیائے حسرت و آرزو میرے افسانہ کا دیباچہ ہے۔ اصل افسانہ تو اس سے گزرنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔

خودی کا اتنا دل آویز نقش اقبال نے قائم کیا ہے جسے جب، اور جس طرح بھی وہ بیان کرتے ہیں اس کی دل کشی اور جاذبیت میں فرق نہیں آتا۔ یہی ان کا حاصلِ کلام ہے اور اس رباعی میں تو انھوں نے اپنے اعجاز کلام سے جان ڈال دی ہے۔

(۵۵)

دستِ دُعا

حدیث جنوں میں مسلمان کی توصیف یہ آتی ہے کہ جو کچھ اپنے لیے پسند کرے‘ وہی اپنے (مسلمان) بھائی کے لیے بھی پسند کرے‘ اقبال اس معیار پر ایک مردِ مسلمان کی طرح بالکل پورے اترتے ہیں۔ خدا نے انہیں عشقِ جنون کی نعمت بخشی ہے‘ وہ اس نعمت کو عام کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کی تمنا ہے یہ نعمت ہر شخص کو مل جائے۔ عشق کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے مقصدِ وجود سے واقف ہو جائے اس لیے کہ جب تک مقصودِ وجود سے واقف نہ ہو‘ وہ عشق ہی نہیں کر سکتا‘ عشق دعوت ہے، مقصد و یکتائی کی طرف۔ اقبال چاہتے ہیں‘ ملت اسلامیہ کا ہر فرد‘ عاشق صادق بن جائے‘، اپنے مقصد سے‘ اپنے وجود سے‘ اپنے مقصدِ وجود سے‘ عشق کرے‘ تب ہی وہ ارتقاء و عروج کے مراحل طے کر سکتا ہے، تب ہی وہ کائنات کو مسخر کر سکتا ہے، تب ہی بحر و بر‘ شجر و حجر‘ عالم کون و مکاں کی ہر چیز پر اس کی سلطانی قائم ہو سکتی ہے۔

اپنی سی کوشش تو زندگی بھر اقبال کرتے رہے‘ اس میں کامیاب بھی ہوئے اور ناکام بھی‘ لیکن کبھی کبھی ان کے دستِ دُعا بھی بلند ہو جاتے ہیں اور وہ بارگاہِ رب العزت میں التجا کرتے ہیں کہ یہ عشق کی چنگاری‘ یہ میرا سوزِ جگر‘ مجھ ہی تک محدود نہ رکھ اسے عام کر دے وہ اگر چاہتے تو قدرے‘ اس آرزو کے علاوہ ہر بات کہہ سکتے ہیں۔ وہ دعائے درازی عمر و ترقی اقبال کر سکتے ہیں‘ وہ مناصب بلند کے لیے خدا کے حضور میں عرض و التماس کر سکتے تھے‘ وہ دولت و ثروت کی تمنا کا اظہار کر سکتے تھے، وہ ہمیشہ بیمار رہتے تھے‘ صحت مانگ سکتے تھے اور انسان خدا سے عام طور پر جب کچھ مانگتا ہے تو اپنے یا اپنے بیوی بچوں اور اہل و عیال ہی کے لیے مانگتا

ہے، ملک کے لیے ملت کے لیے قوم کے لیے کچھ نہیں طلب کرتا۔لیکن اقبال کی قلندرانہ ادا دیکھیے، وہ بارگاہ رب العزت میں دست دعا بلند کیے ہوئے پہنچتے ہیں لیکن اپنے لیے اپنے اہل وعیال کے لیے اپنے متعلقین کے لیے کچھ نہیں مانگتے ہیں۔طلب کرتے ہیں تو اپنی قوم کے لیے اپنی ملت کے لیے ان کی زندگی اگر فقر وفاقہ کی نہیں تھی تو امیرانہ بھی نہیں تھی ایک اوسط درجہ کے انسان کی حیثیت سے وہ اپنی زندگی کے شب وروز بسر کر رہے تھے۔یقیناً ان کے دل میں یہ خیال آتا ہوگا کہ اپنے قلم سے اپنی صلاحیت اور استعداد سے فائدہ اٹھائیں اور روپیہ پیدا کریں۔وہ تنہا نہیں تھے۔صاحب اہل وعیال تھے لڑکی تھی لڑکا تھا ان دونوں کی ذمہ داریوں سے عہدہ براہونے کے لیے روپیہ کی ضرورت تھی لیکن مال ودولت کا نام بھی وہ اپنی زبان پر نہیں لاتے صرف قوم کے لیے ملت کے لیے بارگاہ رب العزت میں وہ دریوزہ گری کرتے ہیں۔۔۔۔ذرا انداز تکلم دیکھیے:

اے کہ ازخم خانہ فطرت بہ جامم ریختی
ز آتشِ صہبائے من بگداز مینائے مرا

(پیامِ مشرق:۸۴)

اے پروردگار بے نیاز! تو نے میری مینائے تہی کو شراب عشق ومحبت سے لبریز کردیا ہے۔بس میں یہ چاہتا ہوں کہ اس آگ میں میری ہستی کو پگھلادے۔

عشق را سرمایہ ساز گرمی فریادِ من
شعلۂ بیباک گرداں خاک سینائے مرا

(پیامِ مشرق:۸۴)

میری گرمیِ نوا کو عشق کی پونجی بنادے میری خاک کو ایسا شعلہ بنادے کہ وہ خاشاک غیراللہ خاکستر کر کے رکھ دے۔

(۵۶)

جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

انسان کیا چاہتا ہے؟۔۔۔سکون دائمی' یہ نیک کام کیوں کرتا ہے؟عبادت وریاضت میں کیوں اپنا وقت صرف کرتا ہے؟غریبوں اور محتاجوں کے کام کیوں آتا ہے؟ مظلوموں کی مدد کیوں کرتا ہے؟ان تمام حسنات کا مقصد کیا ہے؟کہا جاسکتا ہے'نیکی خود ایک مقصد ہے' نیک کام آدمی اس لیے کرتا ہے کہ اسے ایسا کرنا چاہیے۔لیکن سوچنے کا یہ انداز ہر شخص کا نہیں ہے۔آپ جس سے بھی پوچھیں وہ یہی کہے گا کہ ان اچھائیوں اور نیکیوں سے میرا مقصد یہ ہے کہ یہ عارضی زندگی جب ختم ہو اور دائمی زندگی شروع ہو تو میں خسارہ میں نہ رہوں۔ ان نیکیوں اور اچھائیوں کا صلہ جنت کی صورت میں مجھے مل جائے' گویا' مقصد یہ قرار پایا کہ انسان نیکی اس لیے کرتا ہے' اچھائیوں کا صدور اس سے اس لیے ہوتا ہے کہ وہ جنت حاصل کرے۔۔۔اور جنت میں کیا ہوگا؟ حور' غلمان' فرشتے۔۔۔یہ وہ مقام ہے جہاں کی زندگی کو زوال آوال نہیں' جہاں کوئی تمنا ناکام نہیں رہ سکتی' جہاں ہر آرزو ہر وقت پوری ہوسکتی ہے۔ جہاں دودھ کی نہریں ہوں گی، شہد کے حوض ہوں گے، حوریں ہوں گی، غلمان ہوں گے اور حیات دائمی ہوگی۔

ہر مذہب نے۔۔۔خواہ یہ مذہب' اپنے تعلیمات کے لحاظ سے' ایک دوسرے سے کتنے ہی متضاد اور متخالف کیوں نہ ہوں۔۔۔۔اپنے پیرودں کو حسن عملی کی بشارت' جنت کی صورت میں دی ہے۔یعنی اس دُنیا میں تکلیفیں جھیل لو' دکھ سہہ لو' آفتیں برداشت کرلو' ناکامی کا داغ سینہ پر لے لو' فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرلو' مایوسی اور حرماں نصیبی کا گلہ نہ کرو کہ وہ وقت جلد

آنے والا ہے جب تم جنت میں پہنچ جاؤ گے، ساری تکلیفیں ختم ہو جائیں گی اور تم ایک شاندار' حسبِ مدّعا اور نہ ختم ہونے والی زندگی کے مالک بن جاؤ گے۔

گویا' انسان کی معراج یہ ٹھہری کہ مرنے کے بعد وہ جنت میں پہنچ جائے۔

لیکن ہمارا شاعر۔۔۔اقبال۔۔۔جنت پر راضی نہیں ہے۔وہ جنت کو موت سمجھتا ہے۔قید خانہ خیال کرتا ہے۔وہ موت سے نہیں ڈرتا۔مرنے کو تیار ہے۔اس کا استقبال' جوش مسرت کے ساتھ کرتا ہے۔لیکن مرنے کے بعد' پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے کا' تلاش و جستجو سے دستبردار ہو جانے کا' سکون و سکوت کی زندگی بسر کرنے کا قائل نہیں ہے۔اس کے نزدیک یہ زندگی تو موت سے بھی کہیں زیادہ بدتر ہے۔

چنانچہ' یہ عاشق جنوں پرور' یعنی شاعر سخن پرور اتفاق سے کسی طرح جنت میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں ایک حور سے مڈبھیڑ ہوتی ہے۔محبوب کے حسن و جمال کی آخری تعریف یہ ہے کہ وہ حور پیکر ہو اور یہاں مجسم حور سامنے کھڑی ہے۔لیکن شاعر اس کی طرف ملتفت نہیں ہوتا۔نہ اس کی جنت کو خیال میں لاتا ہے' حور کو حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ میرے تصور میں زاہدوں اور عابدوں کی راتیں بسر ہوتی ہیں، وہ اپنی ساری زندگی عبادت و ریاضت اور مجاہدہ میں اس لیے صرف کر دیتے ہیں کہ میں انھیں مل جاؤں' لیکن اس شخص کے سامنے' میں بالکل بہ سپردگی کھڑی ہوں مگر یہ نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا' یہ کس قسم کا انسان ہے؟ کیا اس کے جسم میں دل نہیں؟ کیا یہ رہ و رسم آشنائی سے ناواقف ہے؟ کیا محبت کی لذّت' عشق کے خمار' دیوانگی کے جوش اور جنون کی ہنگامہ آرائیوں میں سے اسے کچھ حصہ نہیں ملا؟ اس کی جیب بھی سلامت ہے' دامن بھی اور گریباں بھی' اس کا گریباں تار تار کیوں نہیں ہوتا؟ اس کی جیب پارہ پارہ کیوں نہیں ہوتی؟ آخر' میرے سوا' اسے اور چاہیے کیا؟ کیا مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہے جس کی یہ جستجو کر سکتا ہے؟ جس کی یہ آرزو کر سکتا ہے؟

شاعر کی بے نیازی اور بے التفاتی دیکھ کر آخر حور ضبط نہیں کر سکتی۔کہتی ہے:

نہ بہ بادہ میل داری' نہ بہ من نظر کشائی
عجب ایں کہ تو نہ دانی رہ و رسم آشنائی (پیامِ مشرق:۱۲۶)

نہ شراب سے تجھے رغبت ہے نہ میری طرف تو نظر بھر کر دیکھتا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ انسان ہو کر دل بے قرار پہلو میں رکھتے ہوئے بھی تو رہ رسم آشنائی سے ناواقف ہے۔

شاعر' بھلا یہ طعن سُن کر کیوں خاموش رہتا' اس نے جواب تو کچھ نہیں دیا، نغمہ سرائی شروع کر دی۔ وہی دل کی باتیں' عشق کی گھاتیں' سازِ محبت' سوزِ فراق' دردِ دل اور دل ناصبور کی حکایت' یہ نغمہ سرائی' بیچاری حور کے لیے اور زیادہ تعجب انگیز ثابت ہوئی۔ کہ یہ حضرت' ایسے تو سب کچھ جانتے ہیں، کھلے کھائے معلوم ہوتے ہیں۔ تان سنو' تو دل میں اترتی جاتی ہے، نغمہ سنو تو روح تڑپ جاتی ہے۔ شعر سنو' تو عالم ہی دوسرا طاری ہو جاتا ہے۔ پھر بھی انجان بنے ہوئے ہیں' گویا کچھ جانتے ہی نہیں۔ معصومیت ہے کہ ٹپکی پڑتی ہے۔ اب وہ اور زیادہ سراپا حیرت بن کر کہتی ہے:

همه سازِ جستجوئے' همه سوزِ آرزوئے
نفسے که می گدازی' غزلے که می سرائی

(پیامِ مشرق:۱۲۷)

اب تو تیرے حال پر مجھے اور زیادہ حیرت ہے' تو گونگا نہیں' نغمہ طرازی بھی کرتا ہے۔ تیرا سینہ دل سے خالی نہیں۔ دل کی دھڑکن میں سن رہی ہوں' یہ جو کچھ تو نے گایا' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو ہمہ تن سازِ جستجو اور سوزِ آرزو بنا ہوا ہے، کسی کی محبت میں بے تاب ہے، تیری غزل سرائی سے ایسا اندازہ ہوتا ہے جیسے تیری ہر سانس شعلہ وشرر ہے جو تیرے دل کو پھونکے دیتی ہے اور پھر بھی یہ بے التفاتی' یہ کج ادائی؟ یہ سرد مہری؟ آخر یہ کیا راز ہے؟

شاعر اپنی غزل سرائی میں مصروف ہے' اور حور اب تک اس کی نگاہ غلط انداز سے محروم ہے لیکن وہ شاعر کی اس ادا سے' اور اس سے زیادہ اس کی غزل سرائی سے' اس کے سوز و ساز سے' اس کے درد و آہ سے' بہت زیادہ متاثر ہو چکی ہے۔ یہ کھنچتا ہے' وہ بڑھتی ہے۔ یہ پیچھے ہٹتا ہے' وہ آگے بڑھتی ہے۔ یہ دامن سمیٹتا ہے' وہ ہمہ تن سپردگی بنی ہوئی ہے۔ اس کی بے نیازی اس کی بے التفاتی' اس کی بے پروائی حور کے دل میں کچھ عجیب قسم کی کسک پیدا کر دیتی ہے۔ اس کی نغمہ طرازی' اس کی غزل سرائی' حور کے دل میں' ایک عجیب قسم کا طوفان برپا کر دیتی ہے۔

جسے وہ سمجھ نہیں پاتی کہ کیا ہے۔ لیکن یہ وہی چیز ہے جسے دُنیا والے اپنی اصطلاح میں محبت کہتے ہیں۔ وہ پہلی مرتبہ محبت کے راز سے ناواقف ہوتے، عشق کی لذّت سے ناآشنا ہوتے ہوئے شاعر کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے لیکن اظہارِ عشق کر نہیں پاتی، اس لیے نہیں کہ اظہارِ عشق کرتے جھجکتی ہے۔ اس لیے کہ نہیں جانتی، اظہارِ عشق کس طرح کیا جاتا ہے۔ وہ بیچاری تو یہ بھی نہیں جانتی محبت ہوتی کیا چیز ہے۔ اگرچہ اس دام میں گرفتار ہو چکی ہے۔ آخر ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنا مدعا بیان کرتی ہے۔

به نوائے آفریدی چه جہانِ دل کشائے
که ارم به چشم آید چو طلسم سیمیائی!

(پیامِ مشرق:۱۲۷)

اے شاعر!

تیری نوائے دل فریب میں یہ کیسا جادو ہے، جس نے ایک نئے، بالکل نئے عالم میں مجھے پہنچا دیا ہے اور یہ نیا عالم، مجھے، کیسا عجیب اور مرغوب خاطر نظر آ رہا ہے؟ اب تک تو میں سمجھتی تھی کہ جنت ہی سب کچھ ہے۔ لیکن اب یہ ارم، یہ فردوس، مجھے ایک طلسم سیمیائی، ایک ہیچ اور بے حقیقت چیز نظر آ رہا ہے۔۔۔ بتا تو کون ہے؟ تیری نوا کیا ہے؟ یہ کشش تجھ میں کہاں سے آئی؟ یہ اندازِ دل آویزی تو نے کہاں سے سیکھا؟ میں تجھ سے اتنی قریب آ چکی ہوں، لیکن تو مجھ سے تنا دور کیوں ہے؟

شاعر، حور کی باتیں زیرِ لب تبسم کے ساتھ سنتا ہے اور پھر کہتا ہے:

دلِ رہ رواں فریبی، به کلام نیش دارے
مگر ایں که لذّت او نه رسد به نوکِ خارے

(پیامِ مشرق:۱۲۷)

جو کچھ تم نے کہا میں نے سن لیا

مانتا ہوں، تمہاری باتوں میں دل فریبی ہے اور سادہ لوح لوگ اس فریب کا شکار بھی بن جاتے ہوں گے۔ تمہاری باتوں میں ایک طرح کی چبھن ہے، لیکن وہ چبھن کہاں جو نوکِ

خار میں ہوتی ہے اور میں تو اس کا جویا ہوں۔ میرے درد کا مداوا (یہ نیش دار باتیں نہیں) نوکِ خار ہے۔

شاعر جب بولنے پر آتا ہے تو رکتا نہیں۔ ایک ایک بات کا جواب دیتا ہے اور پھر صاف الفاظ میں کہہ دیتا ہے' میرا تمہارا نباہ نہیں ہو سکتا، میں تم پر قناعت نہیں کر سکتا، میں تمہارے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا، میری جستجو ہر آن ترقی پر ہے، اسے زوال نہیں آ سکتا اور آ جائے تو پھر' میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ میری زندگی عبادت ہے، صرف تلاش و جستجو سے' تب و تاب سے' سوز و ساز سے' ان نغموں سے میں کیوں کر دست بردار ہو سکتا ہوں؟ نہیں' یہ میری فطرت کے خلاف ہے، میرے مزاج کے خلاف ہے' تم چاہتی ہو۔ میں تم پر قناعت کروں' تمہارا ہو رہوں' تلاش و جستجو اور جذبۂ آرزو سے بے نیاز ہو جاؤں۔ یہ ان ہونی بات ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میرا عالم تو یہ ہے:

ز شرر ستارہ جویم' ز ستارہ آفتابے
سرِ منزلے نہ دارم کہ بہ میرم از قرارے

(پیامِ مشرق: ۱۲۷)

چنگاری دیکھتا ہوں تو ستارہ کی طرف میرے ہاتھ لپکتے ہیں۔ ستارہ دیکھتا ہوں تو سورج کو اسیرِ دام کرنے کی تدبیریں سوچنے لگتا ہوں' تو مجھے آسودہ منزل بنا دینا چاہتی ہے اور میں کسی منزل پر تک ہی نہیں سکتا۔ کسی منزل کو منزل قرار ہی نہیں دے سکتا۔ منزل پر پہنچ جانے کے معنی ہیں' موت' آرزو اور تمنا کی موت' منزل پر پہنچ کر سب کچھ پالیا۔ اب کس کے لیے تگ و دو ہوگی؟ اب کس کے لیے تلاش و جستجو کے مرحلے طے ہوں گے؟ اب کہاں رہ نوردی اور بادیہ پیائی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ میں ایسی منزل کا قائل نہیں' میری منزل تو وہ ہے' جو نہ ملے' کیونکہ اگر کسی جادہ کو منزل قرار دے لوں' تو موت سے ہم آغوش ہو جاؤں اس لیے کہ قرار کا نام موت ہے اور منزل کا نام قرار ہے۔ آج میں تیرے پاس رک بھی جاؤں' تو کل رختِ سفر باندھنا پڑے گا مجھے' کیونکہ کسی ایک جگہ قیام کر لینا، رہروانِ راہِ بے قراری کے مذہب میں جرم ہے۔

چو ز بادہ بہارے' قدحے کشیدہ خیزم
غزلے دگر سرایم' بہ ہوائے نو بہارے

(پیامِ مشرق:۱۲۷)

بہار کا موسم کسے خوش نہیں آتا؟ یہ مرغانِ ہوا' یہ جانورانِ صحرائی' یہ انسان والا شان' کسے یہ موسم پسند نہیں؟ میں بھی اسے پسند کرتا ہوں۔ یہ آتا ہے تو اس کا استقبال دل کھول کر کرتا ہوں۔ بادۂ ناب اور جامِ صہبا سے لطف اٹھاتا ہوں۔ لیکن' جلد ہی دل اکتا جاتا ہے اور آنے والے موسمِ بہار کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ اس کی شان میں غزل سرائی کرنے لگتا ہوں۔

---نئی بہار' نیا نغمہ:

طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے نہ دارد
بہ نگاہِ ناشکیبے' بہ دلِ امید وارے

(پیامِ مشرق:۱۲۸)

یہ بات تجھے عجیب سی تو لگے گی' لیکن واقعہ یہی ہے کہ میں اس نہایت کا طلبگار ہوں' جس کی کوئی انتہا نہیں۔ میں اس منزل تک پہنچنا چاہتا ہوں جو ہمیشہ نظروں سے اوجھل رہے گی۔ میرا مقصد وہ ہے جو کبھی نہیں حاصل ہو سکتا۔---یہ نگاہ ناشکیب اور یہ دل امیدوار' تیرے لیے نہیں ہے' صرف اس کے لیے ہے' جو میرے لیے بھی نا معلوم ہے اور تیرے لیے بھی۔

دلِ عاشقاں بہ میرد' بہ بہشت جاودانے
نہ نوائے درد مندے' نہ غمے' نہ غمگسارے!

(پیامِ مشرق:۱۲۸)

یہ بہشت جاوداں' جہاں نہ کوئی نوائے دردمند ہے' نہ کسی طرح کا غم اور فکر' نہ کوئی ہمدرد' اور غمگسار' عاشق کے لیے مقامِ حیات نہیں مقامِ مرگ ہے۔---لہٰذا اے حور! تجھے اور تیری جنت کو دُور سے سلام۔

(۵۷)

نوائے حیات

ساری زندگی اقبال نے ایک ہی کام میں بسر کردی یعنی اپنے ملک اور اپنی قوم تک پیام خود پہنچایا کیے لیکن اس نوائے حیات کا وہ اثر۔۔۔کم از کم ان کی زندگی میں۔۔۔مرتب نہیں ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ آخر دل شکستگی اور مایوسی کے عالم میں کہتے ہیں:

بہ خاک ہند نوائے حیات بے اثر است
کہ مردہ زندہ نہ گردد ز نغمۂ داوٗد

(پیام مشرق:۱۴۴)

سرزمین ہند پر نوائے حیات کارگر نہیں ہوتی اور اس نوائے حیات کے کارگر نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ نغمۂ داؤدی بھی کسی مردہ میں زندگی نہیں پیدا کرسکتا۔

اس مایوسی کے بعد شاعر سمجھتا ہے کہ جب وہ اس دُنیا سے رخصت ہوجائے گا تب اس کی نوائے حیات کارگر آئے گی لوگ اس کی قدر کریں گے اس کی غزل سرائی اور نغمہ طرازی کو یاد کریں گے اس کی تربت پر آئیں گے اور پھول چڑھائیں گے۔

چنانچہ کہتا ہے:

حلقہ بستند سر تربتِ من نوحہ گراں
دل براں زہرہ وشاں گل بدناں سیم براں

(پیام مشرق:۱۴۴)

جب تک میں زندہ رہا میرے سخن پر کسی نے توجہ نہ کی، میرے پیام سے اعراض کرتے رہے، اب جب کہ میں مر چکا ہوں تو میری تربت کو نوحہ گراں نے گھیر رکھا ہے اور وہ بت طناز' جو کسی سے آنکھ نہیں ملاتے تھے' نوحہ و ماتم اور آہ و فغاں میں مصروف ہیں۔

در چمن قافلۂ لالہ و گل رخت کشود
از کجا آمدہ اند ایں ہمہ خونیں جگراں؟

(پیامِ مشرق:۱۴۴)

چمن میں قافلۂ نسرین و نسترن' لالہ و گل ڈیرے ڈالے پڑا ہے۔ میرا سینہ بھی داغدار ہے' لالہ و گل کے سینہ پر بھی داغِ حسرت موجود ہے۔ یہ خونیں جگر ہستیاں کہاں سے آ کر باغ و چمن میں جمع ہو گئی ہیں؟

اے کہ در مدرسہ جوئی ادب و دانش و ذوق
نہ خرد بادہ کس از کارگہِ شیشہ گراں!

(پیامِ مشرق:۱۴۴)

اے شخص!۔۔۔ کہ تو مدرسۂ مکتب میں' ادب' دانش اور ذوق سلیم کی جستجو میں آیا ہے۔ تیری سادہ لوحی قابلِ رحم ہے۔ یہ چیزیں اس بازار میں کہاں دستیاب ہو سکتی ہیں؟ بھلا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ شیشہ گروں کی دکان سے کوئی شخص بادۂ صافی خرید لائے جا کر؟

خرد افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں!

(پیامِ مشرق:۱۴۵)

میں نے مغرب کی دانش گاہوں میں اپنی عمر عزیز کا بڑا حصہ صرف کیا اور یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ فائدہ بھی اٹھایا' میری عقل بڑھی' دانش میں اضافہ ہوا' لیکن دل کو ان دانش گاہوں سے کچھ نہ ملا، سینہ خالی ہی رہا۔ قلب و روح کے لیے جو کچھ میں نے حاصل کیا وہ اہل دل اور اہل نظر بزرگوں کے فیضِ صحبت سے۔ یہ صحبت اگر میسر نہ آتی تو یہ دانش افرنگی تو مجھے لے ڈوبتی۔ لیکن اس فیضِ صحبت نے میری روح میں جلا پیدا کر دی، میرے خیالات روشن

کر دیے، میرا دل پاک کر دیا، میری نظر میں وسعت پیدا کر دی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میری بصیرت بڑھا دی۔ لہٰذا اصل چیز دانش نہیں، محبت اہل دل ہے، جو کچھ ملتا ہے یہیں سے ملتا ہے۔

بر کش آں نغمہ کہ سرمایہ آب و گل تست
اے ز خود رفتہ تہی شوز نوائے دگراں

(پیامِ مشرق: ۱۴۵)

اگر تو بھی وہ بننا چاہتا ہے، جو میں ہوں، وہ حاصل کرنا چاہتا ہے، جو میں نے حاصل کیا ہے تو پھر اس نغمہ پر توجہ کر، جو تیرے آب وگل کا سرمایۂ حقیقی بن سکے۔ یعنی خود شناسی اور خودنگری اور خودی اور دوسروں کی نوائے بے معنی سے اپنا دامن بچالے۔

کس نہ دانست کہ من نیز بہائے دارم
آں متاعم کہ شود دست زدِ بے بصراں

(پیامِ مشرق: ۱۴۵)

میری قدر و قیمت کسی نے نہ جانی۔ میں وہ جمع پونجی ہوں جو اندھوں کے ہاتھ پڑ گئی ہے، جو صرف ٹٹول کر اس کی قیمت ڈھونڈتے ہیں، دیکھ کر کوئی رائے نہیں قائم کر سکتے۔

گریہ ساماں مَیں، کہ میرے دل میں ہے طوفانِ اشک
شبنم افشاں تو، کہ بزمِ گل میں ہو چرچا ترا
گل بدامن ہے مری شب کے لہو سے میری صبح
ہے ترے امروز سے ناآشنا فردا ترا
یوں تو روشن ہے، مگر سوزِ دروں رکھتا نہیں
شعلہ ہے مثلِ چراغِ لالہ صحرا ترا

(بانگِ درا: ۱۸۴)

(۵۸)

مرغِ نواطراز

شاعر کسی ایک کیفیت کا پابند نہیں ہوتا' اس پر مختلف' متعدد اور متنوع قسم کی کیفیتیں طاری ہوتی رہتی ہیں اور ان کا وہ اپنے مخصوص و منفرد رنگ میں اظہار کرتا رہتا ہے۔ کبھی تغزل کے رنگ پر آتا ہے تو کہہ اٹھتا ہے:

یک نگہ' یک خندہ زر دیدہ' یک تابندہ اشک
بہر پیمانِ محبت نیست سو گندے دگر

(پیامِ مشرق:۱۴۵)

لیکن ایسی کیفیتیں زیادہ دیرپا نہیں ہوتیں۔ تغزل کا رنگ گو اقبال کے ہاں چوکھا ہے' لیکن بہت کم ہے۔ ان کا اصل رنگ دوسرا ہے اور وہی ان کے سارے کلام پر ساری زندگی پر چھایا ہوا ہے۔ یعنی:

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے' جو رُوح کو تڑپا دے

(بانگِ درا:۲۱۲)

ہیر پھیر کے نئے نئے طرز و اسلوب سے' وہ بھی ایک بات دہراتے رہتے ہیں۔ اس تکرار و اعادہ سے نہ خود بے کیف ہوتے ہیں نہ دوسروں کو بے کیف ہونے دیتے ہیں۔

اقبال نے اپنی زندگی میں اپنے کلام کا کسی نہ کسی حد تک اثر دیکھ لیا اور وہ بڑی حد تک خوش گوار اور امید افزا تھا۔۔۔۔۔۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کی نغمہ سرائی نے ہندوستان و

پاکستان کے مسلمانوں میں ایک نیا جوش ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا۔غلامی کی زندگی سے وہ بیزار ہو گئے' آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔وطنیت کے خلاف سب سے زیادہ شدید اور پرخراش جہاد اقبال نے کیا تھا' وہ جانتے تھے اور بتاتے تھے۔

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے (بانگِ درا:۱۶۰)

انھوں نے صاف اور واضح الفاظ میں مسلمانوں کو بتا دیا تھا کہ یہ وطنیت وہ چیز ہے جو'

غارت گر کاشانہ دینِ نبویؐ ہے (بانگِ درا:۱۶۰)

اور مسلمانوں نے اس راز کو اچھی طرح سمجھ بھی لیا تھا۔بے شک ان کے ایک حصہ نے وطن کا بت بنایا اور اُس کی پوجا شروع کر دی۔لیکن غالب ترین حصہ وطنیت سے بیزار اور ملت کا پرستار رہا۔یہی وجہ تھی کہ اس نے عالمِ اسلام کا ہند میں غلام ہونے کے باوجود پورا پورا ساتھ دیا، کسی مسلمان ملک پر آفت آگئی اور یہاں کے مسلمان بے قرار ہو گئے' کسی ملک میں' کسی مسلمان کے پاؤں میں کانٹا چبھا اور یہاں مسلمان اس کی خلش اپنے دل میں محسوس کرنے لگے' ترکوں پر اتحادی حکومتوں نے پہلی جنگ عظیم کے اختتام کے بعد قیامت توڑی؛ اس دیس کے مسلمان سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو گئے، انھوں نے تحریکِ خلافت کے نام سے ایسی عظیم الشان تحریک چلائی جس کی مثال ایشیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی، وہ غریب تھے لیکن انہوں نے کروڑوں روپیہ کا ڈھیر لگا دیا کہ اس سے ترکوں کی اعانت کی جائے، وہ غلام تھے لیکن انھوں نے ترکوں کی تائید و حمایت میں جیل کی کوٹھریاں بھر دیں، دار و رسن کو لبیک کہا، اپنی اموال واملاک کو ضبط کرا دیا اور برطانوی سامراج کے قصرِ فلک پیما میں زلزلہ ڈال دیا۔مصر پر جب کوئی ناگہانی آفت آئی یہاں کے مسلمان بے قرار ہو گئے اور اس کی امداد و اعانت میں انھوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔عراق پر جب تباہی آئی تو یہاں کے مسلمانوں نے ایسا محسوس کیا جیسے یہ تباہی انہی پر آئی ہے۔فلسطین پر جب یہودیوں کی یورش ہوئی اور امریکہ' برطانیہ اور دوسری مملکتوں نے وطن الیہود کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانا چاہا اور اس سلسلہ میں کشت و خون کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ یہاں کے مسلمان ہی تھے جنھوں نے صیہونی تحریک کے خلاف سر اور دھڑ کی بازی لگا دی اور اس طرح سے مسلمانانِ فلسطین کی پشت پناہی کی' شام پر جب فرانسی سامراج

نے دستِ تعدّی دراز کیا تو وہ یہاں کے مسلمان ہی تھے جنہوں نے بے بس، بے سہارا اور غلام ہوتے ہوئے بھی اپنی قوت و طاقت کا ایسا شاندار مظاہرہ کیا کہ دول مغرب کو سکتہ ہو گیا۔ غرض جب کبھی کوئی حادثہ عالمِ اسلام میں رونما ہوا مسلمان نچلے نہ بیٹھ سکے۔ انھوں نے وہ سب کچھ کیا جو ایک آزاد اور فعال قوم کر سکتی ہے۔ حالانکہ وہ آزاد تھے نہ فعال نہ کارگزار۔

لیکن خود عربوں کا کیا حال تھا؟

جن عربوں نے دینِ اسلام پھیلایا، جنہوں نے دُنیا کو اخوت، مساوات اور انسانیت نوازی کا درس دیا، جنہوں نے سب سے پہلی مرتبہ

ہر ملک، ملک است کہ ملک خدائے ماست

کا نعرہ بلند کیا، جنہوں نے اپنے وطن سے نکل کر ساری دُنیا میں اپنے دین کا پرچم لہرایا اور دُنیا کو باور کرا دیا کہ یہ دین کسی خاص سرزمین، کسی خاص قوم، کسی خاص نسل سے وابستہ نہیں ہے۔ یہ ایسا دین ہے جس کے حلقہ میں ہر شخص داخل ہو سکتا ہے، خواہ وہ فرنگی ہو یا ہندی، حبشی ہو یا زنگی، دراز قامت ہو یا پستہ قد، اور اس حلقہ میں داخل ہونے کے بعد سب بھائی بھائی بن جاتے ہیں۔ پھر ان میں کوئی امتیاز تقوٰی کے سوا قائم نہیں رہتا۔ مساوات و اخوت کا یہ عدیم المثال نظارہ دُنیا نے صرف مسلمان قوم ہی میں دیکھا تھا، لیکن اب وہی عرب تھے جو اپنے دین کی اس بنیادی تعلیم کو فراموش کر چکے تھے، وہ وطنیت کے چکر میں گرفتار ہو چکے تھے، انھوں نے جو سبق دوسروں کو پڑھایا تھا، خود اسے حرفِ غلط کی طرح اپنے صفحۂ قلب سے مٹا چکے تھے۔ مصر ہو یا عراق، شام ہو یا حجاز، نجد ہو یا یمن، شرق اردن ہو یا لبنان، ہر جگہ مسلمانوں کا نعرہ اب وطن ہی تھا، دین نہ تھا۔۔

اقبال یہ دل خراش منظر دیکھتے تھے اور کڑھتے تھے۔ یہی کیفیت تھی، جو الفاظ کا جامہ پہن کر شعر کی صورت میں نمایاں ہوئی۔

نوائے من بہ عجم آتشِ کہن افروخت
عرب زنغمہ شوقم ہنوز بے خبر است

(پیامِ مشرق: ۱۴۷)

یعنی عجم نے تو کسی حد تک میری بات سنی، میرا پیام سمجھا، لیکن عرب ہنوز میرے نغمۂ شوق سے بے خبر اور بے پروا ہے وہاں تک نہ میری آواز پہنچی ہے نہ پیام، حالانکہ سب سے زیادہ ضرورت اس کی تھی کہ میرا پیام وہاں تک پہنچتا۔

اقبال اپنی شاعری سے ایران و توران، افغانستان و ہندوستان، چین و ماچین، سمرقند و بخارا، حجاز و یمن، شام و عراق اور مصر و مغرب اقصی ہر جگہ کے مسلمانوں میں وہی جوش پیدا کرنا چاہتے تھے جو آغازِ اسلام میں ان کے اندر پایا جاتا تھا اور جس نے انہیں دُنیا کے بہت بڑے حصہ کا مالک بنا دیا تھا اور یہ سطوت حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اپنی محکوم دُنیا کو ایک نئی اور شاندار زندگی سے آشنا کر دیا تھا، وہ جب عالمِ اسلام پر جمود کی کیفیت طاری دیکھتے تھے تو بے قرار ہو جاتے تھے کہ یہ وہی قوم ہے جو کبھی آگ تھی اور اب خاکستر؟

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

مسلمان قوم اور اس کا یہ حسرت ناک انجام؟ وہ چاہتے تھے، مسلمان پھر وہی مسلمان بن جائیں جو پہلے تھے اور اس کی بنیادی شرط یہ تھی کہ وہ لذتِ پرواز سے آشنا ہوں اور پابندِ مقام بن کر نہ بیٹھ جائیں۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

بہ آشیاں نہ نشینم، ز لذتِ پرواز
گہے بہ شاخِ گلم، گاہ برلب جویم

(پیام مشرق:۱۴۸)

یعنی لذتِ پرواز نے بعد میں یہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ میں پابندِ مقام ہو کر آشیانہ میں بیٹھنا ہی پسند نہیں کرتا۔ کبھی شاخِ گل پر، نغمہ طرازی کرتا ہوں، کبھی لب جو غزل سرائی۔

یہی جذبہ جب زیادہ بے قرار کرتا ہے تو کہہ اٹھتے ہیں:

خیز و نقاب برکشا، پردگیانِ سازرا
نغمۂ تازہ یاددہ مرغ نوا طراز را

(پیام مشرق:۱۴۹)

یعنی اُٹھ اور مرغِ نوا طراز کو پھر اسی نغمہ سے مدہوش کردے، جس نے ایک مرتبہ اس سے پہلے بھی دُنیا میں ایک نیا جوش برپا کردیا تھا۔

پھر ظاہر پرست اور تصنع کے خوگر مسلمانوں سے مخاطب ہوتے ہیں۔

سجدہ تو برآورد، از دلِ کافراں خروش
اے کہ دراز تر کنی پیشِ کساں نماز را

(پیامِ مشرق:۱۴۹)

ایک زمانہ تھا کہ تیرے نعرۂ اللہ ھُو نے ساری دُنیا کو لرزہ براندام کردیا تھا اور اب یہ کیفیت ہے کہ تو خود اصلی جذبہ سے محروم ہوچکا ہے۔ نماز پڑھتا ہے تو دکھاوے کی اور اس کا تصنع اتنا نمایاں ہوتا ہے کہ اور تو اور کافر تک تیرے اس سجدۂ ریائی کی حقیقت سمجھنے لگے ہیں اور اس طرح وہ تجھے سجدہ ریز دیکھ کر افسوس کرتے ہیں کیوں اپنا وقت ایسے کام میں ضائع کررہا ہے جس کا اثر خود تیری ذات پر کسی طرح کا مرتب ہوتا ہے نہ دوسروں پر'

گرچہ متاعِ عشق را، عقل بہائے کم نہد
من ندہم بہ تختِ جم، آہ جگر گداز را

(پیامِ مشرق:۱۴۹)

اے مسلمان!

اپنے احوال ومقامات سے آگاہ ہو، اپنی حقیقت پہچان، پھر اپنے اندر وہ آہ جگر گداز پیدا کر جس نے تجھے میرِ قافلہ بنادیا تھا اور جسے کھودینے کے بعد تیرا شمار قافلے کے پیچھے چلنے والوں میں بھی نہیں رہ گیا ہے۔ مجھے دیکھ، مجھ فقیرِ بے نوا کو، مجھے یہ آہ جگر گداز اتنی عزیز ہے کہ اسے دے کر تختِ جم بھی نہ لوں۔

وہی بات جو ابھی پہلے انھوں نے کی تھی، پھر اسے دُہراتے ہیں، واردات اپنے بیان کرتے ہیں، درس قوم کو دیتے ہیں:

زمقامِ من چہ پرسی بہ طلسمِ دل اسیرم
نہ نشیبِ من نشیبے، نہ فرازِ من فرازے

رہِ عاقلی رہا کن کہ باوتواں رسیدن
بہ دلِ نیاز مندے، بہ نگاہِ پاک بازے
بہ رہِ تو ناتمامم، زتغافلِ تو خامم
من و جان نیم سوزے، تو وچشمِ نیم بازے

(پیامِ مشرق:۱۵۰)

طلسم دل کی کیفیت، نشیب وفراز کے اسرار ورموز، راہِ عقل کی کج روی، دل نیاز منداور نگہ پاک باز کی اثرانگیزی، اپنی ہستی کی ناتمامی وخامی، جان نیم سوز اور چشم نیم باز کی داستان سنانے کے بعد اپنے مقصد کی اور زیادہ وضاحت کرتے ہیں۔۔۔لیکن بڑے خوشنما طریقہ سے

صورت نہ پرستم من، بت خانہ شکستم من
آں سیلِ سبک سیرم، ہر بند گسستم من

(پیامِ مشرق:۱۵۲)

یعنی میں صورت پرست نہیں ہوں، نہ اصنام سنگی کی پرستش کرتا ہوں، نہ اصنام خیال کے سامنے سر جھکاتا ہوں، میرا کام بت خانوں کو، خواہ وہ نفس کے ہوں یا مادے کے، توڑ دینا ہے، میں سیل سبک سیر ہوں، جو ہر بند کو، ہر رکاوٹ کو توڑ دیتا ہے، پاش پاش کر دیتا ہے۔یہی خصوصیت کبھی مرد مسلماں کی تھی اور آہ کہ اب اس خصوصیت سے وہ محروم ہو چکا ہے۔

قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں
تنگ ہے صحرا ترا، محمل ہے بے لیلا ترا
اے دُرِ تابندہ! اے پروردۂ آغوشِ موج!
لذتِ طوفان سے ہے ناآشنا دریا ترا
اب نوا پیرا ہے کیا؟ گلشن ہوا برہم ترا!
بے محل تیرا ترنم، نغمہ بے موسم ترا

(بانگ درا:۱۸۵)

(۵۹)

رمزِ حیات

تپش، خلش، اضطراب، اضطرار۔۔۔۔یہ ہے زندگی کا، نہیں، زندگی کا نہیں، زندہ رہنے کا اور زندہ قوم بننے کا راز!۔۔۔اقبال اسی راز کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔وہ بتاتے ہیں، اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو قرار و قیام نہ اختیار کرو۔قرار و قیام کا تعلق زندگی سے نہیں موت سے ہے۔مرنا چاہتے ہو تو ٹھہر جاؤ، رک جاؤ، قیام اختیار کرلو۔قرار کے خوگر ہو جاؤ، لیکن زندگی مطلوب ہے تو سیماب کی طرح، موجِ بے قرار کی طرح، آزاد جستجو پیدا کرو اور ایک ایسی منزل کی طرف جس کی کوئی انتہا نہیں، بڑھو بڑھے چلو بڑھتے چلے جاؤ۔

یہی درس دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

رمزِ حیات جوئی؟ جز در تپش نیابی
در قلزم آرمیدن ننگ است آبِ جُو را

(پیامِ مشرق:۱۵۳)

رمزِ حیات معلوم کرنا چاہتے ہو تو وہ صرف یہ ہے کہ تپش اور خلش کی زندگی اختیار کرلو۔دریا کا وجود اسی وقت ختم ہو جاتا ہے جب وہ قلزم (سمندر) میں گرتا ہے، اپنا وجود باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنی انفرادیت قائم رکھو اور انفرادیت وہی قائم رکھتے ہیں جو زندہ ہوں، جو مر چکے ہوں، یا مرنا چاہتے ہو انہیں انفرادیت سے کیا تعلق؟

شادم کہ عاشقاں را سوزِ دوام دادی
درماں نیا فریدی آزارِ جستجو را

(پیامِ مشرق:۱۵۴)

اے خدا۔۔۔۔۔!

میں خوش ہوں کہ تو نے' عاشقوں کو سوزِ دوام کی نعمت عطا فرمائی ہے اور ان کے آزارِ جستجو کا کوئی مداوا نہیں پیدا کیا ہے۔ اگر آزارِ جستجو کا مداوا تو پیدا کر دیتا تو پھر یہ سوزِ دوام کی نعمت کہاں ملتی؟

از نالہ بر گلستاں آشوبِ محشر آور
تادم بہ سینہ پیچد' مگذار ہائے وھورا

(پیامِ مشرق:۱۵۴)

اپنے نالہ سے' اپنے شورِ جنوں انگیز سے' گلستان میں آشوبِ محشر برپا کر دے۔ اس لیے کہ یہاں کے لوگ بہرے ہیں' سنتے نہیں۔ جب تک دم میں دم ہے' جب تک تیرے سینہ میں دل دھڑک رہا ہے اپنے شورِ جنوں انگیز' اپنے ہاؤ ہو اور اپنے نعرۂ بے باکانہ میں فرق نہ آنے دیں کہ یہی اصل حیات ہے۔ اسی طرح تو زندہ رہ سکتا ہے' اسی طرح تو دوسروں میں زندگی کی حرارت اور تڑپ پیدا کر سکتا ہے۔

پھر ایک دوسرے مقام پر بتاتے ہیں کہ اگر تو اپنے اندر سوزِ حیات' جذبۂ حیات دوام اور سوزِ تمام پیدا کرے' پھر تجھے کیا کرنا چاہیے۔ آخر اس شورِ جنوں انگیز کا کوئی مقصد تو ہونا چاہیے اس ہاؤ ہو کو بے مقصد تو نہ ہونا چاہیے۔ مانا کہ تو نے آسمان و زمین میں جنبش پیدا کر دی، ساری دُنیا کو تہ و بالا کر دیا لیکن حاصل؟ مقصد؟ یہ بھی تو کچھ ہونا چاہیے۔ وہ کیا ہے؟

اقبال بتاتے ہیں وہ مقصد ہے مسلکِ شبیری' اور یہ نہیں حاصل کر سکتا تو میرے قریب نہ آ

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست
با من میا کہ مسلکِ شبیرم آرزوست (پیامِ مشرق:۱۵۶)

میرا مقصد؟

میرا مقصد تو تیر وسناں و خنجر و شمشیر ہے۔ کسی غلط کام کے لیے نہیں۔ حصولِ جاہ واقتدار کے لیے نہیں، مال غنیمت اور جوع الارض کے لیے بھی نہیں' دوسرے لوگوں کو غلام بنانے کے لیے بھی نہیں' یہ مقصد مسلک شبیر کے تتبع میں مَیں نے پیش نظر رکھا ہے۔ حسینؓ کا مقصد اپنی سلطنت کا قائم کرنا نہیں تھا' اعلاء کلمۃ الحق تھا۔ دین اسلام کی سربلندی تھا' وہ اس وقت تیر وسناں اور خنجر و شمشیر لے کر میدانِ جہاد میں اترے تھے جب اسلام کو فراموش کر دیا گیا تھا۔ اسلام کے احکام پامال کیے جا رہے تھے، اسلام کی تعلیمات دل سے محو ہو چکی تھیں، ایک غیر اسلامی' غیر الٰہی اور غیر انسانی حکومت مسلمانوں پر مسلط کر دی گئی تھی۔ اسے توڑنے کے لیے' اسے فتح کرنے کے لیے' تلوار اٹھانے کی ضرورت تھی۔ میدانِ کربلا اس حقیقت کا مظہر ہے اور تو مسلمان ہے' تو اس حقیقت کو فراموش نہ کر۔ اس سبق کو یاد رکھ اور اگر تو یہ نہیں کرنا چاہتا تو پھر میرا راستہ اور ہے' تیرا راستہ اور' پھر تو میرے پاس نہ آ۔ پھر میں تجھے کچھ نہیں دے سکتا' پھر تو مجھ سے کچھ نہیں حاصل کر سکتا۔

گفتند لب بہ بندوز اسرار ما مگو
گفتم کہ خیر! نعرہ تکبیرم آرزوست

مجھ پر قدغن ہے کہ میں اسرارِ الٰہی فاش نہ کروں' ٹھیک ہے، میں اس حکم کی پابندی کروں گا، لیکن تمنا صرف یہ ہے کہ ایک مرتبہ نعرہ اللہ اکبر بلند کرلوں۔

اور نعرہ اللہ اکبر بلند کرنے کے بعد پھر رہ کیا گیا جو کہا جائے۔ اللہ اکبر' یعنی اللہ سب سے بڑا ہے۔ جس نے یہ کہہ دیا' اس نے سب کچھ کہہ دیا، جس نے خدا کو سب سے بڑا مان لیا' پھر وہ کسی کی بڑائی کے آگے سر جھکا سکتا ہے؟

کبھی کبھی اقبال اپنے مشرب کی طرف بھی اشارہ کر دیتے ہیں اور یہ مشرب خودی کے سوا کچھ نہیں۔

من فقیرِ بے نیازم مشربم این است وبس
مومیائی خواستن نتوان، شکستن می تواں

(پیام مشرق:۱۶۰)

میں ایک بے نیاز فقیر ہوں، کسی کے سامنے دریوزہ گری نہیں کرتا۔ نہ مال ودولت کی، نہ جاہ ومنصب کی، نہ اقتدار واختیار کی، نہ زندگی اور حیات مستعار کی۔ مجھے مرجانا منظور ہے لیکن زخمِ دل کے علاج کے لیے کسی سے مومیائی مانگنا منظور نہیں۔

پھر ایک اور مقام پر یہی بات بہ انداز دگر فرماتے ہیں:۔

نازِ شہاں نمی کشم، زخمِ کرم نمی خورم
درنگر اے ہوس فریب ہمت ایں گدائے را

(پیام مشرق:۱۶۲)

اس جذبہ کو اور زیادہ نمایاں اور شاندار طور پر ایک دوسری جگہ پیش کرتے ہیں:۔

نہ بہ امروز اسیرم، نہ بہ فردا، نہ بدوش
نہ نشیبے، نہ فرازی، نہ مقامے دارم

(پیام مشرق:۱۶۴)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

پردہ بر گیرم و در پردہ سخن می گویم
تیغ خوں ریزم و خود رابہ نیامے دارم

(پیام مشرق:۱۶۴)

ایک غزل کا شعر

حدیثِ دل بہ کہ گویم، چہ راہ برگیرم
کہ آہ بے اثر است ونگاہ بے ادبی است

(پیام مشرق:۱۶۴)

(۶۰)

نوائے پریشاں

نوائے پریشاں۔۔۔۔شاعر کی فطرت ہے وہ اگر اپنا موضوع نہ بدلتا رہے، اسلوب وانداز میں تغیر نہ کرتا رہے، تو پھر وہ شاعر کہاں رہا؟۔۔۔اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ فکری تنوع شاعر کے پیام اور دعوت پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، یہ بات نہیں ہے، پیام اور دعوت اپنی جگہ ہے، لیکن فکر وخیال کا تنوع اپنے مقام پر، خود ہی کہتے ہیں:

اقبال بہ منبر زد رازے کہ نہ باید گفت
نا پختہ بروں آمد از خلوتِ میخانہ

(پیامِ مشرق:۱۶۶)

بتایئے اس سے بڑھ کر راز اور عمیق فلسفہ کیا ہوسکتا ہے۔۔۔۔ذات باری تعالیٰ کو مخاطب کرکے کتنی گہری بات، کتنے سبک اور دل نشیں الفاظ میں فرماتے ہیں:

بے تو از خواب عدم دیدہ کشودن نتواں
بے تو بودن نتواں، با تو نبودن نتواں

اتنا گہرا خیال اتنے مختصر اور بلیغ الفاظ میں صرف اقبال ہی ادا کر سکتے تھے، فرماتے ہیں:

اے خدا! اگر تو نہ ہوتا، تو خوابِ عدم سے ہمارے آنکھ کیسے کھلتی؟ ہم کیوں کر عالمِ وجود میں آسکتے تھے؟ ہماری ہستی تیرے وجود کی سب سے بڑی اور ناقابلِ شکست دلیل ہے۔تو نہ ہوتو کسی ہستی کا عالم وجود میں آنا ناممکن اور قطعاً ناممکن تو ہو اور ہست وو جود کی کارفرمائی نہ

ہو یہ اس سے زیادہ ان ہونی اور ناممکن بات ہے۔

در جہاں است دلِ ما کہ جہاں در دلِ ماست

لب خرد بند کہ ایں عقدہ کشودن نتواں

(پیامِ مشرق:۱۶۶)

یہ سوال کہ یہ دُنیا سیمیا کی سی ہستی رکھتی ہے یا حقیقتاً اس کا کوئی وجود ہے؟ یہ وجود خارج میں ہے یا ہمارے تصوّر کی کرشمہ سازی ہے جیسا کہ غالب نے کہا ہے:

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

یا خود اقبال بعض مواقع پر محض "اندازِ بیان" سے تعبیر کر چکے ہیں۔ بہر حال یہ بات کہ ہم دُنیا میں ہیں یا دُنیا ہم میں ہے بڑی نازک اور پیچیدہ بات ہے۔ یہ ایسی گتھی ہے جو سلجھ نہیں سکتی، ایسا معمہ ہے جو حل نہیں ہو سکتا، ایسی گرہ ہے جو کسی کے کھولے نہیں کھل سکتی، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اس مسئلہ پر جنبشِ لب سے کام نہ لیا جائے۔

جانتے ہیں یہ باتیں اتنی گہری ہیں کہ ہر شخص کی ان تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ ہر شخص انہیں سمجھ نہیں سکتا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

دلِ یاراں زنواہائے پریشانم سوخت

من ازاں نغمہ تپیدم کہ سرودن نتواں

(پیامِ مشرق:۱۶۷)

دوستوں اور ساتھیوں کے دل میرے نوائے پریشاں سے تنگ آ چکے ہیں اور وہ مجبور بھی ہیں۔ بات بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ میں وہ نغمہ الاپ رہا ہوں جو پابندِ سرود نہیں ہو سکتا یعنی گایا بھی نہیں جا سکتا۔

لیکن وہ نغمہ کیا ہے؟ وہ بھی سن لیجیے:

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے

یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ (پیامِ مشرق:۱۶۶)

یعنی میرے دشتِ جنوں میں جبریل ایک صیدِ زبوں ہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اے ہمتِ مردانہ تو جو چاہے تو یزداں کو گرفتارِ کمند کر سکتی ہے' یعنی' جو خدا کا ہو رہتا ہے' وہ پھر صفاتِ خداوندی حاصل کر لیتا ہے۔

مردانِ خدا' خدا نہ باشند
لیکن ز خدا' جدا نہ باشند

اقبال نے اس شعر میں جو کچھ کہا ہے' وہ درحقیقت اسلام کی اصل روح اور اصل تعلیم ہے۔ مسلمان جب تک خدا سے دُور رہیں گے' خوار اور رُسوا ہوتے رہیں گے اور جب وہ خدا کے رنگ میں رنگ جائیں پھر وہی قوت بن جائیں گے' جس نے نہ صرف روما کا بلکہ دُنیا کا تختہ الٹ دیا تھا۔

اقبال کے یہ افکار، از روئے تخیل نئے نہیں ہیں، یہی بات مولانا روم بھی

فرشتہ صید و پیغمبر شکار و یزداں گیر

فرما چکے ہیں لیکن اندازِ بیان زیادہ بلند ہے اور نقشِ ثانی' نقشِ اوّل سے عام طور پر بہتر ہوتا ہی ہے:

دل بہ حق بندو کشا دے زسلاطیں مطلب
کہ جبیں بردر ایں بت کدہ سودن نتواں

اگر تو سچا مسلمان ہے تو پھر تیرا ماتھا صرف خدا کے سامنے جھکنا چاہیے۔ یہ سلاطین جہاں' تجھے کیا کیا اور کہاں تک دیں گے؟ یہ تو خود محتاج ہیں' ان کا یہ جاہ و جلال ہی اس وقت تک ہے جب تک خدا کو منظور ہے تؤتی الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشاء جسے چاہتا ہے حکومت اور ملک عطا فرما دیتا ہے' جس سے چاہتا ہے حکومت اور ملک چھین لیتا ہے۔ تاریخ کے صفحات ایسے واقعات سے بھرے پڑے ہیں کہ جو سلطان ذی فرمان تھے وہ گلیوں میں بھیک مانگنے لگے اور جو فقیر رہ نشین تھے وہ تختِ بادشاہت پر متمکن ہو کر حکومت کرنے لگے۔ لہٰذا مسلمان کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ درِ سلطان پر دریوزہ گری کرے اور خدائے بزرگ و برتر کو فراموش کر دے۔ اس بُت کدہ پر سر جھکائے' انسانیت کی توہین ہے' بلکہ انسانیت کیا چیز ہے

خالق ارض و سماء کی توہین ہے۔جس کے دل میں شمہ برابر بھی ایمان ہو وہ بادشاہوں اور سلطانوں کے در پر سر نہیں جھکا سکتا' وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتا' جو توحید کے خلاف ہو' جس سے توحید کے عقیدہ پر زد آتی ہو' ضرب پڑتی ہو۔توحید کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ انسان ماسوائے اللہ کے یکسر بے نیاز اور بے پروا ہو جائے اور صرف خدا کا ہو رہے۔

اور یہی شاعر' جو اتنی اونچی' اتنی گہری اور اتنی ٹھوس باتیں کرتا ہے جب غزل سرائی پر آتا ہے تو بھی کسی سے پیچھے نہیں رہتا۔سب سے آگے نکل جاتا ہے۔ملاحظہ کیجیے موسمِ بہار کی جنوں پرور کیفیت بیان کرتے ہوئے کس طرح دعوت سیر گل دیتا ہے:

بر خیز کہ فرور دیں افروخت چراغ گل
بر خیز و دمے بہ نشیں با لالۂ صحرائی

(پیامِ مشرق:۱۶۷)

اے دوست!

اٹھ کہ بہار کا جان پرور موسم آ گیا' چمن کے چپہ چپہ پر پھولوں کے چراغ روشن ہو گئے۔یہ وقت گوشۂ عزلت میں بیٹھنے کا نہیں' اٹھ اور سیر گل کر' لالہ صحرائی کے ساتھ کچھ وقت گزار' اس لیے کہ اس میں اور تجھ میں مناسبت ہے۔وہ بھی عشق پیشہ ہے اور تو بھی عاشق ہرجائی' اس کا سینہ بھی داغدار ہے اور تو بھی اپنے سینہ میں یہ پونجی چھپائے ہوئے ہے۔

عشق است و ہزار افسوں' حسن است و ہزار آئیں
نے من بہ شمار آیم' نے تو بہ شمار آئی

(پیامِ مشرق:۱۶۸)

عشق کے ہزاروں انداز ہیں' حسن کی ہزاروں ادائیں ہیں' نہ ان کا شمار کیا جا سکتا ہے نہ یہ شمار میں آ سکتی ہیں۔

اور یہی سیرِ چمن اور مشاہدہ گل کی دعوت دینے والا شاعر' جب حکیمانہ باتوں پر آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اسے نہ گل سے غرض ہے نہ لالہ صحرائی سے۔نہ یہ رنگیں مزاج ہے' نہ اس سلسلہ میں رعنائی خیال ہے۔یہ صرف ایک انقلابی ہے' جس کے الفاظ میں خروش ہے'

رعنائی نہیں، جس کے انداز میں طنطنہ ہے' جمال نہیں' جس کے تیور میں دہشت ہے' ملاطفت نہیں ۔۔۔ کتنے ذوق اور کتنے جوش کے ساتھ کہتا ہے:

وائے آں قافلہ کز دونی ہمت می خواست
رہ گزارے کہ درو ہیچ خطر پیدا نیست

(پیامِ مشرق: ۱۷۰)

اس قافلہ سے زیادہ قابلِ افسوس بات کس کی ہوگی' جو اپنی دونئی ہمت کے باعث ایسا راستہ تلاش کرتا ہے جو خطرہ سے خالی ہو' حالانکہ زندگی خطرات ہی میں پوشیدہ ہے۔ حضرت علیؑ نے کتنی بلیغ بات فرمائی ہے۔

''میری موت میری محافظ ہے۔''

جو شخص موت کو اپنا محافظ قرار دیتا ہو' وہ خطرات سے نہ گھبرا سکتا ہے' نہ پریشان ہو سکتا ہے' نہ انہیں خیال میں لا سکتا ہے۔ یہ بات فاتح خیبر ہی کی زبان کو زیب دیتی تھی' لیکن اس فاتح خیبر کی قوم آج پست ہمتی کی شکار ہے اور خوف و ہراس نے اس کی ہمت چھین لی ہے:

بگذر از عقل و در آویز بہ موجِ یمِ عشق
کہ در آں جوئے تنک مایہ گہر پیدا نیست

(پیامِ مشرق: ۱۷۰)

پھر درسِ حیات ان حیات افروز الفاظ میں دیتے ہیں کہ عقل کی دور اندیشوں سے کنارہ کشی اختیار کر' عشق کے بحرِ بے کراں میں کود پڑ، گوہر مقصود وہیں ملے گا' یہاں نہیں' موتی سمندر میں ہوتے ہیں تو جوئے تنک مایہ میں تلاش کرنے چلا ہے؟

تھا جنھیں ذوقِ تماشا، وہ تو رخصت ہو گئے
لے کے اب تو وعدۂ دیدار عام آیا تو کیا
انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اُٹھ گئے
ساقیا! محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا
آہ! جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی
پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا

(بانگِ درا:۱۸۵)

(٦١)

مقامِ اقبال

شعلہ بودیم، شکستیم، و شرر گردیدیم
صاحبِ ذوق و تمنا و نظر گردیدیم

(پیامِ مشرق:۱۹۰)

اقبال کے پیام اور شاعری کا مقام بڑی آسانی سے متعین کیا جا سکتا ہے، گو وہ اس کے شاکی ہیں کہ:

گریۂ ما بے اثر، نالۂ ما نارسا است
حاصلِ ایں سوز و ساز یک دلِ خونیں نواست

(پیامِ مشرق:۱۷۰)

لیکن اپنے گریۂ بے اثر اور نالۂ رسا سے وہ مایوس نہیں ہیں۔ اپنے دلِ خونیں نوا پر انہیں ناز ہے۔ فرماتے ہیں:

در طلبش دل تپید، دیر و حرم آفرید
ما بہ تمنائے او، او بہ تماشائے ماست

(پیامِ مشرق:۱۷۰)

ہم اگر اس کے جویا ہیں، تو وہ بھی ہم سے غافل نہیں ہے۔ ہم اس کے لیے تڑپتے ہیں، اس نے ہمارے لیے دیر و حرم پیدا کر کے سجدہ ریزی کا سامان کر دیا، ہمیں اس کی تمنا ہے، وہ

خدا ہمارا مشتاق ہے۔

اسی لیے اقبال نے اپنی منزل جو متعین کی ہے وہ مقامِ کبریا ہے۔

شعلہ در گیر زد برخس و خاشاک من
مرشدِ رومی کہ گفت "منزل کبریاست"

اور اس منزل کو متعین کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اقبال سراپا عشق و اضطراب بن کر رہ گئے۔ انھوں نے دین اور دین کے پیامبر ﷺ کو منتہائے نظر، حاصلِ حیات اور مقصودِ فکر قرار دے لیا۔

اردو اور فارسی کے بہت سے اشعار میں اقبال نے اپنی اس کیفیت کو اثر انگیز اور دلآویز طور پر بیان کیا ہے۔ کہیں وہ فرماتے ہیں:

سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف (بالِ جبریل:۴۰)

کہیں ارشاد ہوتا ہے:

بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا (بانگِ درا:۱۳۰)

کبھی کہتے ہیں:

میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں (بانگِ درا:۱۹۸)

کبھی اس پر فخر کرتے ہیں:

زادۂ مرا آشنائے روم و تبریز است

کبھی جوش و خروش، فخر و انبساط اور ناز و نیاز کے جذبات سے بے قرار ہو کر صاف اور واضح الفاظ میں اپنی حیثیت اور اپنے مقام کو خود اسی طرح متعین کرتے ہیں:

اگرچہ زادۂ ہندم فروغِ چشم من است
ز خاکِ پاک بخارا و کابل و تبریز!

(پیامِ مشرق:۱۶۹)

یعنی گو میں، ہندوستان میں پیدا ہوا ہوں، لیکن اس کے باوجود میری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بخارا، کابل اور تبریز کی خاکِ پاک سے وابستہ ہے، بصیرت میں نے وہیں سے

حاصل کی ہے، روح کی سرخوشی میں نے وہیں سے پائی ہے، کشادِ قلب ونظر جسے کہتے ہیں یہ چیز مجھے انہیں مقاماتِ عالیہ سے ملی ہے۔

ایک جگہ اپنی نوا کو نوائے غیب قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں:

نواز پردۂ غیب است اے مقام شناس
نہ از گلوئے غزل خواں، نہ از رگِ ساز است

(پیامِ مشرق:۱۷۷)

یہ میری نوا جو تو سن رہا ہے یہ پردۂ غیب سے نمودار ہوتی ہے۔ یہ گلوئے غزل خواں کا نتیجہ ہے، نہ رگِ ساز سے پیدا ہوئی ہے۔ مطلب یہ کہ اس میں جو سوز وساز پایا جاتا ہے وہ حقیقی ہے مصنوعی نہیں ہے۔ اس میں آمد ہے، آورد نہیں۔

اپنے بارے میں ایک اور جگہ کس مزے میں کہتے ہیں۔

تنم گلے زخیابانِ جنت کشمیر
دل از حریمِ حجاز ونواز شیراز است

(پیامِ مشرق:۱۷۸)

میرا یہ جسم خاکی، تو بے شک خیابان جنت کشمیر کا ہے، لیکن میرا دل، حریم حجاز کا محرم اسرار ہے اور میری نوا نوائے شیراز ہے۔

(۶۲)

پیش گوئی

شاعر اگر مفکر اور حکیم ہو تو وہ آنے والے دور کا اندازہ اپنی بصیرت سے کر لیتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ مستقبل کے پردہ میں کیا پنہاں ہے، عام لوگ آنے والے دَور کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ شاعر اس دَور کو اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے اور جو لوگ اس کی سنتے ہیں انہیں بتا بھی دیتا ہے اور پھر بعد میں آنے والے واقعات اس کی تائید و تصدیق بھی کر دیتے ہیں۔

اقبال کا زمانہ کشمکش کا زمانہ تھا' جوع الارض کا زمانہ تھا' تحریکِ حریّت و استقلال کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں بڑی اور طاقت ور قومیں اپنے آلاتِ جنگ اور ساز و سامان سے مسلح ہو کر کمزور اور غریب ملکوں میں لوٹ کھسوٹ مچا رہی تھیں، دوسروں کی زمینوں پر قبضہ کر رہی تھیں، دوسری قوموں اور ملتوں کو غلام بنا رہی تھیں۔ بڑی طاقت کا مقابلہ' چھوٹی طاقت نہیں کر سکتی، تلوار کے مقابلہ میں چھری' بندوق کے مقابلہ میں لاٹھی' توپ کے مقابلہ میں طمانچہ کام نہیں دے سکتا' جو قومیں کمزور تھیں' بے مایہ تھیں، نہتی تھیں وہ غلامی کرنے پر مجبور تھیں' لیکن اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ وہ غلامی پر رضامند بھی تھیں۔ انہیں غلامی سے اتنی ہی نفرت تھی جتنی امریکہ کے آزاد باشندوں کو ہے، جس طرح کوئی انگریز' کوئی روسی' کوئی فرانسی' کوئی جرمن یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کے ملک پر کوئی دوسری قوم قبضہ کر لے اور اسے غلام بنا لے۔ اسی طرح یہ غلام مشرقی ممالک کے لوگ بھی اسے پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کے گلے میں غلامی کا طوق پہنا دیا جائے۔ لیکن جس طرح دوسری جنگ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد آزادوں کو غلام

بنا پڑا۔۔۔فرانس پر جرمنی نے قبضہ کرلیا،روس کے کئی شہروں پر جرمن فوجیں قابض ہو گئیں، اطالیہ اتحادیوں کی تحویل میں آ گیا۔جرمنی کچھ عرصے پہلے تک فرانس' برطانیہ امریکہ اور روس کا غلام تھا اور اب بھی آدھا جرمنی روس کے قبضہ میں ہے۔۔۔اور وہ کچھ نہ کر سکے۔اس لیے کہ مزاحمت اور مقادمت کی قوت سے محروم تھے۔حملہ آور فوجوں کا مقابلہ کرنے کی ان میں سکت نہ تھی۔اسی طرح یہ مغربی ممالک کے غلام مشرقی ممالک تھے۔انھوں نے آزاد رہنے کی کوشش کی' لیکن آزاد نہ رہ سکے۔ برطانیہ اور فرانس کی قوتوں کے سامنے انھیں سر جھکانا پڑا۔غلامی قبول کرنی پڑی مگر اس کے باوجود ان کے دل غلامی سے بیزار تھے۔نفرت کرتے تھے غلامی سے' اور ان کا وہ طبقہ جو نسبتاً زیادہ باہمت تھا' برابر آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھا۔اقبال یہ سارے مناظر دیکھ رہے تھے اور محسوس کر رہے تھے کہ ظلم کی ناؤ زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکتی۔ایک دن قصرِ استعمار سرنگوں ہوگا اور غلام آزاد ہوں گے۔اور

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک (بانگِ درا:۱۹۴)

اقبال کو خدا نے بصارت کے ساتھ بصیرت بھی دی تھی۔وہ مرد مسلمان تھے،تدبر کے ساتھ فراست مومن بھی انھیں عطا ہوئی تھی۔وہ مستقبل کے مناظر دیکھ رہے تھے۔انھیں معلوم تھا' یہ دَورِ استعمار ختم ہوگا اور غلاموں کو آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کا موقعہ ملے گا۔چنانچہ وہ صاف الفاظ میں بشارت دیتے ہیں:

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است
زندگی درپے تعمیرِ جہانِ دگر است (پیامِ مشرق:۱۹۲)

آنکھ کھول اور اگر تو صاحبِ نظر ہے تو دیکھ لے زندگی ایک نیا جہان آرزو تعمیر کرنے پر آمادہ ہو چکی ہے۔

لیکن اقبال جانتے تھے اس ملک میں صاحبِ نظر کم ہیں کم نظر بہت ہیں،لہٰذا وہ خود اپنی نظر اور اپنی بصیرت و فراست کے نتائج سے اپنی قوم کو مطلع کرتے ہیں۔فرماتے ہیں:

من دریں خاکِ کہن گوہرِ جاں می بینم
چشمِ ہر ذرّہ چوں انجم نگراں می بینم (پیامِ مشرق:۱۹۲)

اس دُنیائے کہن میں میری آنکھیں ایک نئی زندگی کی تڑپ دیکھ رہی ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے یہ ویرانی دُور ہوجائے گی، یہ شکستگی رفع ہوجائے گی، یہ دور ختم ہوجائے گا، نئی زندگی جنم لے گی' نیا عہد اُبھرے گا، نیا دور نمایاں ہوگا اور جو مایوسی' بددلی اور پریشانی آج نظر آرہی ہے کل وہ قائم نہیں رہے گی۔اس کے بجائے' زندگی نمودار ہوگی اور اس کے ساتھ خوشی' انبساط اور نشاط کی کارفرمائی ہوگی۔

دانہ را کہ بہ آغوشِ زمین است ہنوز
شاخ در شاخ و برومند و جواں می بینم

(پیامِ مشرق:۱۹۲)

جو دانہ ابھی آغوشِ زمیں میں مستور ہے' جس نے ابھی زمین کے پردہ سے سر باہر نہیں نکالا ہے' نہ جس کی کونپلیں پھوٹی ہیں' نہ برگ و بار آئے ہیں' میں اس دانہ کو دیکھ رہا ہوں' اس کی قوت نمو کو دیکھ رہا ہوں، اس کی زندگی کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ اُبھرا' پھولا' بڑھا' پھیلا اس کی شاخیں دُور دُور تک وسیع ہوگئیں، وہ پھل لایا' اس نے استحکام حاصل کرلیا، وہ ایک درخت بن گیا، جس سے خلقت فائدہ اٹھانے لگی۔

کوہ را مثلِ پرکاہ سبک می یابم
پرکاہے صفتِ کوہِ گراں می بینم

(پیامِ مشرق:۱۹۲)

پہاڑ مجھے گھاس کا تنکا نظر آرہا ہے۔گھاس کے تنکے سے زیادہ سبک' ہیچ اور گھاس کے تنکے کو میں پہاڑ کی طرح باوقار' بلند و بالا اور عظیم و جلیل دیکھ رہا ہوں۔

کوہ کا دور ختم ہو رہا ہے' یعنی ملوکیت دم توڑ رہی ہے، سرمایہ دار کا نام و نشان مٹنے والا ہے، سامراج' استعمار ہوس جوع الارض' ملوکیت' غلبہ و تسلط' انتداب' یہ ساری چیزیں جو طاقتوروں نے کمزوروں کو ہڑپ کرنے کے لیے بنائی تھیں ایک ایک کرکے ختم ہوں گی' ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا، یہ اس طرح مٹ جائیں گی جس طرح بادِ صرصر ریت کے تودے کو اڑا لے جاتی ہے۔

اور یہ پرکاہ یعنی یہ مزدور، یہ سادہ لوح کاشتکار، یہ متوسط طبقہ، جس کی کوئی بات نہیں پوچھتا، جسے کوئی منہ نہیں لگاتا، جس کے بارے میں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ صرف اس لیے ہے کہ ظلم سہے، غلامی کی زندگی بسر کرے، مار کھائے اور اُف نہ کرے، لُوٹا جائے اور فریاد نہ کرے، تباہ کیا جائے اور حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے، عروج حاصل کرے گا، ترقی کرے گا، پارلیمنٹ اس کے ووٹوں سے بنے گی، حکومت کی تشکیل میں اس کا ہاتھ ہوگا، وہی حکومتیں قائم رہیں گی جو عوام کے میلان ورجحان کی پابند ہوں گی، وہ حکومتیں ٹوٹ جائیں گی جو عوام سے ٹکرائیں گی، وہ نظام نافذ ہوگا، جو عوام کا منظور کیا ہوا ہو، وہ نظام مسترد کردیا جائے گا جسے عوام کی منظوری نہ حاصل ہو، وہ دستورِ حیات بحال ہوگا جو عوام کا ہو، عوام کے لیے ہو، عوام نے جسے بنایا ہو اور وہ دستورِ حیات بے وقعت ہوگا جسے عوام کی خوشنودی نہ حاصل ہو۔

انقلابے کہ نہ گنجد بہ ضمیر افلاک
بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم

(پیامِ مشرق:۱۹۲)

میں آنے والے انقلاب کو دیکھ رہا ہوں۔ وہ انقلاب جس کا اس وقت تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، جس کے بارہ میں سوچا ہی نہیں جاسکتا کہ وہ ہمہ گیر ہوگا، بہت خون ریز ہوگا، اس کے نتائج واثرات اور ثمرات کیا ہوں گے؟ اور میں خود تو اس کی بشارت دے رہا ہوں اسے برافگندہ نقاب دیکھ رہا ہوں، اس کی پیش گوئی کر رہا ہوں، نہیں بتاسکتا کہ وہ کیسا ہوگا؟ ہاں الفاظ مجھے نہیں ملتے جو میرے مفہوم کو واضح کرسکیں۔

اور کون کہہ سکتا ہے کہ اقبال نے جس انقلاب کی بشارت دی تھی وہ نمودار نہیں ہوا؟ اس نے کیا کچھ اس انقلاب کے باعث نہ دیکھا؟ امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، ترکی، یونان، شام، لبنان، عراق، ایران، ہندوستان، افغانستان، مصر، روم، البانیہ، الجزائر، مغرب اقصیٰ، اسپین، کہاں اس انقلاب کے قدم نہیں پہنچے؟ کہاں اس نے قیامت نہیں برپا کی؟ کہاں اس نے خون کی ہولی نہیں کھیلی؟

خرم آں کس کہ دریں گرد سوارے بیند
جوہرِ نغمہ ز لرزیدن تارے بیند

(پیامِ مشرق:۱۹۲)

خوش قسمت ہے وہ شخص، جو اس گرد و غبار کے طوفان میں، حقیقت کا جلوہ دیکھ لے، جو تاروں کے لرزنے سے اندازہ لگا لے کہ نغمہ کیا ہوگا، کیسا ہوگا۔

تو اگر خوددار ہے منّت کشِ ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر
کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں
ہے جنوں تیرا نیا ، پیدا نیا ویرانہ کر
خاک میں تجھ کو مقدر نے ملایا ہے اگر
تو عصا افتاد سے پیدا مثالِ دانہ کر
ہاں! اسی شاخِ کہن پر پھر بنالے آشیاں
اہلِ گلشن کو شہیدِ نغمۂ مستانہ کر
اس چمن میں پیرو بلبل ہو یا تلمیذِ گل
یا سراپا نالہ بن جا ، یا نوا پیدا نہ کر

(بانگِ درا:۱۹۱)

(۶۴)

درسِ حیات

شاعر خودی کا پیامبر ہے' خودی کا رمز شناس ہے، خودی کا مبلغ اور داعی ہے۔ وہ اس زندگی کو زندگی سمجھتا ہے' جو خودی سے ہمکنار ہو، اس زندگی کو وہ موت قرار دیتا ہے جو خودی سے محروم ہو۔ وہ نئی نئی تشبیہوں' نئے نئے استعاروں اور نئے نئے طریقوں سے اس مفہوم کو واضح کرتا ہے۔

شاید کہ ترے دل میں اُتر جائے مری بات

وہ چاہتا ہے ملتِ اسلامیہ خودی کی رمز شناس بن جائے اور ایک مرتبہ پھر وہ مقام حاصل کرلے جو اسے آغاز میں حاصل تھا۔ وہ ایسے مسلمان کا تصور بھی نہیں کرسکتا جو مسلمان ہو اور غلام ہو' مسلمان ہو اور ذلیل ہو' مسلمان ہو اور دُنیا میں اس کی کوئی حیثیت فرماں روایانہ نہ ہو۔ شیر اس لیے نہیں پیدا ہوتا کہ بیل گاڑی میں جوتا جائے، بجلی اس لیے نہیں ہوتی کہ اس سے ہاتھ تاپے جائیں' سمندر اس لیے نہیں ہوتا کہ اس سے گھر کے برتن دھوئے جائیں۔ اسی طرح مسلمان اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ غلامی کی زندگی بسر کرے، دوسروں کے آگے سر جھکائے' دوسروں کے در پر دریوزہ گر بن کر جائے، خود اس کے پاس کیا نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے پاس جائے اور ان سے اپنے درد کا درماں چاہے۔

یہی بات ہے جسے اقبال نے مجاز کے پردے میں یوں کہا ہے:

خاکیم و تند سیر مثال ستارہ ایم
در نیلگوں یمے' بہ تلاش کنارہ ایم

(پیامِ مشرق:۱۷۸)

ہم بندۂ خاکی ہیں لیکن ستارے کی طرح گرم سیر بھی ہیں۔ ہماری خودی ہمیں ہر وقت رواں دواں رکھتی ہے۔ یہ بحر نیلگوں (سمندر) جس کا کوئی اور چھور نہیں' ہم اس کا کنارہ تلاش کرنے نکلے ہیں۔ ہماری خودی اگر زندہ ہے' ہمارا جذبۂ کارا گر باقی ہے، ہمت مردانہ سے اگر ہم محروم نہیں ہوئے ہیں تو اس ناممکن کو ممکن کر دکھائیں گے:

بود و نہ بودِ ماست زیک شعلۂ حیات
از لذتِ خودی چو شرر پارہ پارہ ایم

(پیامِ مشرق:۱۷۸)

ہماری ہست و بود ایک صلۂ حیات کی رہینِ منت ہے۔ صرف اسی ایک شعلہ سے وابستہ ہے' لیکن شرر کی طرح چنگاری کے مانند ہمیں پارہ پارہ اور ٹکڑے ٹکڑے جو تم دیکھ رہے ہو یہ ہماری انفرادیت کا جذبہ ہے۔ یہ ہماری خودی ہے جس نے ہمیں شعلہ سے ہٹ کر شرر بننے اور شرر کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ کیا ہے۔

با نوریاں بگو کہ ز عقلِ بلند دست
ما خاکیاں بہ دوشِ ثریا سوارہ ایم

(پیامِ مشرق:۱۷۸)

فرشتوں سے کہہ دو کہ عقل بلند است کی کرشمہ سازی سے ہم خاکی دوش ثریا پر سوار ہیں ۔۔۔۔ یہ فرشتے صرف تسبیح و تحلیل کرتے ہیں۔ ذکر و شغل ہی ان کا مشغلہ ہے۔ لیکن ہمیں خدا نے وہ قوت عطا کی ہے کہ یہ ساری کائنات ہم نے مسخر کر لی ہے۔ یہ بحر و بر' یہ شجر و حجر' یہ نور و نار' یہ کوہ و دمن سب کچھ ہمارے قبضہ میں ہے۔ ہمارے تصرف میں ہے۔

وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا

جو کچھ اس کائنات میں ہے وہ ہمارا ہے، ہمارے لیے ہے، ہمارے قبضہ اور تصرف

میں ہے۔

در عشق غنچہ ایم کہ لرزد زبادِ صبح
در کارِ زندگی صفت سنگ خارہ ایم

(پیامِ مشرق:۱۷۸)

ہم مسلمان حق وصداقت کے معاملہ میں، غنچہ کی طرح نرم ونازک ہیں، غنچہ نازک کی طرح، جو بادِ صبح کے جھونکوں سے لرزنے اور کانپنے لگتا ہے، لیکن کارزارِ حیات میں، سعی وکوشش کے راستہ میں، ہم سنگ خارا کی طرح سخت ہیں جسے توڑا نہیں جاسکتا، جس میں لچک نہیں پیدا کی جاسکتی۔

نکلتا ہوا سورج

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس وخاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی
گل برانداز ہے خونِ شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے!

(بانگِ درا:۲۰۵)

(۶۴)

تپشِ زندگانی

عرب ہو یا عجم' اسلام سب کے لیے ہے' اسلام کی نعمت عام ہے۔ عرب میں بھی مسلمان بستے ہیں اور عجم میں بھی مسلمان آباد ہیں' لیکن نہ عرب کے مسلمان' اسلام کی روح سے واقف ہیں نہ عجم کے مسلمانوں میں اسلام کی تڑپ ہے' دونوں اسلام کے راستہ سے ہٹے ہوئے ہیں' دونوں نام کے مسلمان ہیں، لیکن اسلام سے' اس کی روح سے' اس کے فلسفۂ حیات سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔

اقبال کی تمنا ہے کہ مسلمان یہ بھولا ہوا سبق پھر سے یاد کرلیں۔ اپنی وہ خصوصیتیں پھر بحال کرلیں' جنھوں نے اقوامِ عالم کی صف میں انھیں ممتاز اور سربلند کردیا تھا' لیکن ان کی یہ تمنا نہیں پوری ہوتی' ان کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوتی۔ آخر وہ خدائے کارساز سے دعا کرتے ہیں:

عرب از سرشک خونم ہمہ لالہ زار بادا
عجم رمیدہ بورا نفسم بہار بادا

(پیامِ مشرق: ۱۷۹)

اے خدا!

میرے سرشک خون سے' عرب کی زمین لالہ زار کردے۔ میرے دیدۂ تر سے جو آنسو ٹپکتے ہیں ان سے چمن عجم کی آبیاری کر' اور ایک مرتبہ پھر عرب و عجم کو وہ نعمت عطا کر جو اُن

سے چھن چکی ہے، جس سے وہ محروم ہو چکے ہیں:

تپش است زندگانی، تپش است جاودانی
ہمہ ذرہ ہائے خاکم، دلِ بے قرار بادا

(پیامِ مشرق:۱۷۹)

اے خدا!

میں جانتا ہوں اور تو ہی ہے جس نے یہ راز مجھ پر آشکار کیا ہے کہ زندگی کی اصل حقیقت تپش اور صرف تپش ہے۔ ہر چیز فنا ہو جائے گی، مٹ جائے گی، باقی رہنے والی، ابدی اور جاودانی چیز بس یہی ہے۔ لہٰذا، میری آرزو ہے کہ میری خاک کے ہر ذرہ کو دل بے قرار بنا دے تاکہ وہ تپشِ زندگی کی نعمت سے ہمکنار ہو جائے۔

نہ بہ جادۂ قرارش، نہ بہ منزلے مقامش
دلِ من، مسافرِ من کہ خداش یار بادا

(پیامِ مشرق:۱۷۹)

یہ میرا دل۔۔۔۔اسے نہ کسی بادہ پر قرار آ سکتا ہے نہ کسی منزل پر پہنچ کر یہ مقام حاصل کر سکتا ہے، اس لیے کہ قیام ہو یا قرار، یہ دونوں چیزیں طلب و جستجو کو ختم کر دیتی ہیں۔ ذوقِ تپش پھر قائم نہیں رہتا اور ایسی زندگی کا دوسرا نام موت ہی ہے۔ لہٰذا میرے دل مسافر کی، تو ہی حفاظت کر۔

اے خدا!

میرا دل میرا مسافر ہے تو اس کی حفاظت کر، اس کا ساتھ دے، اسے قرار عطا فرما، اسے تپش اور خلش کی نعمت سے ہمیشہ بہرہ ور رکھ۔

حذر از خرد کہ بندد ہمہ نقشِ نامرادی
دلِ ما برد بہ سازے کہ گسستہ تار بادا

(پیامِ مشرق:۱۷۹)

یہ عقل۔۔۔۔اس سے حذر واجب ہے۔ اس سے کنارہ کشی ہی بہتر ہے، نامرادی

اور ناکامی کا ہر نقش جو قائم ہوتا ہے وہ اسی کی حماقت سے'اسی کی نام نہاد دُور اندیشی اور چالاکی ہے۔

میں تو اپنے دل کا دیوانہ ہوں۔ میرا دل' عقل سے' چالاکی سے' ہوش مندی سے مجھے دُور رکھتا ہے۔ ان چیزوں کو میرے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتا۔ وہ مجھے اس سازِ بیخودی کی طرف لے جاتا ہے جو ٹوٹا ہوا ہے اور جس کی شکستگی ہی اس کی اصل قیمت ہے۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

(بانگِ درا:۲۸۱)

میں اسی کو پسند کرتا ہوں مجھے یہ شکستگی ہی مرغوب ہے۔

تو جوان خام سوزے سخنم تمام سوزے
غزلے کہ می سرایم' بہ تو سازگار بادا

اے ملّت کے نوجوان!

اے ملّتِ اسلامیہ کے نونہال سربلند!

تو ابھی خام سوز ہے' لاکھ دانش و بینش کامل ہو لیکن ابھی تجھ میں پختگی نہیں آئی۔ ابھی تو ٹھوکر کھا سکتا ہے، لڑکھڑا سکتا ہے' گر سکتا ہے' مبتلائے فریب ہو سکتا ہے، اسیر دام ہو سکتا ہے، تیری عقل میں اتنی رسائی نہیں کہ میرے سخن سوز آفریں کو سمجھ سکے، اسے گرہ میں باندھ سکے اس کے مفہوم اور معنی کو اپنے دل پر نقش کر سکے۔

تیرے لیے میں دعا کرتا ہوں کہ یہ نغمہ جو میں گا رہا ہوں' جو میری روح کی گہرائیوں سے نکل رہا ہے' نہیں' جو میری روح ہے' میری زندگی ہے' میری زندگی کا حاصل ہے' تجھے راس آئے' تو اسے سمجھ لے' تو اس پر عمل کرلے تو اس کی معنویت' واقعیت اور حقیقت کو جان لے۔

چو بہ جانِ من درائی دگر آرزو نہ بینی
مگر ایں کہ شبنمِ تو یم بے کنار بادا (پیامِ مشرق:۱۷۹)

میرے بچے!

میری قوم کے فرزند!

اگر نگاہِ غور سے تو مجھے دیکھے گا' میرے پیام اور کلام کو سمجھنے کی کوشش کرے گا تو صرف ایک ہی آرزو میرے سینے میں پائے گا اور وہ آرزو یہ ہے کہ تو شبنم ہے' بحرِ بے پایاں ہو جا، تو محدود ہے' لامحدود بن جا، تو قطرہ ہے سمندر کی وسعت اختیار کرے اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب تو اپنی حقیقت کو پہچان لے، رازِ خودی سے واقف ہو جائے۔ اسرارِ بے خودی تیری سمجھ میں آ جائیں، جب تک تو اپنے آپ سے' اپنی خودی سے' اپنے وجود سے واقف نہیں ہوتا، تو شبنم بے مایہ سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس وقت تک تو صرف قطرۂ ناچیز ہی رہے گا۔

نہ شود نصیب جانت کہ دمے قرار گیرد

تب و تاب زندگانی بہ تو آشکار بادا (پیامِ مشرق:۱۸۰)

میں خدا سے دعا کرتا ہوں ۔۔۔۔۔ کہ تجھے کبھی قرار و سکون میسر نہ آئے۔ ایک لمحہ کے لیے بھی قرار تیرے قریب نہ پھٹکنے پائے۔ تب و تاب زندگی کا راز تجھ پر منکشف ہو جائے اور' تو ساری زندگی' اس تب و تاب میں گزار دے کہ یہی سربلندی ہے، یہی رفعت ہے، یہی حاصلِ حیات ہے۔

نورِ توحید کا اتمام

چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری
ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری
کوکبِ قسمتِ امکاں ہے خلافت تیری
وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

(بانگِ درا:۲۰۶)

(٦٥)

لعلِ گراں

اقبال نے زندگی بھر خودی کی تعلیم دی، اس لیے کہ وہ خود بھی خودی کا پیکر تھے' خودنگر تھے، خودشناس تھے، وہ اپنی اہلیت اور استعداد سے واقف تھے، اپنی قوم کی گریز پائی اور تغافل کیشی کے محرمِ اسرار تھے۔ ان کے سینہ میں آگ دہکتی تھی، وہ چاہتے تھے یہ آگ قوم کے سینہ میں منتقل کر دیں، لیکن کامیابی نہیں ہوتی تھی۔ ان کے سر میں' قوم وملّت کی سربلندی اور سرافرازی کا سودا تھا، لیکن قوم اپنے ادبارِ انحطاط سے خوش تھی، ان کا دل عزم وحوصلہ جوش و ولولہ اور ثبات واستقامت سے معمور تھا' لیکن قوم اس جوہر سے محروم تھی۔ وہ چاہتے تھے' ماضی کو حال بنادیں' لیکن قوم کے حال اور اس کے ماضی میں' بعد المشرقین پیدا ہوگیا تھا۔ ان کی تمنا تھی' اس قوم میں پھر سلمان و بوذر پیدا ہوں، خالد وجراح منظر عام پر آئیں۔ لیکن قوم وقت کے میرِ جعفر اور میر صادق پیدا کر رہی تھی۔ ان کی آرزو تھی' مسلمان پھر وہ مسلمان بن جائے جس نے عرب کی تنگنائے سے نکل کر دُنیا میں تلاطم برپا کر دیا تھا۔ لیکن مسلمان سرمست ے غفلت تھا' ان کی زندگی کا مقصد ایک اور صرف ایک تھا' یہ کہ مسلمان اس نظامِ حیات کو پھر اپنالیں جسے ایک مرتبہ اپنا کر وہ بحروبر کے مالک بن گئے تھے لیکن مسلمانوں کو اپنے دوسرے اہم مصروفیات کے باعث اس معمولی سے مقصد پر توجہ کرنے کی فرصت تک نہیں ملتی تھی۔ اقبال اس چیز کو محسوس کرتے تھے' اپنا جوش اور قوم کی سردمہری دیکھتے تھے اور ایک آہ سرد کے ساتھ کہہ اٹھتے تھے:

آں زمینے کہ برد گریۂ خونیں زدہ ام
اشکِ من در جگرش لعلِ گراں خواہد بود

(پیامِ مشرق:۱۹۳)

واحسرتا کہ اقبال کی زندگی میں اس کے گریۂ خونیں سے لعل گراں نہ پیدا ہوسکا۔وہ دیکھتا تھا اور کڑھتا تھا کہ لوگ اس کے کلام کو کلام کے مغز و معنی کو دعوت اور پیام کو روح اور مقصد کو نہیں سمجھتے۔یہ بات نہ تھی کہ سمجھ نہ سکتے ہوں۔بات صرف یہ تھی کہ سمجھنے کی اور اس پر عمل کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔اسے بھی وہ دوسرے شاعروں کی طرح سمجھتے تھے حالانکہ وہ سب کچھ تھا مگر ''شاعر'' نہیں تھا۔اس سے بڑھ کر اس پر تہمت نہیں ہوسکتی کہ اسے ''شاعر'' سمجھا جائے۔وہ شاعر کہاں تھا؟ وہ حکیم تھا۔وہ مفکّر تھا وہ شعلہ نوا واعظ تھا۔وہ آتش مقال ناصح تھا وہ رمز آشنائے روم وتبریز تھا وہ ملت اسلامیہ کے عروج وارتقا کا نقیب تھا اسے شاعروں کے اس گروہ سے کیا تعلق جو داستانِ ہجر و وصل بیان کرتا ہے جو رندی اور ہوسنا کی کے افسانے سناتا ہے۔جو حسن جالستان اور جمال ترکانہ کے آگے سربجود ہوتا ہے۔جو غمزۂ خونیں اور عشوۂ جاں سوز کے قصیدے پڑھتا ہے جو روائے دل بری اور انداز معشوقانہ کے گیت گاتا ہے۔ان لغوتیوں کے لیے اس کے پاس نہ وقت تھا نہ دماغ۔

مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

اقبال ان ترقی پسند تمام نام نہاد ترقی پسند در حقیقت جاہل اور کم مایہ شعرا میں بھی نہیں تھا جو اپنی داستانِ ہوس کو انتقامِ فرنگ قرار دے کر سُرخ رو بننے کی کوشش کرتے ہیں۔جو ردیف و قافیہ بحر و دناں کو ٹھکراتے ہیں۔لیکن اس کا سبب اجتہاد نہیں جہالت ہے۔جو غیر زبانوں کے شاعروں کی چیزیں بے سلیقگی اور بھونڈے پن سے چراتے ہیں۔جو مزدور کا نوحہ پڑھتے ہیں لیکن اپنے دفتر کے چپراسی اور گھر کے ملازم سے آمرانہ اور فرعونی سلوک کرتے ہیں جو عورت کی مظلومی طوائف کی بے بسی فاحشہ کی بلندیٔ فطرت کے ترانے گاتے ہیں لیکن عورت پر ظلم بھی کرتے ہیں۔طوائف سے کھیلتے بھی ہیں فاحشہ سے بھی جی بہلاتے ہیں۔بھلا ان پستیوں میں اقبال کا گزر کہاں ہوسکتا تھا؟ وہ دوسری دُنیا کا آدمی تھا ان

عاصیوں میں وہ برگزیدہ اور فرشتوں میں وہ انسان تھا' اونچا' برتر اور بہتر انسان!

ہمراہانِ راہ' رفیقانِ کارواں اور بندگانِ مکروزور کا بے رنگ رنگ دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا تھا اور بے ساختہ کہہ اٹھتا تھا:

نقدِ شاعر درخورِ بازار نیست

ناں بہ سیمِ نسترن نتواں خرید

(پیامِ مشرق:۲۲۱)

ہاں' یہ سچ تھا۔ واقعی' نقد شاعر' درخور بازار نہ تھا' لیکن لوگ اس کی زندگی میں نسترن کی ''چاندنی'' سے روٹی خریدنے کی کوشش کرتے رہے۔

زبورِ عجم اقبال کی معرکہ آرا کتاب ہے' اقبال کو اس کتاب پر فخر تھا' کہتے ہیں:

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم

فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

(بالِ جبریل:۳۹)

اور واقعی یہ کتاب اسرار حیات اور رموزِ زندگی سے معمور ہے۔ شروع ہی میں فرماتے ہیں:۔

ز بروں درگزشتم ز درونِ خانہ گفتم!

سخنِ نگفتہ' را چہ قلندرانہ گفتم!

(زبورِ عجم:۳)

یعنی میں نے کائنات کے اندر بھی جو کچھ تھا دیکھا اور باہر کے مظاہر پر بھی نظر ڈالی' ان حقائق کو جو دیکھ لیتے تھے' وہ بھی تابِ تکلم سے محروم تھے،لب کشائی کرتے ہوئے جھجکتے اور ہچکچاتے تھے،محرمِ اسرار ہونے کے باوجود' راز کی بات زبان پر لانے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ لیکن میں نے ہر راز بے نقاب کر دیا، میں نے اسرار و رموز پر سے پردہ اٹھا دیا۔ قلندرانہ شان سے وہ باتیں کہہ دیں جن کو زبان پر لانے کی کوئی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ کون ہے جو ان باتوں کو سنے؟ سمجھے؟ اور ان پر غور کرے؟ میں نے اپنی پونجی قوم کو دے دی جو کچھ میرے پاس

تھا' قوم کے حوالہ کردیا۔اب یہ قوم کا فرض ہے کہ میری باتوں سے' میرے پیام سے' میری دعوت سے' اپنے مستقبل کی' اپنی قسمت کی' اپنی حیات نو کی تعمیر کرے۔اگر اب بھی وہ مست نئے غفلت رہتی ہے، ہوش میں نہیں آتی، آمادۂ عمل بھی نہیں ہوتی۔عزم واستقامت کا مظاہرہ نہیں کرتی۔اپنی چھینی ہوئی صلاحیت اور استعداد کو بروئے کار نہیں لاتی، ماضی کے نقوش تازہ نہیں کرتی، اپنے ماضی اور حال میں رشتہ قائم نہیں کرتی' اور اس رشتہ پر اپنے مستقبل کی تعمیر نہیں کرتی تو پھر اس کی ذمہ داری' اس کی محرومی اور خودکشی کی ذمہ داری اس پر ہے۔مجھ پر نہیں۔کیونکہ میں تو اپنا فرض ادا کر چکا۔

ایک دوسرے موقعہ پر اپنے حال دروں کا نقشہ کیسے پرسوز اور اثر انگیز الفاظ میں کھینچتے ہیں:

درونِ سینۂ ما سوزِ آرزو زکجاست؟
سبو زماست ، ولے بادہ در سبوز کجاست؟

(زبورِ عجم:۵)

میرے سینہ میں یہ سوزِ آرزو کہاں سے آیا؟ یہ سوز کس نے پیدا کیا؟ کیوں پیدا کیا؟ اس کا آغاز کیا ہے؟ اس کا انجام کیا ہوگا؟

گرفتم ایں کہ جہاں خاک وماکفِ خاکیم
بہ ذرّہ ذرّہ مادردِ جستجوز کجاست؟ (زبورِ عجم:۵)

ہاں ٹھیک ہے' یہ دُنیا ایک تیرہ خاک داں ہی تو ہے اور یہ بھی درست ہے میری حیثیت بھی مٹی بھر خاک سے زیادہ نہیں' لیکن میری رگ رگ میں اور ریشہ ریشہ میں' یہ آزارِ جستجو کہاں سے آ گیا ہے؟ اس خاک میں، اس کفِ خاک میں' یہ شعلہ' یہ شرر کہاں سے پیدا ہوا؟

نگاہِ ما بہ گریباں کہکشاں افتد
جنونِ ماز کجا؟ شورِ ہائے ہوز کجاست؟ (زبورِ عجم:۵)

میری نگاہ کہکشاں کے دامان و گریبان تک پہنچی ہوئی ہے۔میں اس خاک داں عالم کا رہنے والا' لیکن میری رسائی عالم بالا تک کیسے ہوگئی۔میرا خاکی جسم زمین پر' میری روح عالم

بالا پر' آخر پست و بلند میں یہ ربط کیسے پیدا ہو گیا۔ بلند سے ملنے کے لیے، اس سے واصل ہونے کے لیے' اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے خاکِ ناتواں میں یہ شور انگیز جذبہ' یہ شور ہائے ہو' کیسے پیدا ہوا؟ کس نے پیدا کیا؟ یہ جذبہ کس طرح نمودار ہوا؟ کس طرح پروان چڑھا، کیوں کر اسے فروغ عطا ہوا؟

اقبال اس بات پر بہت کڑھتے ہیں کہ وہ تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر' قوم کا حالِ زار دیکھ کر آہ و فغاں کرتے ہیں' نالہ' دماغ میں مصروف رہتے ہیں' لیکن لوگ' جو اپنے ذوق سلیم کے مدعی ہیں انہیں شاعر قرار دیتے ہیں۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی ظلم ہو سکتا ہے؟

جز نالہ نمی دانم، گویند غزل خوانم
ایں چیست کہ چوں شبنم بر سینۂ من ریزی؟

(زبورِ عجم:۸)

مجھے آہ نالہ کے سوا کچھ آتا نہیں اور لوگ' میری آہ کو غزل سرائی اور نالہ کو نغمہ طرازی سمجھتے ہیں۔

اگر واقعی یہی بات ہے کہ میں نالہ سنج نہیں غزل سرا ہوں' تو پھر آسانی سے شبنم کی طرح میرے سینہ پر انوار و تجلیات کی بارش کیوں ہوتی رہتی ہے؟ میرے کلام میں "سخن بازناں" (غزل) کیوں نہیں ہے، سوز و ساز کیوں ہے، آہ و نالہ کیوں ہے؟ شیون اور فغاں کیوں ہے؟

اور پھر اپنے خدا سے کہتے ہیں:

بہ ضمیرم آں چناں کن کہ ز شعلہ نوائے
دلِ خاکیاں فروزم ، دلِ نوریاں گدازم

(زبورِ عجم:۹)

خدایا! میرے دل کو ایسا بنا دے کہ میری شعلۂ نوا سے' خاکیوں (انسانوں) کے دل روشن ہو جائیں اور نوریوں (فرشتوں) کے دلوں میں سوز و گداز کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

(۶۶)

شوخیٔ افکار

زبورِ عجم میں ایک مقام پر اقبال نے اپنے لیے خدائے قادر و توانا سے دعا مانگی ہے اور وہی کچھ مانگا ہے، جو اقبال جیسے دل و دماغ کا شخص مانگ سکتا ہے۔ اس دعا میں سوز بھی ہے اور ساز بھی، تاثر بھی اور گداز بھی، خیال کی بلندی بھی اور نگاہ کی وسعت بھی، دعا کا ایک حصہ ملاحظہ فرمائیے:

ایں بندہ را کہ بانفسِ دیگراں نہ زیست
یک آہِ خانہ زاد مثالِ سحر بدہ

(زبورِ عجم:۴)

اے خدا!

تیرا یہ بندہ۔۔۔۔اقبال۔۔۔۔اپنے مزاج و طبیعت اور خیال و نظر کی انفرادیت کے باعث عام لوگوں کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ وہ کسی اور طرح سوچتے ہیں اس کا اندازِ فکر کچھ اور ہے۔ وہ کسی اور طرح دیکھتے ہیں اس کا نقطۂ نظر دوسرا ہے۔ اس کی تمنا یہ ہے کہ وہ آہ خانہ زاد مرحمت فرما، جو سحر کی طرح روشن اور پاکیزہ ہو اور جس میں وہ طاقت ہو کہ ربع مسکوں کو اپنے جوش و اثر سے ہلا دے:

سیلم، مرا بہ جوئے تنک مایہ مپیچ!
جولانگہے بوادی و کوہ و کمر بدہ (زبورِ عجم:۴)

میرے سیلِ رواں کو جوئے تنک مایہ سے نہ الجھنے دے۔ اس طرح میرے ولولے اور حوصلے پست ہو کر رہ جائیں گے۔ ان کی روانی کے لیے وادی و کوہ کی وسعت عطا فرما۔

سازی اگر حریفِ یمِ بے کراں مرا
با اضطرابِ موج، سکونِ گہر بدہ

(زبورِ عجم:۴۸)

اگر تو یہ چاہتا ہے کہ مجھے بحرِ بے پایاں کا حریف بنادے، مجھ میں وہ وسعت، وہ روانی اور وہ کیفیت پیدا ہو جائے، جس کے سامنے سمندر بھی شرمائے تو پھر اے میرے خدا! اضطراب موج کے ساتھ، مجھے سکونِ گہر بھی عطا کر۔ سمندر کا تلاطم بھی دے اور سمندر کی تہہ میں جو سکون ہوتا ہے۔ جہاں قطرۂ ناچیز گوہرِ تابندہ بن جاتا ہے۔ وہ سکون بھی مرحمت فرما۔

اپنی اس انفرادیت کو بار بار، مختلف طریقوں اور پہلوؤں سے اقبال بیان کرتے ہیں، ہر انداز میں ایک لطف ہے، ہر بات میں ایک بات ہے، ایک اور موقعہ پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

نوائے من ازاں پرسوز و بیباک و غم انگیز است
بخاشاکم شرار افتاد و بادِ صبح دم تیز است

(زبورِ عجم:۱۲)

بادِ صبح دم، یعنی فیضِ عشق نے میری خاشاک میں شرر پیدا کر دیا ہے۔ سوزِ آرزو پیدا کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ میری نوا پرسوز بھی ہے، بیباک بھی، اور غم انگیز بھی:

بہ بستان جلوہ دادم آتشِ داغ جدائی را
نسیمش تیرتر می سازد و شبنم غلط ریز است

(زبورِ عجم:۱۲)

میں نے اہلِ چمن میں داغِ جدائی کا احساس پیدا کیا ہے کہ تم اپنے مقصد سے، اپنی نیابت سے، اپنی غایت سے جدا ہو۔ بادِ نسیم اس آگ ـــــ عشق پر تیل کا کام کرتی ہے۔ لیکن شبنم، یعنی فکرِ غلط اندیش اس کے لیے پانی بن جاتی ہے، اسے بجھا دیتی ہے۔

اشارت ہائے پنہاں خانماں برہم زند، لیکن
مرا آں غمزہ می باید کہ بیباک است وخوں ریز است

(زبورِ عجم:۱۳)

جانتا ہوں' محبوب کا اشارۂ پنہاں' برہم زن ہوش وحواس' بلکہ خانماں برباد تک ہوتا ہے' میں اس اشارۂ پنہاں سے لطف ہی لیتا ہوں۔ لیکن میری تشنگی اس سے دُور نہیں ہوتی۔ مجھے تو وہ چاہیے جو بیباک ہونے کے ساتھ ساتھ خون ریز بھی ہو۔

پھر فرماتے ہیں اور کتنے حسین دلفریب انداز میں فرماتے ہیں:

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمے بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم وتبریز است

(زبورِ عجم:۱۳)

لوگو!۔۔۔۔ مجھے دیکھو۔ ہندوستان میں کوئی دوسرا مجھ سا نہیں پاؤ گے۔ میں برہمن زادہ ہوں' میرے ماں باپ نہ عرب سے آئے تھے' نہ فارس سے۔ میں یہیں کا رہنے والا ہوں۔ ایک بت پرست خاندان کا چشم وچراغ

آبا مرے لاتی و مناتی

لیکن' یہ عشق ہی کا فیضان تو ہے جس نے مجھے روم وتبریز رمز آشنا بنادیا ہے' ورنہ کہاں میں کہاں روم کی دُنیائے حقائق' کہاں میں' کہاں تبریز کے معارف؟ یہی عشق ہے کہ جس نے مجھے آہ ونالہ پر مجبور کردیا ہے۔ مصروفِ فغاں کر رکھا ہے۔

غزلے زدم کہ شاید بہ نوا قرارم آید
تپ شعلہ کم نہ گردد ز گسستنِ شرارہ

(زبورِ عجم:۱۴)

میں غزل سرائی کرتا ہوں۔ اس امید پر کہ شاید اس طرح' دل کا سوز اور روح کی تپش کچھ کم ہوجائے۔ لیکن یہ میری غلط بینی ہے۔ کہیں ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ دو چار چنگاریوں کے جھڑ جانے سے شعلہ کی تب وتاب گرمی اور تپش کم ہوجائے؟

دل زندہ کہ دادی بہ حجاب در نہ سازد
نگہے بدہ کہ بیند شررے بہ سنگ خارہ

(زبورِ عجم:۱۴)

اے خدا! تو نے مجھے وہ دل مرحمت فرمایا ہے' جو پابندِ حجاب نہیں رہ سکتا۔ حجاب کے پردے اٹھا دینا چاہتا ہے۔ مجھے وہ نگاہ مرحمت فرما' جو سنگ خارا کا سینہ' اس کی تپش اس کے شرر اور اس کی خلش کا نظارہ کر سکے۔

نکشد سفینۂ کس بہ یمے بلند موجے
خطرے کہ عشق بیند بہ سلامتِ کنارہ!

(زبورِ عجم:۱۵)

پر شور' متلاطم اور طوفانی سمندر سے ہلتی ڈولتی کشتی بھی وہ خطرہ محسوس نہیں کر سکتی جو عشق کو ساحل کی آسودگی میں نظر آتا ہے۔ آسودگی ساحلِ مرگ آفریں ہے اور سمندر کا تلاطم' خروش اور تموج' حیات آفریں مجھے زندگی چاہیے' موت نہیں۔

بہ شکوہِ بے نیازی زخدا یگاں گزشتم
صفتِ مہ تمامے کہ گزشت بر ستارہ

(زبورِ عجم:۱۵)

اور یہی وجہ ہے کہ خداوندان دنیا کو' میں خاطر میں نہیں لاتا۔ شکوہ بے نیازی کے ساتھ ان پر حقارت کی نظر ڈالتا گزر جاتا ہوں۔ جس طرح چاند ستاروں کو خاطر میں نہیں لاتا' ان سے بے نیاز اور بے پروا رہتا ہے، ان کے پاس صرف سیم وزر ہے۔ میرے پاس خیالات کے موتی ہیں، نگاہ کے جواہر ہیں' عشق کا داغ' یعنی لعل گراں ہے، میں ان سلاطین وملوک کو کیا خیال میں لا سکتا ہوں۔ یہ تو خزف ریزے ہیں۔

لیکن ملوک وسلاطین سے اس بے نیازی اور انفرادیت کی اس شان ورفعت کے باوجود ایک مصیبت کی طرف ایک دوسری غزل میں اشارہ کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

تابِ گفتار اگر ہست شناسائے نیست
وائے آں بندہ کہ در سینۂ او رازے ہست (زبورِ عجم:۱۶)

خدا نے مجھے طاقتِ گفتار تو عطا فرمادی ہے' جو کچھ محسوس کرتا ہوں' جو کچھ دیکھتا ہوں' جو کچھ پاتا ہوں' اسے بیان تو کرسکتا ہوں لیکن وہ لوگ کہاں سے لاؤں' جو میرے احساس کو محسوس کرسکیں؟ جو میرے نظارے کا نظارہ کرسکیں' جو اپنے دامن میں وہ لے سکیں' جو میرے پاس ہے؟ اس شخص سے بھی زیادہ بدقسمت اور پرحسرت کوئی شخص ہوسکتا ہے' جو اپنے سینہ میں رازِ عشق پوشیدہ رکھتا ہو، لیکن وہ شناسا اور دوست نہ رکھتا ہو جو اس کے محرمِ راز بن سکیں جو اس کی کیفیت بیتابی کو محسوس کرسکیں۔ کیا یہ بدقسمتی کی انتہا نہیں ہے؟

مردہ خاکیم و سزاوارِ دل زندہ شدیم!
ایں دلِ زندہ وما! کارِ خداسازے ہست

(زبورِ عجم:١٠٦)

میری حیثیت اور بساط کیا ہے؟ ایک مشتِ خاک اور خاک بھی کیسی؟ خاک مردہ لیکن اس کے باوجود اس ہیچ میرزی اور کم مائگی کے باوجود عزت یہ بخشی گئی ہے کہ دل زندہ کا سزاوار قرار پایا ہوں۔ دل وہ عطا ہوا ہے' جو زندہ ہے' جو اضطراب وخلش کا لذت آشنا ہے' جو درد اور کسک کی لطف فرمائیوں سے واقف ہے' جو جلتا ہے' تڑپتا ہے' مضطرب رہتا ہے۔ ایک طرف تن مردہ' دوسری جانب دل زندہ' کہاں مشتِ خاک' کہاں دلِ بے قرار۔ یہ ان ہونی بات صرف خدائے کارساز کا عطیہ ہے اور بس' ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ نعمتِ جاوید؟

شعلۂ سینہ من خانہ فروز است ولے
شعلۂ ہست کہ ہم خانہ براندازے ہست!

(زبورِ عجم:١٦)

اور یہ شعلہ جو میرے سینہ میں بھڑک رہا ہے، یہ آگ' جو میرے دل میں روشن ہے' یہ طوفان' جس نے میری کائنات تہ وبالا کر رکھی ہے، یہ عجیب طرح کا طوفان ہے، ایسا طوفان جس کے پاس تخریب بھی ہے اور تعمیر بھی۔ یہ آگ عجیب طرح کی آگ ہے، یہ خانہ افروز بھی ہے اور خانہ برانداز بھی، گھر میں روشنی بھی پیدا کرتی ہے اور گھر کو اجاڑ بھی دیتی ہے، روشنی پیدا کرکے آرزو پیدا کرتی ہے اور یہ آرزو خانہ برانداز بن کر' خود میرے ہاتھوں' میرا گھر ڈھالیتی

ہے۔ مجھے دشت پیمائی اور صحرا نوردی پر مجبور کر دیتی ہے۔

اور پھر جب اپنے عشق کو نمایاں، اپنے عشق کی آگ کو روشن، اپنے طوفانوں کو تند جولاں، اپنی خودی کو درخشاں اور اپنے "انا" کو بے پایاں محسوس کرتے ہیں تو (ایک دوسری جگہ) کس جوش وخروش کے ساتھ نعرہ لگاتے ہیں:

ایں جہانِ چیست؟ صنم خانہ پندارِ من است
جلوہ او گروِ دیدۂ بیدارِ من است

(زبورِ عجم: ۱۷)

یہ جہانِ رنگ و بو کیا ہے؟ صرف میرے پندار کا صنم خانہ، اس کی یہ رونق، اس کی یہ شان، اس کی یہ ہوش ربائی، یہ سب چیزیں میرے بنائے ہوئے کھلونے ہیں، میرے صنم خانہ پندار کی زینت، ان کا وجود میرے دم سے قائم ہے۔ میں ہوں تو یہ بھی ہیں، میں نہیں تو یہ بھی نہیں، سب کچھ میرے دم کا ظہور ہے۔ یہ ساری جلوہ آرائیاں، میرے دیدہ بیدار کی رہینِ منت ہیں:

ہستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ من!
چہ زماں و چہ مکاں، شوخئ افکارِ من است

(زبورِ عجم: ۱۷)

یہ ہستی کیا ہے؟
یہ نیستی کیا ہے؟

کچھ نہیں۔۔۔۔ میں دیکھوں تو "ہست ہے"، میں نہ دیکھوں تو نیست" اس لیے کہ سب کچھ میں ہی ہوں۔ میرا ہی وجود ہے جس نے ان سب کو بنایا ہے، میری ہی آنکھ ہے جس نے ان سب کو جلوہ طرازی بخشی ہے، میرا ہی ذہن ہے جس نے یہ دُنیا بسائی ہے، میری آنکھ سے باہر، میرے ذہن سے باہر، میری روح سے باہر کچھ نہیں۔

اور

یہ زماں کیا ہے؟
یہ مکاں کیا ہے؟

یہ بھی کچھ نہیں، ہیچ، لاشئے محض، یہ زمین و مکان بھی اپنا کوئی معبود نہیں رکھتے، یہ سب اعتباری اور اتفاقی چیزیں ہیں۔ محض میرے ذہن کی پیداوار۔ میری چشم خلاق کی مخلوق، میری شوخیِ افکار کی نمود۔۔۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔

اسی مضمون کو اور زیادہ دل فریب انداز میں بیان کرتے ہیں:

ہمہ آفاق کہ گیرم بہ نگاہے اورا
حلقۂ ہست کہ از گردشِ پرکارِ من است

(زبورِ عجم: ۱۷)

اور یہ آفاق، یہ جہان رنگ و بو، یہ دُنیائے حسرت و آرزو، یہ عالم کیف و کم جو نگاہ کے محبس میں اسیر ہے، کیا ہے؟۔۔۔ یا صرف ایک حلقہ، جو میری گردشِ پرکار کا زائیدہ ہے۔

اور زیادہ وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

از فسوں کاریٔ دل، سیر و سکوں، غیب و حضور
ایں کہ غماز و کشائندہ اسرارِ من است

(زبورِ عجم: ۱۷)

یہ حرکت جو نظر آتی ہے، یہ سکون جو نظر آتا ہے، یہ غیب، جسے ہم نہیں دیکھتے، یہ خودی، جو ہمارا مشاہدہ ہے۔ یہ سب کیا ہے۔۔۔ ان کی حقیقت بھی صرف "لاَ" ہے۔ یہ سارا آفاق یہ ساری دُنیا، یہ ساری کائنات، محض ایک مفروضہ ہے۔ محض ایک واہم ہے، محض ایک اعتبار ہے، جو ہم نے قائم کرلیا۔ [illegible] ایک احساس ہے جو ہماری حس نے پیدا کرلیا ہے ورنہ ان میں سے کسی چیز کا خارج میں [illegible] ہے۔ ہے تو صرف میرے ذہن میں۔

اور شعر تو یہ ہے:

اے من از فیضِ تو پایندہ نشانِ تو کجا است؟
ایں دو گیتی اثرِ ماست، جہانِ تو کجا است؟

(زبورِ عجم: ۱۷)

اے خدا! اے رب کائنات!

میں تیرا پروردہ ہوں' تیرے فیض نے مجھے پائندگی بخشی ہے' تو نے ہی مجھے نیست سے ہست کیا ہے' تو نے ہی میرے ذہن کی' یہ خلاقی بخشی ہے کہ جو نہیں ہے اسے محسوس کروں' تو یہ سب کچھ' یہ کوہ ودشت' دریا وصحرا' یہ شجر وحجر' یہ گل صد رنگ' یہ شاخ نشیمن' یہ رعنائی چمن' یہ نوائے بلبل' یہ صدائے ہائے وہو۔ یہ رنگارنگی' یہ بوقلمونی میری ہی نگاہ کرشمہ کار اور میرے ذہن بیدار کی پیداوار ہے۔۔۔ لیکن تو کہ جس نے مجھے پیدا کیا تیرا نشان کہاں ہے؟ یہ گیتی' یہ آفاق' میری نگاہ کا کرشمہ' میرے دل کی' میرے ذہن کی زائیدہ ہے' تیرا جہان کیا ہے؟ تیری دُنیا کہاں ہے؟

(٦٧)

نقش ونگار

اقبال نے اپنی ملت کو بہت کچھ دیا ہے۔اس سے لیا کچھ نہیں۔اس نے بے مُزد و صلہ اپنی قوم میں نئی زندگی پیدا کی،اسے اکابرِ سلف سے رُوشناس کرایا، جہالت' غیر اسلامی ماحول اور دانش مغرب نے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو اسلام سے' اسلام کے فلسفہ سے' اسلام کی تعلیمات سے بیگانہ اور نا آشنا کر دیا تھا۔انہیں دانش ورانِ فرنگ کے نام ازبر تھے۔لیکن اپنے بزرگوں کے علمی کارناموں سے یہ ناواقف تھے۔انہیں یہ معلوم تھا' یورپ نے دُنیا کو سائنس' دریافت' تحقیق اور علم کے سلسلہ میں کیا کچھ دیا ہے۔لیکن انہیں یہ بالکل نہیں معلوم تھا کہ ان کے بزرگوں نے یورپ کے عہد حیات میں' جسے بجا طور پر دَورِ تاریکی کہا جاسکتا ہے کس طرح علم کی شمع روشن کی تھی۔انھوں نے اپنے دشمنوں سے یہ سن کر یقین کرلیا کہ مسلمان ابتدا سے انتہا تک' آغاز سے انجام تک' شروع سے آج تک کچھ نہ تھے اور اگر تھے تو متعصب' تنگ دل' فاتح کی حیثیت سے ظالم' عالم کی حیثیت سے مقلد' واعظ کی حیثیت سے جاہل' رہنما کی حیثیت سے گم کردہ راہ' حکمران کی حیثیت سے ناکام، شاعر کی حیثیت سے لغو گو، ادیب اور انشا طراز کی حیثیت سے لفاظ، طبیب کی حیثیت سے اناڑی اور عطائی' مبلغ کی حیثیت سے تنگ دل' تند مزاج' درشت گو انھوں نے غیروں کے دانش کدوں میں جو کچھ پڑھا تھا' جو کچھ سیکھا تھا' جو کچھ حاصل کیا تھا اس کی روشنی میں اپنے اسلاف کا حال بیان کرتے ہوئے شرماتے تھے۔اسلاف کا نام سن کر ناک بھوں چڑھا لیتے تھے۔دوسروں کی محفل میں یہ ذکر آنے نہیں دیتے تھے اور اگر کسی طرح آ جاتا تھا تو اس سے کترانے کی کوشش کرتے تھے۔لیکن انھوں نے اتنی زحمت کبھی نہیں گوارا فرمائی کہ خود اپنی تاریخ کے اوراق کھنگالتے' اس کا مطالعہ کرتے اور اس

کی روشنی میں رائے قائم کرتے' انھوں نے اپنے بزرگوں کو بڑا اس وقت مانا جب یورپ نے ان میں سے کسی کے آگے سرِ تسلیم خم کیا۔ لیکن جسے یورپ کی بارگاہ سے سندِ قبول مل نہ سکی وہ ان کے دل ودماغ کو متاثر نہ کر سکا۔

ان حالات میں اقبال نے اپنی نوائے پریشاں سے اپنے کام' اپنے مقصد کا آغاز کیا۔ شروع میں یہ آواز نامانوس سی محسوس ہوئی لیکن اس میں زور تھا' قوت تھی' دلائل تھے' پختگی تھی' صحت تھی' توانائی تھی۔ زیادہ عرصہ تک مزاحمت اور مقاومت نہ کی جا سکی۔ آخر یہ آواز سننی پڑی۔ اس پر توجہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس کے وزن' زور اور سچائی کو ماننا پڑا۔ بلاشبہ یہ انقلاب جو اقبال نے پیدا کیا بہت بڑا تھا، لیکن اتنا بڑا نہ تھا کہ وہ خود اس سے مطمئن ہو سکے۔ ان کے معیار سے یہ بہت کم تھا بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ ان کا معیار تھا کہ آج کا مسلمان' پھر وہ مرد مسلمان اور بندۂ مومن ہو جائے' جسے دُنیا کی تاریخ نے عظمت کے ساتھ اپنے اوراق سینہ میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا ہے۔ مقصد کی اس نارسائی کو دیکھ کر وہ سوچنے لگتے ہیں، میں کہاں پیدا ہو گیا؟ میں کچھ ہوں' یہ کچھ ہیں' جو میں کہتا ہوں' وہ ان کے لیے درخورِ التفات نہیں۔ جو یہ کہتے ہیں وہ میرے نزدیک بے معنی ہے۔ انھی تاثرات کے عالم میں وہ اپنے خدا سے مخاطب ہوتے ہیں اور کہتے ہیں:

بادِ بہار را بگو پے بہ خیالِ من برد
وادی ودشت را دہد نقش ونگار ایں چنیں

(زبورِ عجم: ۱۸)

اے خدا!

بادِ بہار کو حکم دے کہ وہ مجھے سمجھے اور اپنی رُوح میں مجھے جذب کر لے تاکہ پھر اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ دُنیا کو انھی نقش ونگار سے مزین کر سکے' جو میرے نگار خانہ آرزو میں ڈھلتے اور بنتے رہتے ہیں:

زادۂ باغ وراغ را از نفسم طراوتے
در چمنِ تو زیستم' با گل وخار ایں چنیں (زبورِ عجم: ۱۸)

اس دُنیا میں جو کوئی بھی ہے، خواہ وہ پروردۂ باغ و چمن ہو یا زائدہ دشت و صحرا، اپنے خیالات میں نے اس تک ضرور پہنچائے ہیں۔ میں تیری دُنیا میں رہا، وہاں میں نے زندگی بسر کی لیکن یہ نہیں کیا کہ خار سے دامن بچایا ہو اور پھول کو گلے لگایا ہو۔

میری دونوں سے آشنائی تھی

میں نے سب کے ساتھ گذر کیا، سب کو اپنے نفس سے تر و تازہ رکھنے کی کوشش کی، کسی کو آزار نہیں پہنچایا ہے، کسی کے درپے اذیت نہیں ہوا، کسی کے زیاں کا خواہاں نہیں ہوا، سب کے ساتھ گزر کرتا اور اپنے نفس گرم کی گرمی ان تک پہنچاتا رہا۔

دل بہ کسے نباختہ، یا دو جہاں نہ ساختہ
من بہ حضور تو رسم، روز شمار ایں چنیں

(زبور عجم:۱۸)

میں نے اپنا دل اس دُنیائے دوں میں کسی سے نہیں اٹکایا، دو جہاں کی کسی ہستی سے ربط و تعلق نہیں پیدا کیا، روز شمار یعنی قیامت کے دن تیرے حضور میں پہنچا تو اس طرح کہ سب سے بیگانہ تھا۔۔۔ تیرے سوا، لو لگی تھی تو تیری، خیال تھا تو تیرا:

فاختۂ کہن صفیر، نالۂ من شنید و گفت
کس نہ سرود، در چمن نغمۂ یار ایں چنیں

(زبور عجم:۱۸)

اس دُنیا میں جب تک زندہ رہا، ایک ہی کام کرتا رہا، یعنی تیرا نغمہ گاتا رہا، تیرے نیک اور مقبول بندوں کا نقیب بنا رہا، تیرے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کی لوگوں کو تلقین کرتا رہا، میرے نالۂ نارسا کو سن کر فاختۂ کہن صفیر بھی چلا اٹھی۔

کس نہ سرود در چمن نغمہ یار ایں چنیں

(زبور عجم:۱۸)

یعنی کسی نے آج تک اس چمن میں اسلاف و اکابر کا نغمہ اس لے اور اس دھن میں نہیں گایا تھا۔

(۶۸)

واردات

اقبال جب اپنے واردات بیان کرتے ہیں' تو ان میں عجیب لطف ہوتا ہے' شکوہَ الفاظ بھی اور جلال مغنی بھی' زبان کی دل کشی بھی اور مفہوم کی گہرائی بھی، بیان کی حلاوت بھی اور خیال کی رعنائی بھی' اصل بات یہ ہے کہ اقبال فن اور آرٹ کی خاطر شاعری نہیں کرتے' نہ عشق وہوس کی کیفیت ۔۔۔۔ جو سراسر مصنوعی ہوتی ہے ۔۔۔۔ اپنے اوپر طاری کر کے بلاکشانِ محبت میں اپنا نام لکھانا چاہتے ہیں۔ وہ تو صرف وہی کہتے ہیں جس کا ان پر القا ہوتا ہے۔ یعنی وارداتِ قلب یہ واردات اگر کسی کے لیے بالیدگیِ روح کا سبب ہیں تو ٹھیک' اور انقباضِ طبع کا موجب ہیں تو پرواہ نہیں۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

زبورِ عجم کی ایک غزل میں' فقر' جو اقبال کی مخصوص اصطلاح ہے' یعنی جو عبارت ہے مردِ مؤمن اور مردِ کامل سے ۔۔۔۔ کی تعریف کرتے ہیں اور بڑے والہانہ انداز میں کہتے ہیں:

آں فقر کہ بے تیغے صد کشور دل گیرد
از شوکتِ دارا بہ، از فرِّ فریدوں بہ

(زبورِ عجم: ۲۳)

وہ فقر جو تیغ وسناں کا سہارا لیے بغیر دلوں پر حکومت کرتا ہے' دارا کی دارائی اور

فرِ فریدوں سے کہیں بہتر ہے' تلوار کے زور سے اگر تاجِ شہریاری پہنا تو کیا پہنا' بات تو جب ہے کہ تیغ وسناں کی طرف نظر بھی نہ ڈالی جائے اور سر جھکنے لگیں، دل پابوسی کے لیے خود بڑھنے لگیں۔

اس طرح کی متعدد کیفیتیں بیان کرنے کے بعد اقبال اپنی جوئے معرفت کی طرف آتے ہیں اور بڑی خوداعتمادی کے ساتھ کہتے ہیں:

در جوئے روانِ ما ، بے منتِ طوفانے
یک موج اگر خیزد آں موج ز جیحوں بہ

(زبورِ عجم:۲۳)

جس طرح فقر بے منت تیغ وسناں دلوں پر حکومت کرتا ہے' اسی طرح میرے جوئے رواں جو معرفت اور حقیقت کا سمندر ہے، اس کی ایک معمولی سی موج بھی تو وہ سارے دریائے جیحوں سے بہتر اور برتر ہے۔ جیحوں کی موج صرف آس پاس تک پہنچتی ہے، لیکن میری جوئے معرفت کی موج وہاں کے شہر' دریا' اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

سیلے کہ تو آوردی در شہر نمی گنجد
ایں خانہ براندازے در خلوتِ ہاموں بہ

(زبورِ عجم:۲۳)

اب اقبال اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہیں اور کہتے ہیں' حقائق ومعارف کا یہ سیل بے پناہ جو اپنے جلو میں لایا ہے یہ شہر کے تنگنائے میں نہیں سما سکتا۔ اس کے لیے تو وسعتِ صحرا درکار ہے شہروں کی کشادگی تو صرف ندیوں' نہروں اور نالوں کی متحمل ہو سکتی ہے میرے سیل رواں کی تاب نہیں لا سکتی۔ اس کے لیے بے حد نہایت صحرا چاہیے۔ جس طرح میرے خیالات کی کوئی تھاہ نہیں' اسی طرح میرے خیالات کا نشیمن بھی ایسا ہونا چاہیے جس کا کوئی اور جوڑ نہ ہو۔

☆

چلیے ---- اقبال کے ساتھ چلتے رہیے۔ آپ تھکیں گے نہیں، گھبرائیں گے نہیں، بددل اور مایوس بھی نہیں ہوں گے، اقبال شاعر نہیں فخرِ طریقت ہے، اس کے نقشِ قدم پر

چلیے یااس کے ساتھ ساتھ چلیے یااس کے پیچھے پیچھے چلیے،آپ کی آنکھیں کھلتی جائیں گی،آپ کے اس دل پر انوار وتجلیات کی بارش ہوتی رہے گی،آپ نئے نئے مقامات سے گزریں گے،آپ پر نئے نئے احوال طاری ہوں گے،آپ کے نہاں خانہ دل میں ایسے ایسے تخیلات آئیں گے،جو رفعت میں جبریل امین کے ہمسر ہوں گے،آپ کا ذہن ایسی ایسی حقیقتوں کو محسوس کرے گا،جن کا آپ کو کبھی وہم وگمان بھی نہیں ہوا ہوگا،آپ ایسے ایسے کیفیات سے دوچار ہوں گے،جوآپ کے لیے عجیب بھی ہوں گے اوردل کش بھی،آپ کی آنکھیں وہ مناظر دیکھیں گی جن کی آپ اکیلے ہوتے،تنہا ہوتے تو تاب بھی نہیں لاسکتے تھے،آپ کا دل نئے افکار کا آماجگاہ بن جائے گا،آپ کی شوخیٔ افکار خودآپ کوحیران وششدر کردے گی،آپ کا جی چاہے گا یہ راستہ کبھی ختم نہ ہو،یہ زمین اپنی گردش بھول جائے،یہ فلک کج رفتار ساکت ہوجائے اورآپ چلتے رہیں۔۔۔اقبال کے ساتھ ساتھ اقبال کے پیچھے پیچھے۔

وہ دیکھیے شاعر۔۔۔اقبال۔۔۔اپنے کنج عزلت سے نکلا،آنکھیں خمار آلود ہیں،ماتھے پر غور وفکر کی شکنیں پڑی ہوئی ہیں،انداز میں بے پروائی بھی ہے اوراستغنا بھی۔۔۔۔کچھ آپ کومعلوم بھی ہے،اقبال کہاں جارہا ہے؟وہ خدا کی بارگاہ میں حاضر ہےاور کہہ رہا ہے:

یا جہانے تازہ یا امتحانے تازہ
می کنی تاچند باما آنچہ کردی پیش ازیں
یاچناں کن یاچنیں! (زبورِعجم:۲۴)

یعنی یاتو ایک نئی دُنیا پیدا کر یا اپنے امتحان کاانداز وسلوب بدل دے۔دُنیا بھی وہی پرانی ہے،امتحان وابتلا کی کیفیتوں میں بھی کوئی ندرت نہیں،وہی حق وباطل کی آویزش،وہی خاروگل کی کشمکش،وہی سیاہی اورسفیدی کی چشمک،وہی تاریکی اورروشنی کی کشاکش۔

ان دونوں میں سےایک چیز بدل دے یانئی دُنیا،یانیاامتحان۔

فقر بخشی؟ یا شکوہِ خسروِ پرویز بخش
یا عطا فرما خرد،با فطرت روح الامیں
یاچناں کن یاچنیں! (زبورِعجم:۲۵)

اگر تو فقر عطا فرمانا چاہتا ہے تو سبحان اللہ اس سے بڑھ کر نعمت اور کیا ہو سکتی ہے' لیکن وہ فقر نہیں' جو عبارت ہے' فاقہ کشی' زبوں حالی اور گرسنگی سے' وہ فقر چاہیے جس کے ساتھ شکوہ پرویز بھی ہو' جسے دیکھ کر دُنیا کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں، جس کی تاب سلاطین وملوک نہ لا سکیں، جس میں دبدبہ ہو' طنطنہ ہو' غلبہ ہو' تسلط ہو' کارفرمائی ہو۔

اور اگر وہ فقر نہیں دیتا جو شکوہ پرویز کا حامل ہو' تو پھر وہ خردِ عطا فرما جو فطرت روح الامین سے ساز رکھتی ہو۔ ایک چیز نہیں ملتی' نہ ملے' لیکن دوسری جو چیز ملتی ہے اس میں کچھ شان و تحمل تو ہو۔

یا بکش در سینۂ من آرزوئے انقلاب
یا دگرگوں کن نہادِ ایں زماں زمیں
یا چناں کن یا چنیں! (زبورِ عجم: ۲۵)

یہ میرے سینہ میں آرزوؤں کا جو طوفان اٹھ رہا ہے یا تو اسے ختم کر دے اور یہ نہیں کرتا تو پھر اس زمین و زماں کی نہاد بدل دے' یہ نہیں ہو سکتا کہ زمین و زماں کی نہاد بھی قائم رہے اور میرا سینہ محشرستان آرزو بھی بنا رہے' دونوں میں سے ایک چیز رہے گی' ورنہ

یا میرا گریباں چاک' یا دامن یزداں چاک

ایسی باتیں اقبال کے سوا کون کہہ سکتا ہے؟ یہ باتیں اسی کو زیب دیتی ہیں، وہی کہہ سکتا ہے، اسی پر اچھی لگتی ہیں، ہر بات ہر شخص نہیں کہہ سکتا، کہنے والا بھی ویسا ہی ہونا چاہیے جیسی بات۔

اقبال نے بڑے شوق سے فلسفہ و حکمت کی تکمیل کی تھی' لیکن اتنا کچھ پڑھ لینے اور حاصل کر لینے اور کامل ہو جانے کے باوجود انھوں نے محسوس کیا کہ وہ نہیں ملا' جس کی دل کو طلب تھی، لہٰذا وہ دانش افرنگ اور فلسفۂ مغرب سے متنفر اور بیزار ہو گئے۔ فرماتے ہیں:

حکمت و فلسفہ کرد است گراں خیز مرا
خضرِ من! از سرم ایں بارِ گراں پاک انداز

(زبورِ عجم: ۲۹)

نہ یہ حکمت میرے کام آئی، نہ یہ فلسفہ میرے درد کا درماں بنا، بلکہ اُلٹے ان چیزوں نے مجھے گراں خیز پر تکلف اور آرام طلب بنا دیا۔ لہٰذا، اے خدا! اس بارِ گراں کو ہٹا لے۔ میں تو وہ ہوں، جو زمین سے آسمان پر، دُنیا سے جنت میں، پستی سے بلندی تک پہنچنا چاہتا ہوں، لیکن یہ حکمت میرے پاؤں پکڑ لیتی ہے۔ یہ فلسفہ میرا عناں گیر ہو جاتا ہے۔

او بہ یک دانہ گندم بہ زمینم انداخت
تو بیک جُرعۂ آب، آنسوئے افلاک انداز

(زبورِ عجم:۲۹)

ابوالبشر آدم نے ایک دانۂ گندم کے باعث مجھے آسمان سے زمین کا مکین بنا دیا، تو اپنی شرابِ معرفت کا ایک جرعہ مجھے پلا اور اپنے قرب کی نعمت عطا فرما دے۔ میں اس پستی سے بلندی تک پہنچنا چاہتا ہوں تو میری دستگیری کر، میری مدد فرما، مجھے اپنا بنا لے۔

دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے

بسمل کی تڑپ

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہر پروانہ تھا
اب کوئی سودائی سوزِ تمام آیا تو کیا
پھول بے پروا ہیں، تو گرمِ نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے، آوازِ درا ہو یا نہ ہو

(بانگ درا:۱۸۶)

(۶۹)

پرواز

چو خس از موج ہر بادے کہ می آید زجا رفتم
دلِ من از گمانہا در خروش آمد، یقینے دہ
(زبورِ عجم:۳۰)

بہ جانم آرزوہا بود ونابودِ شرر دارد
شبم را کوکبے از آرزوئے دل نشینے دہ
(زبورِ عجم:۳۰)

بہ دستم خامہ داری کہ نقشِ خسروی بندد
رقم کش ایں چنینم کردۂ لوح جبینے دہ
(زبورِ عجم:۳۰)

ہوا کا ہر جھونکا ایک تنکے کی طرح مجھے اِدھر سے اُدھر کر دیتا ہے۔یعنی وساوس کی ہر لہر میرے اعتقاد و یقین کی دُنیا متزلزل کر دیتی ہے۔دل ہے کہ ظن وتخمین کی کثرت سے محشر ستاں بنا ہوا ہے۔۔۔۔اے خدا! اس دل ناتواں کو یقین وایمان کی قوت سے مستحکم کر دے تا کہ وساوس کا طوفان تند جولاں بھی اسے اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکے۔

اے خدا!

میری زندگی گہوارۂ حسرت وآرزو بنی ہوئی ہے۔لیکن آرزو کا ہے کی؟ ناپائدار اور

نامحکم چیزوں کی، یہ آرزو مجھے پسند نہیں۔ مجھے وہ قوی اور محکم آرزو چاہیے جو میری رات کی تاریکی میں کوکب امید بن کر چمکے۔

خدایا!

تو نے میرے ہاتھ میں موقلم دیا ہے کہ اس سے جو نقش ابھرتے ہیں وہ خسروی اور شہریاری کے نقوش ہوتے ہیں تو پھر اے خدا، وہ لوح جبیں بھی عطا فرما جس پر یہ نقوش میں مرتسم کرسکوں۔

مردان خدا

وہی ہے بندۂ حُر جس کی ضرب ہے کاری
نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیاری!
ازل سے فطرتِ احرار میں ہیں دوش بدوش
قلندری و قبا پوشی و کلہ داری!
زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
انہیں کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

(ضرب کلیم:۴۳)

(۷۰)

ہمہ از اوست

ہمہ افکارِ من از تست چہ دردل ، چہ بہ لب
گہر از بحر برآری' نہ برآری از تست
(زبورِ عجم:۳۴)

من ہماں مشتِ غبارم کہ بجائے نہ رسد
لالہ از تست و نمِ ابرِ بہاری از تست
(زبورِ عجم:۳۴)

گلہ ہا داشتم، از دل بہ زبانم نہ رسید
مہر و بے مہری و عیاری و یاری از تست
(زبورِ عجم:۳۴)

میرے افکار، خواہ دل کے نشیمن میں روپوش ہوں یا زبان پر آ کر افشاں ہوں۔۔ تیری مرضی اور اشارہ کے پابند ہیں۔

اپنے خیالات کے موتی فکر کے سمندر سے اگر نکال سکتا ہوں تو' اور نہیں نکال سکتا تو' سب کچھ تیری مرضی اور تیرے اشارہ پر منحصر ہے۔ میں تو کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

میری حیثیت کیا ہے؟ بس ایک مشتِ غبار اور یہ مشتِ غبار کیا ہوتا ہے؟ ہوا کے جھونکے کے ساتھ اپنی جگہ بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

لیکن میرا سینہ اگر گل لالہ کی طرح داغِ محبت کا آئینہ دار ہے اور میرے تنِ بے جان میں اگر عشق و فقر کی روح کارفرما ہے تو یہ تیرا اور صرف تیرا فیض ہے۔

یہ دُنیاوالے!

میں انھیں جانتا ہوں یہ کیا ہیں یا ان کی مہر ومحبت غرض سے خالی نہیں۔ان کی بے مہری اور بے رخی، پندار ونخوت کے سوا کچھ نہیں۔ان کی عیاری، ہوس اور خودغرضی کا نمونہ ہے۔ان کی عیاری صرف غرض ہے اور بس۔

لیکن یہ میں کیا کہہ گیا۔مجھے اور مجھے کیا ساری دُنیا کو جو کچھ ملتا ہے وہ تیری ہی طرف سے تو۔پھر شکوہ کس لیے اور شکایت کیوں؟۔۔۔میں خاموش ہوا جاتا ہوں۔

(۷۱)

مسافر

ازل تاب و تب پیشینہ من
ابد از ذوق و شوقِ انتظارم

(زبورِ عجم:۳۹)

میں راہِ عشق کا رہرو ہوں، نہ منزل کی جستجو نہ گھر کی آرزو کبھی سرِ راہ بیٹھ جاتا ہوں۔

بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

کبھی جہاں گشتی اور بادیہ پیمائی اختیار کر لیتا ہوں۔ آج یہاں، کل وہاں، کبھی اس شہر میں کبھی دوسرے شہر میں۔ یہاں بھی مسافر، وہاں بھی غریب الوطن۔

ہوائے خانہ و منزل نہ دارم
سرِ راہم، غریبِ ہر دیارم
ز چشمم اشک چوں شبنم فرو ریخت
کہ من ہم خاکم و در راہ گزارم!

☆

اپنی حیثیت پر غور کرتا ہوں تو آنکھوں سے جوئے اشک رواں ہو جاتی ہے۔

میری بساط اس کے سوا کیا ہے کہ مشتِ خاک ہوں اور رہگذر میں پڑا ہوں۔ جو چاہے ٹھوکر لگائے، جو چاہے پامال کر دے، ذرا سی ہوا چلے اور میرے اجزائے حیات منتشر ہو جائیں۔

لیکن اتنا کچھ نہ ہونے پر بھی بہت کچھ ہوں۔

ازل میری ہی تب وتاب کا نام ہے اور ابد میرے ہی ذوق وشوق انتظار سے عبارت ہے۔

انتھیں گلشنِ ہستی میں ثمر چیدہ بھی ہیں
اور محروم ثمر بھی ہیں، خزاں دیدہ بھی ہیں
سیکڑوں نخل ہیں، کاہیدہ بھی، بالیدہ بھی ہیں
سیکڑوں بطنِ چمن میں ابھی پوشیدہ بھی ہیں
نخلِ اسلام نمونہ ہے برومندی کا
پھل ہے یہ سیکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا

(بانگِ درا/۲۰۵)

(۷۲)

رمزِ عشق

رمزِ عشقِ تو بہ اربابِ ہوس نتواں گفت
سخن از تاب و تبِ شعلہ زخس نتواں گفت

(زبورِعجم:۴۶)

تو مرا ذوقِ بیاں دادی و گفتی کہ بگوے
ہست در سینۂ من آنچہ بہ کس نتواں گفت؟

(زبورِعجم:۴۶)

از نہاں خانۂ دل خوش غزلے می خیزد
سرِ شاخے ہمہ گویم، بہ قفس نتواں گفت

(زبورِعجم:۴۶)

میرے رب!

تو نے مجھے اپنے عشق سے نوازا ہے، لیکن یہ راز اربابِ ہوس پر میں فاش نہیں کر سکتا۔ کہیں تنکے سے شعلہ وشرر کی داستان بھی کہی جا سکتی ہے؟ کیا وہ تاب لا سکتا ہے، اس داستانِ خانہ برانداز کے سننے کی؟ ۔۔۔۔نہیں، ہرگز نہیں۔

تو نے مجھے قوتِ گویائی عطا فرمائی ہے۔ تیرے اس احسان کا شکر کس زبان سے ادا کروں؟ لیکن میرے مولا! میرے سینہ میں جو طوفان مچل رہا ہے اسے نااہل لوگوں کے سامنے کیوں کر واشگاف کردوں۔

دل کے نہاں خانہ سے خیالات بلند و جمیل کا تانتا لگا ہوا ہے لیکن یہ باتیں شاخ شجر پر بیٹھ کر کی جا سکتی ہیں قفس میں نہیں۔ آزادی ہو تو زبان پر ہر حرف راز آ سکتا ہے۔ غلامی میں تو زبان بندی رہتی ہے۔

چھوٹا سا طور ذرا سا کلیم

پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع! پیار کیوں؟
یہ جانِ بے قرار ہے تجھ پر نثار کیوں؟
کرتا ہے یہ طواف تری جلوہ گاہ کا
پھونکا ہوا ہے کیا تری برقِ نگاہ کا؟
آزارِ موت میں اسے آرامِ جاں ہے کیا؟
شعلے میں تیرے زندگی جاوداں ہے کیا؟
گرنا ترے حضور میں اس کی نماز ہے
ننھے سے دل میں لذّتِ سوز و گداز ہے
کچھ اس میں جوشِ عاشقِ حسنِ قدیم ہے
چھوٹا سا طور تُو، یہ ذرا سا کلیم ہے

(بانگِ درا: ۳۶۔۴۰)

(۷۳)

تغزّل

اقبال کی شاعری مقصد کی شاعری تھی' اظہار مقاصد کا ایک ذریعہ' لیکن جب کبھی غزل سرائی پر آتے ہیں' تو بھی انفرادیت کی پوری شان کے ساتھ۔۔۔۔چند شعر سن لیجیے:

یادِ ایّامے کہ خوردم بادہ ہا با چنگ و نے
جامِ مے دردستِ من، مینائے مے دردستِ وے

(زبورِ عجم: ۴۷)

وہ بھی کیا دن تھے جب میں اپنے محبوب کے ساتھ بیٹھ کر چنگ و نے کے ہجوم بادہ نوشی کرتا تھا' کیفیت یہ ہوتی تھی کہ شراب کا جامِ میرے ہاتھ میں اور شراب کی بوتل اس کے ہاتھ میں۔۔۔۔میں بادہ نوش وہ ساقی۔

درکنار آئی خزانِ ما زند رنگِ بہار
ورنیائی فرودیں افسردہ تر گردد زدے!

(زبورِ عجم: ۴۷)

تو اگر آغوش میں ہو تو خزاں بھی بہار ہے اور تو پاس نہ ہو' تو پھر بہار بھی خزاں سے بدتر ہے۔

آنچہ من در بزمِ شوق آوردہ ام دانی کہ چیست
یک چمن گل' یک نیستاں نالہ' یک خمخانہ مے!

میں بزمِ شوق میں کیا کچھ لے کر آیا ہوں معلوم ہے؟

ایک چمن کے برابر پھول ۔۔۔ایک جنگل کی بانسریوں کی وسعت کا نالہ و آہ۔۔۔
ایک پورا میخانہ۔ کیا اس کے بعد بھی کسی چیز کی ضرورت ہے؟

(۷۴)

نغمہ کجاو من کجا

یوں تو اقبال نے اپنی شاعری کے مقصد اور منہاج کو متعدد مواقع پر اشاریت اور رمزیت کے پیرایہ میں بیان کیا ہے لیکن کبھی کبھی ایسے موقع بھی آتے ہیں جب وہ واشگاف اور غیر مبہم الفاظ میں بتاتے ہیں کہ میری شاعری کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کی غرض کیا ہے؟ زبور عجم میں ایک مقام پر فرماتے ہیں:

نغمہ کجاو من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم، ناقۂ بے زمام را

(زبور عجم: ۵۵)

بھلا مجھے نغمہ سرائی سے کیا سروکار؟ کہاں میں کہاں شوقِ سرود۔

میں کہاں اور یہ وبال کہاں

بات یہ ہے کہ یہ میری شاعری ایک بہانہ ہے' ناقۂ بے زمام کے لیے۔ اس طرح اسے میں قطار سے نکلنے نہیں دیتا، شریکِ جماعت رکھتا ہوں۔

اونٹ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ نغمہ سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ راستہ دشوار گزار' مسافت بعید ہو، منزل پیچیدہ اور پر تعب ہو، تو ساربان حدی خوانی شروع کر دیتا ہے تاکہ اس نغمہ سرائی سے متاثر ہو کر وہ گرانی نہ محسوس کرے اور روانی کے ساتھ چلتا رہے۔ عرفی کا شعر ہے

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

آگے چل کر فرماتے ہیں:

وقتِ برہنہ گفتن است من بہ کنایہ گفتہ ام
خود تو بگو کجا برم ہم نفسانِ خام را!

(زبورِعجم:۵۵)

وقت کا تقاضا تو یہ ہے کہ جو کچھ کہنا ہے صاف صاف فاش اور برملا کہہ دوں' لیکن

گوش سخن شنو کجا بادیدۂ اعتبار تو؟

لہٰذا رنگِ محفل دیکھ کر بات کرنی پڑتی ہے' برہنہ گفتاری سے کام نہیں لیتا۔ کنایہ میں باتیں کرتا ہوں' اس لیے کہ جو لوگ میرے مخاطب ہیں وہ پختہ کار نہیں خام کار ہیں۔

☆

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
طرب آشنائے خروش ہو' تو نوا ہے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے' ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں
دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں' نہ مری حدیثِ گداز میں

(بانگِ درا: ۲۸۱۔۲۸۰)

(۷۵)

آشوب

دو عالم را تواں دیدن بہ میناۓ کہ من دارم
کجا چشمے کہ بیند آں تماشاۓ کہ من دارم

(زبورِ عجم: ۶۳)

مخور ناداں غم از تاریکیٔ شبہا کہ می آید
کہ چوں انجم درخشند داغِ سیماۓ کہ من دارم

(زبورِ عجم: ۶۳)

ندیم خویش می سازی مرا لیکن ازاں ترسم
نہ داری تابِ آں آشوب و غوغاۓ کہ من دارم

(زبورِ عجم: ۶۳)

میری بوتل میں جو شراب ہے وہ چشم کشا ہے، جس سے ہر دو عالم کا نظارہ کر لیا جا سکتا ہے ان کی حقیقت اور کمیت و کیفیت معلوم کر لی جا سکتی ہے، لیکن وہ آنکھ کہاں کہ وہ دیکھ سکے جو میں دیکھ رہا ہوں۔

☆

تجھے تاریکیٔ شب سے ڈر کیوں لگ رہا ہے؟ میں تو تیرے ساتھ ہوں اور تیری پیشانی پر جو داغ ہے وہ ستارے کی طرح چمک رہا ہے۔ اس روشنی میں تو بھٹک نہیں سکتا۔ اپنا

راستہ دیکھ، اپنی راہ چل۔

☆

تو نے مجھے اپنا ندیم اور رفیقِ راہ تو بنالیا اور میں بھی بن گیا۔
لیکن مجھے ایک اندیشہ بھی ہے۔
وہ یہ کہ میں اپنے اندر جو آشوب و غوغا پنہاں رکھتا ہوں، کیا تو اس کی تاب لا سکے گا؟
۔۔۔میں تو تیرا ندیم بن گیا، کیا تو بھی میرا ندیم بن سکے گا؟

☆

اے مسلمان

مثلِ بُو قید ہے غنچے میں، پریشاں ہو جا
رخت بر دوش ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ، تو ذرّے سے بیاباں ہو جا
نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

(بانگِ درا: ۲۰۷۔۲۰۶)

(۷۶)

مسلمان

ز سلطاں کنم آرزوئے نگاہے!
مسلمانم از گِل نہ سازم الٰہے!

(زبورِعجم:۷۴)

دلِ بے نیازے کہ در سینہ دارم
گدا را دہد شیوۂ پادشاہے

(زبورِعجم:۷۴)

بہ آں آب و تابے کہ فطرت بہ بخشد
درخشم چو برقے بابرِ سیاہے

(زبورِعجم:۷۴)

رہ و رسم فرماں روایاں شناسم
خراں بر سر بام و یوسف بہ چاہے!

(زبورِعجم:۷۴)

مجھے جو کچھ لینا ہے اپنے رب اور اپنے مولا سے لوں گا۔
میں مسلمان ہوں مٹی کے بت بنا کر نہیں پوجتا۔

☆

خدا کا شکر ہے دل بے نیاز کا مالک ہے اور یہ وہ چیز ہے جو گدا کو سلطان بنا دیتی

☆

فطرت (خدا) نے مجھے وہ آب وتاب بخشی ہے کہ گمراہوں کو راستہ دکھاتا ہوں، جیسے ابر تیرہ وتار کے اندر سے بجلی چمکتی اور بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھاتی ہے۔

☆

وقت کے ملوک وسلاطین کی حقیقت اور حیثیت خوب جانتا ہوں، اُن کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی گدھے کو برسرِ بام بٹھا دیا جائے اور یوسف کے نصیب میں چاہِ تاریک آئے۔

موت

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے!
خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں

(بانگِ درا: ۲۳۴-۲۳۳)

(۷۷)

غبار

زمیں بہ پُشتِ خود الوند و بے ستوں دارد
غبارِ ماست کہ بردوشِ اوگراں بود است
(زبورِ عجم:۸٦)

غلط خرامی ما نیز لذّتے دارد
خوشم کہ منزلِ مادور و راہ خم بہ خم است
(زبورِ عجم:۸۸)

مرا اگرچہ بہ بت خانہ پرورش دادند
چکید از لبِ من آنچہ در دلِ حرم است
(زبورِ عجم:۸۸)

یہ زمین۔۔۔اتنی مضبوط پیٹھ رکھتی ہے کہ الوندؔ بے ستون (اور ہمالیہ) جیسے پہاڑوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے' لیکن میرا مشتِ غبار اُٹھائے ہوئے اس کی کمر ٹوٹتی ہے۔

☆

میں غلط خرام ہوں۔۔۔۔غلط رو بھی ہوں' لیکن میں اس کیفیت سے دل برداشتہ نہیں ہوتا، لطف اندوز ہوتا ہوں' میری منزل دُور ہے اور راستہ پیچ در پیچ' جتنی ٹھوکریں کھاؤں گا اتنا ہی سنبھلوں گا۔۔۔۔یہ تو خوشی کا مقام ہے یا افسوس کا؟

☆

میں نے جس ماحول میں پرورش پائی وہ یکسر اور سراسر اسلامی تھا۔میں نے مغرب

ے دانش کدوں میں عمر گزاری، دانش ورانِ فرنگ کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا؟ جو کچھ پایا، ان سے پایا، جو کچھ سیکھا، ان سے سیکھا، لیکن فطرت سلیم نے مجھے راستہ پر ڈال دیا۔ میرے لب پر جو بات آتی ہے وہ اسلام کی ترجمان ہوتی ہے۔

پیام

ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دَور
خالی ہے جیبِ گل زرِ کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور
رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو
ناآشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ!

(بانگِ درا: ۲۴۹_۲۴۸)

(۷۸)
مردِ خود آگاہ

عشق اندازِ تپیدن ز دلِ ما آموخت
شررِ ماست کہ برجست بہ پروانہ رسید!
(زبورِ عجم:۹۰)

دُردِ من گیر کہ در میکدہ ہا پیدا نیست
پیر مردے کہ مئے تند و جوانے دارد!
(زبورِ عجم:۹۱)

پس از من شعرِ من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے
(زبورِ عجم:۱۰۰)

عشق نے یہ بے قراری کس سے سیکھی ہے؟ میرے دل سے۔
یہ میرا شرارِ آرزو ہے جو پروانہ تک پہنچا ہے اور جس نے پروانہ کو پروانہ بنا دیا ہے اور اس میں جل مرنے کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔

☆

تو نے بہت سے میکدوں کی خاک چھانی ہوگی اور خوب خوب قدح نوشی کی

ہوگی، جام وسبو کا کیا ذکر، ے خانے کے میخانے خالی کر دیے ہوں گے۔ لیکن ذرا میری شراب تند کی تلچھٹ سے اپنے کام و دہن کو لذت آشنا کر، میں بوڑھا ہوں، لیکن میری مے تند و جواں کا نمونہ تجھے کہیں اور کسی جگہ نہیں مل سکتا۔

☆

ایک دن میں اس دُنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ میرے بعد لوگ میرے کلام کا مطالعہ کریں گے، پڑھیں گے، سر دھنیں گے اور اس اعتراف پر مجبور ہوں گے کہ ہاں، یہ شخص شاعر نہیں تھا۔ یہ ایک مردِ خود آگاہ تھا، جس نے سارے جہان کو دگرگوں کر کے رکھ دیا، سوزِ آرزو سے آشنا کر دیا۔

جامِ زندگی

تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش
اور آبادی میں تو زنجیری کشت و نخیل!
پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی!

(بانگِ درا: ۲۵۸)

(۷۹)

نور و نار

من نہ دانم نور یا نار است اندر سینہ ام
ایں قدر دانم بیاضِ او بہ مہتابے زند
(زبورِ عجم:۱۱۱)

ز آستانۂ سلطاں کنارہ می گیرم
نہ کافرم کہ پرستم خدائے بے توفیق
(زبورِ عجم:۱۱۴)

صورت گری را از من بیا موز
شاید کہ خود را باز آفرینی!
(زبورِ عجم:۱۱۶)

مے جواں کہ بہ پیمانۂ تو می ریزم
زراوقے است کہ جام وسبو گداخت مرا
(زبورِ عجم:۱۳۲)

میں نہیں جانتا میرے سینہ میں نور کی تجلی ہے یا نار کی سوزش' اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جو کچھ میرے سینے میں ہے وہ روشن اور تابناک ہے اور اپنی درخشانی میں مہ نیم ماہ سے چشمک زنی کررہی ہے۔ چاند کی چاندنی اس کے سامنے بے حقیقت ہے۔

☆

شاہ وسلطاں کے ڈر سے مجھے کوئی مطلب نہیں' میں گدائے فاقہ مست نہیں کہ بادشاہوں کی درباداری کروں اور امیروں کی ڈیوڑھی پر حاضری دوں' نہ کافر ہوں کہ خدائے بے توفیق یعنی بتوں کی پرستش کروں' جو درحقیقت مجھ سے بھی زیادہ بے بس ہیں۔

☆

یہ نقش ونگار کیا دیکھتا ہے؟ یہ بے رنگ ہیں، ان میں تڑپ نہیں' زندگی نہیں' زندگی کی حرارت نہیں' میرے پاس آ۔ میں تجھے صورت گری کا فن سکھاؤں تاکہ تو اپنے آپ کو دیکھنے لگے۔ اپنے آپ کو پہچان لے' اپنی خودی سے واقف ہو جائے۔

☆

تیرے پیانہ میں جو شراب (معرفت) میں انڈیل رہا ہوں' یہ شراب انگوری نہیں۔ یہ اس صراحی کی ہے جس نے میرے جام وسبو کو پگھلا دیا ہے، مجھ میں وہ سوز پیدا کر دیا ہے جس نے مجھے خاکستر کر کے رکھ دیا ہے۔

(۸۰)

مری شاعری کیا ہے

مثل شرر ذرّہ را تن بہ تپیدن دہم
تن بہ تپیدن دہم' بال پریدن دہم!
سوزِ نوایم نگر! ریزۂ الماس را
قطرۂ شبنم کنم' خوئے چکیدن دہم!
یوسف گم گشتہ را باز کشودم نقاب
تا بہ تنک مایگاں ذوقِ خریدن دہم

(زبورِ عجم: ۱۲۳)

لوگ میری شاعری کا مطلب اور مقصد نہیں جانتے۔ میں بتاتا ہوں' میری شاعری۔ یعنی میرے دل کی آواز وہ ہے جس نے ذرّہ بے مایہ میں زندگی کی تڑپ پیدا کر دی ہے اور وہ لڑنے لگا ہے، ذوقِ نمو اور شوقِ ظہور سے بیتاب ہوا جا رہا ہے۔

اگر تو میری نوا کے سوز سے واقف ہونا چاہتا ہے تو پارہ سنگ کو دیکھ۔ اپنی نوا کی گرمی سے میں نے اسے قطرۂ شبنم بنا دیا ہے' اس میں لطافت اور لچک پیدا کر دی ہے۔ تو کتنا ہی بے حس ہو، تیرے سینہ میں دل کے بجائے پتھر ہی کیوں نہ ہو، میرے سوزِ نوا سے تو بھی پیکرِ سوز و گداز بن جائے گا۔ تجھ میں بھی تڑپ اور خلش پیدا ہو جائے گی۔

☆

میں نے یوسف گم گشتہ کے چہرے سے نقاب اُٹھا دیا ہے۔ تیری خودی بے نقاب کردی ہے تا کہ تجھ جیسے تنگ مایہ لوگوں میں خودی پیدا ہو، وہ منزل مقصود تک پہنچ جائیں، راستہ کا پیچ وخم انھیں گمراہ نہ کردے۔

زندگی

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرّ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

(بانگِ درا:۵۹۔۲۵۸)

(۸۱)

اے جوانانِ عجم

چوں چراغِ لالہ سوزم درخیابانِ شما
اے جوانانِ عجم جانِ من وجانِ شما
(زبورِعجم:۱۲۵)

مہر ومہ دیدم نگاہم برتر از پرویں گذشت
ریختم طرحِ حرم در کافرستانِ شما!
(زبورِعجم:۱۲۵)

می رسد مردے کہ زنجیرِ غلاماں بشکند
دیدہ ام از روزنِ دیوارِ زندانِ شما
(زبورِعجم:۱۲۵)

حلقۂ گردِ من زنید اے پیکرانِ آب وگل
آتشے در سینہ دارم از نیاگانِ شما
(زبورِعجم:۱۲۵)

عجم کے نوجوانو!

تمہارے باغ وچمن میں چراغِ لالہ کی طرح میں سلگ رہا ہوں ـــــ مجھے پہچانو۔ میری سنو، میں تمھیں وہ باتیں بتا رہا ہوں جو حیات آفریں ہیں، جنھیں سن کر، جن پر عمل کر کے تم اپنی زندگی سنوار سکتے ہو، زندوں میں شمار ہو سکتے ہو، غیر فانی کارنامے انجام دے سکتے ہو۔

میں نے مہر ومہ کا نظارہ کیا، میں سورج تک پہنچ گیا، میں نے چاند تک رسائی حاصل

کرلی، میں پرویں کی بلندی سے دُور بہت دُور' اونچا' بہت اونچا نکل گیا۔لیکن میرے عزیزو! میں نے کسی کو شایانِ آرزو نہ دیکھا' کسی میں وہ بات نہیں جو تم میں ہے' تم میرے امیدوں کا حاصل ہو' میں جانتا ہوں۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

(بالِ جبریل:۱۱)

اس لیے میں نے سب سے قطع نظر کر کے تمھارے کافرستان میں طرح حرم ڈالی ہے۔ جانتا ہوں یہ تحمل تمہارے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ تم ہی ہو جو مستقبل کے امام ہو۔

جانتا ہوں تم غلام ہو اور غلامی نے تمہارے حوصلے پست کرر کھے ہیں۔تم جو کہنا چاہتے ہو نہیں کہہ سکتے' جو کرنا چاہتے ہو نہیں کر سکتے' تم پابہ زنجیر ہو، مہر بہ لب ہو۔

لیکن یہ دَور ہمیشہ باقی رہنے والا نہیں ہے۔ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں تمہاری دیوارِ زنداں میں شگاف پڑ چکا ہے، یہ دیوار ٹوٹنے والی ہے، گرنے والی ہے، وہ مرد کار جلد نمودار ہوگا جب تمہاری غلامی کی بیڑیاں کٹ جائیں گی، تم آزاد ہو جاؤ گے، اپنی خودی کی تعمیر میں آزاد ہو گے، اپنا مستقبل اپنی لوحِ جبیں پہ خود اپنے ہاتھ سے اپنے قلم سے لکھو گے، اپنی زندگی' زندگی کے احوال شب و روز کے تم مالک ہو، جس سانچہ میں چاہو ڈھال لو' جو وضع اختیار کرنا چاہو کرلو، تم آزاد ہو گے اور آزاد مردوں کی طرح اپنے قول و فعل کی بجا آوری میں کسی کی پابند نہیں ہو گے، تمہاری مرضی تمہاری رضا ہو گی، تمہارا ضمیر تمہارا قافلہ سالار ہو گا، تمہارا حوصلہ تمہارا رفیق راہ ہو گا اور تم کامیابی کے ساتھ اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے، گوہرِ آرزو حاصل کرلو گے۔

اے پیکرانِ آب و گل!

آؤ میرے گرد اکٹھے ہو جاؤ' اب

میں کوئی نئی بات نہیں کہتا، وہی کہتا ہوں جو بزرگوں سے سنی ہیں، اسلاف سے پائی ہیں، اکابر سے سیکھی ہیں، ان میں تمہارے لیے زندگی کا پیام ہے، اس پیام کو نہ ٹھکراؤ، اسے سنو' اس کی قدر کرو۔ اسے اپنالو۔

بندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

(بانگِ درا:۲۵۹)

(۸۲)

زبورِ عجم

زبورِ عجم اقبال کے افکار بلند کا بڑا دل آویز مجموعہ ہے۔خود اقبال بھی اس کی رفعت اور بلندی کے قائل ہیں۔اپنے قارئین کو متعدد مواقع پر انھوں نے دعوت دی ہے کہ زبورِ عجم کا مطالعہ کریں، میرے پیام کی غرض غایت تب ہی سمجھ میں آسکتی ہے۔اس کتاب میں انھوں نے اپنے مقام و منصب، اپنی ذات و شخصیت اور اپنے پیام و دعوت کے بارے میں بھی بتایا ہے کہ وہ کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ میرے خیال میں زبورِ عجم کے سوا' اقبال کا کوئی اور مجموعۂ کلام ایسا نہیں ہے جس میں اس شرح و بسط' اس تفصیل و اعناب اور اس وضاحت کے ساتھ رعنائی و زیبائی' دلکشی اور جمال کی تمام خوبیوں کو سمو کر اپنے اور کلام سے متعلق گل افشانی کی ہو۔

اقبال کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ اسلام کے بہت بڑے مبلّغ تھے۔انھوں نے سارا زورِ کلام صرف اس بات پر صرف کیا ہے کہ مسلمان پھر مسلمان بن جائیں اس لیے کہ انہیں یقین ہے

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا (بالِ جبریل:۳۱)

وہ جانتے ہیں اس گئی گزری حالت میں بھی اس انحطاط و ادبار کے ہوتے ہوئے بھی اگر اسلام کا نام لے کر' دُنیا میں کوئی قوم اٹھ سکتی ہے اور ربع مسکوں کو ہلا سکتی ہے تو وہ صرف ملّتِ اسلامیہ ہے۔

آج یہ راستہ سے بھٹکی ہوئی ہے۔اپنے آپ کو' اپنے ماضی کو' اپنے اسلاف کو فراموش کر چکی ہے، لیکن اس میں خصوصیتیں اب بھی وہی ہیں جو پہلے تھیں، اس کی سرشت نہیں بدلی

ہے، اس کی فطرت میں تبدیلی نہیں ہوئی ہے، صرف خود فراموشی کا عالم طاری ہو گیا ہے، اس پرُ سو یہ کوئی ایسا مرض نہیں جس کا مداوا نہ ہو سکے۔ اقبال کا کلام، درحقیقت اس کا مداوا ہے۔ وہ مرد مسلمان کو اُبھارتے ہیں، اُکساتے ہیں، حوصلہ دلاتے ہیں اور اس میں وہ رُوح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو کبھی اس کی خصوصیت تھی اور جس نے اسے ثرٰی سے ثریا تک پہنچا دیا تھا۔ آسمان کی اس رفعت اور بلندی کے سامنے ایک ذرّہ حقیر معلوم ہوتے تھے۔ اقبال چاہتے ہیں کہ وہ گزرا ہوا زمانہ پھر واپس آ جائے۔ دُنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے یہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ صرف سعی و کوشش اور جدّ و جہد کی ضرورت ہے۔

اقبال اپنی اسلامیت پر شرماتے نہیں، نہ اپنے مسلمان ہونے پر معذرت کرتے ہیں، نہ وہ آفاقی شاعر ہونے کے بجائے، قومی شاعر ہونے پر کسی قسم کی ندامت محسوس کرتے ہیں۔ وہ ایک زندہ قوم کے نقیب ہیں، وہ ایک پائندہ پیام کے امین ہیں، وہ ایک تابندہ دین کے پرستار ہیں، انہیں اپنے مذہب پرُ اپنی قوم پرُ اپنے ماضی پر فخر ہے اور یہ فخر وہ اپنی قوم کی پود میں منتقل کر دینا چاہتے ہیں۔

اپنی قوم کو بار بار بتاتے ہیں دیکھ میں کون ہوں، سن میں کیا کہہ رہا ہوں، محسوس کرُ کس طرف میں تیری توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ بھی بتاتے ہیں میں کیا کر چکا ہوں اور مجھے کیا کرنا ہے، وہ اس حقیقت کے چہرہ سے بھی نقاب اٹھاتے ہیں کہ یہ جو آج چمن کا ماحول بدلا ہوا ہے، فضا میں تبدیلی نظر آ رہی ہے، بھٹکا ہوا آہو پھر سوئے حرم رواں دواں ہے، اس میں پھر سوزِ آرزو پیدا ہو چکا ہے، اس کا سینہ پھر محشرستان تمنا بن گیا ہے، اس میں پھر وہی حوصلہ اور ولولہ تڑپنے لگا ہے جس نے کبھی اسے دُنیا کی قسمت کا مالک بنا دیا تھا، تو یہ سب میری ہی نوا سنجی کا اثر ہے، میں نے ہی اس ناقۂ بے زمام کو سوئے قطار بھیجا ہے، میں نے ہی اس خود فراموش اور فراموش کار کے سامنے یوسف گم گشتہ (خودی) کو بے نقاب کیا ہے، میں نے ہی اسے بتایا ہے کہ وہ صحرا نشین کیسے جہاں بان اور جہاں دار تھے، کس شان سے انھوں نے تاج سردارا چھینا تھا اور کس تحمل سے انھوں نے پہنائے عالم پر اپنا پرچم لہرایا تھا، تو ان سب باتوں کو بھول گیا تھا، میں نے ہی تجھے بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔ تو محوِ عیش ہے، میں رات بھر جاگتا ہوں، دن بھر کڑھتا

ہوں' تو سوتا ہے، میں جاگتا ہوں تو بھولتا ہے، میں یاد دلاتا ہوں، تو غلط راستہ پر ہو لیتا ہے، میں تیرا دامن پکڑ لیتا ہوں اور صراط مستقیم کی طرف تیری رہنمائی کرتا ہوں، تو اگر کچھ بن سکتا ہے تو میری دعوت قبول کر کے' میرے پیام پر عمل کر کے میری بات مان لے ورنہ تو بھٹکا ہوا راہی رہے گا۔ اپنے آبا سے تجھے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ وہ سیار تھے تو ثابت ہے۔

چنانچہ ایک موقع پر وہ اپنے مقام و منصب پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

دمِ مرا صفتِ باد فرودیں کردند
گیاہ را ز سرِشکم چو یاسمیں کردند

(زبورِ عجم:۱۲۶)

یعنی میرا نفس' اہل چمن کے لیے باد بہار ہے۔۔۔۔ میں جمود اور تعطل کی دعوت نہیں دیتا، نمو اور نمود کی دعوت دیتا ہوں' جس سے زندگی کے مرجھائے ہوئے پھول پھر کھلنے لگتے ہیں، جس سے خزاں رسیدہ چمن میں پھر سے بہار آ جاتی ہے، جس سے سوئے ہوئے پھر جاگ جاتے ہیں، نہ صرف یہ کہ نیند کے بارے ہوشیار ہو جاتے ہیں بلکہ جن پر موت کا سناٹا چھا چکا ہے وہ بھی زندگی کی اُمنگ سے آشنا ہو جاتے ہیں۔

اور اے میرے مخاطب! اے میری قوم کے گل سر سبد' تو بہر حال انسان ہے، دل رکھتا ہے کہ محسوس کرے' کان رکھتا ہے کہ سنے' زبان رکھتا ہے کہ کہے لیکن مجھے تو خدا نے وہ کمال مرحمت فرمایا ہے کہ میں صرف انسانی مخلوق ہی پر نہیں' جامد اور بے جان اور غیر حساس چیزوں پر بھی اثر انداز ہوں۔۔۔۔ یہ گھاس' یہ گیاہ خودرو کیا ہے؟ کیا اس میں جان ہے' کیا یہ احساس کی دولت سے مالا مال ہے؟ نہیں' یہ تو صرف اس لیے ہے کہ روندی جائے اس کا مقصدِ حیات اس کے سوا کیا ہے کہ ذرا دیر کے لیے زمین کے نہاں خانہ سے جھانکے اور پھر جانوروں کے کام آئے۔ وہ اسے چریں' کھائیں' پامال کریں اور اس کے ننھے سے ذوق نمو کو کام و دہن کا لقمہ بنا لیں۔ بس اس سے زیادہ تو سبزہ خودرو کی کوئی حیثیت نہیں، لیکن میری طرف دیکھ اور پھر چمن پر ایک نظر ڈال' یہ گل یاسمین جو تجھے نظر آتا ہے کیا ہے؟ یہ گھاس کا ایک تنکا تھا جسے میرے آنسوؤں نے سینچا اور گل یاسمیں بنا دیا۔

بلند بالٗ چنانم کہ بر سپہر بریں
ہزار بار مرا نوریاں کمیں کردند
(زبورِ عجم:۱۳۶)

میں بلند بال ہوں۔ میری رفعت کا نظارہ کرنے کے لیے آنکھ چاہیے، میری بلند پائی کی یہ کیفیت ہے کہ سپہر بریں کی نورانی مخلوق، یعنی فرشتے بھی مجھ پر رشک کرتے ہیں، مجھے دیکھ کر محوِ حیرت ہو جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ میں ان کا اسیر بن جاؤں، وہ مجھے اپنا بنا لیں، لیکن یہ بات میرے رتبہ سے فروتر ہے، ایسا نہیں ہو سکتا، میں خدا کا طالب ہوں، حق سے میں نے لو لگائی ہے۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ کسی مخلوق سے خواہ وہ نوری ہی کیوں نہ ہو دل لگالوں؟ یہ کیوں کر ممکن ہے؟

نمودِ لالۂ صحرا نشیں ز خوں نابم
چنانکہ بادۂ لعلے بساتگیں کردند
(زبورِ عجم:۱۳۶)

اور یہ لالۂ صحرائی جو تمہیں نظر آتا ہے، جسے دیکھ کر آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے، یہ کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ ماہیت کیا ہے؟

جس طرح گھاس میرے آنسوؤں سے سیراب ہو کر گل یاسمین بن گئی، اسی طرح میرے خونِ جگر کی تراوش نے لالۂ صحرا نشیں کو سرخ روئی بخشی اور وہ ایسا بن گیا جیسے پیالہ میں شراب سرخ رکھی ہوئی ہو۔۔۔ بات یہ ہے کہ وہ گل یاسمیں ہو یا لالہ صحرا نشین، یہ سب ہماری ہی نگاہوں کی تجلی، ہمارے ہی خیال کا کرشمہ اور ہمارے ہی ذوقِ حسن کی نمود ہے۔ غالب نے یہی بات ایک دوسرے لیکن نہایت دل آویز اور لطیف پیرایہ میں بیان کی ہے۔

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

ہم حسن، یعنی خدا کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور یہ حسین و جمیل، نظر وفریب اور دل کشا مظاہر ہماری نگاہ حسن کی مخلوق ہیں۔ خدا نے ہمیں پیدا کیا اور ہم نے ان چیزوں کو آب و رنگ عطا کیا۔

(۸۳)

بزمِ خموشاں

اقبال مسلمانوں کی انجمن کو بزمِ خموشاں'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں اور ان کا یہ خیال غلط نہیں کہ مسلمانوں پر افسردگی طاری ہو چکی ہے، وہ اضمحلال کے عادی بن چکے ہیں، جمود ان کی سرشت ہے' خوابِ غفلت ان کا مزاج' خود فراموشی ان کی زندگی' یہ تاریخ کی بہت بڑی ٹریجڈی ہے کہ وہ قوم جو کردار و عمل کے لحاظ سے اپنا جواب نہ رکھتی ہو، جس نے اپنے عزم و استقامت کے وہ نمونے دُنیا کے سامنے پیش کیے ہوں جن پر دشمن بھی عش عش کر اٹھے ہوں اور انگشت بدنداں رہ گئے ہوں، اب صرف ایک بزمِ خموشاں ہے جس میں کوئی ہنگامہ نہیں، کوئی آشوب نہیں، کوئی غوغا نہیں، حالانکہ ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جب یہی قوم تھی جس کی ہنگامہ خیزیوں نے سمندر کو کھنگال ڈالا تھا، آسمان کے ستاروں پر کمند ڈالی تھی اور انہیں اپنا اسیر کر لیا تھا۔

لیکن۔۔۔!

لیکن جب میں نمودار ہوا تو عشق کے زور سے میں نے یہ دُنیا بدل دی۔ یہی بزمِ خموشاں آشوب اور ہنگامہ کی دُنیا بن گئی۔ میں نے اپنا سوز آرزوؤں میں منتقل کر دیا اور اسے تڑپ' تپش اور خلش عطا کر دی۔

زبورِ عجم کی ایک غزل میں اقبال نے یہی بات بڑے دلکش انداز میں کہی ہے۔

عشق از فریاد ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد
ورنہ ایں بزمِ خموشاں، ہیچ غوغائے نہ داشت!

(زبورِ عجم:۱۳۶)

میرے عشق کی کارفرمائیوں نے نئے نئے آشوب اور ہنگامہ پیدا کیے' ورنہ اس بزمِ

خموشاں میں تو سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نہ حرکت، نہ حرارت، نہ زندگی، نہ جوش، نہ آرزو، نہ تمنا۔

ایک دوسری غزل میں اسی مضمون کو اور زیادہ خروش اور ہمہمہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

ہنگامہ ایں محفل از گردشِ جامِ من
ایں کوکبِ شامِ من، ایں ماہِ تمامِ من

(زبورِ عجم: ۱۳۹)

اس "بزمِ خموشاں" میں یہ ہنگامہ آرائی، یہ آشوب و خروش جو نظر آ رہا ہے یہ میرے جام کی گردش کا نمونہ ہے۔ میں اپنے جنونِ عشق کا مظاہرہ نہ کرتا تو یہ ہنگامہ برپا نہ ہوتا، وہی خموشی چھائی رہتی۔ بزمِ خموشاں کی بے رنگی اور بے لطفی میں کوئی فرق نہ آیا اور سچ پوچھو تو یہی ہنگامہ میری زندگی ہے، میری کائنات ہے، یہ میرا کوکبِ شام ہے جس کی روشنی میں قطعِ مسافت کرتا ہوں، یہ میرا مہ تمام ہے، جس کی نوا سے میں اپنی منزل کا سراغ لگاتا ہوں۔ یہ نہ ہوتی میں بھی نہ رہوں۔ اس کے دم سے میں ہوں۔ میری نوائے دم بدم یہ میرا ہنگامہ اور خروش ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

اے عالمِ رنگ و بو، ایں صحبت ما تا چند
مرگ است دوامِ تو عشق است دوامِ من!

(زبورِ عجم: ۱۳۹)

عالمِ رنگ و بو یعنی دُنیائے دوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔

تو میرے ساتھ کیوں لگا ہوا ہے؟ میرا تیرا میل کیا؟ تیری حقیقت کچھ اور ہے، میری حقیقت کچھ اور، میرے اور تیرے درمیان کوئی وجہِ اشتراک نہیں، ہم دونوں کی منزل الگ الگ ہے، ہم دونوں ایک ندی کے دو ایسے کنارے ہیں جو کبھی نہیں مل سکتے جن میں بُعد تو بڑھ سکتا ہے لیکن قرب نہیں پیدا ہو سکتا۔۔۔۔۔۔ کیونکہ تو فانی ہے اور ہمیں عشق نے غیر فانی بنا دیا ہے، تو باقی رہنے والا نہیں اور ہم باقی ہیں۔ تیرا انجام مرگ دوام اور ہمارا انجام (عشق کی بدولت) زندگی جاوید۔

(۸۴)

گلشن راز جدید

علامہ محمود شبستری کی معروف انام اور یگانہ روزگار کتاب ''گلشن راز'' آج سے کم و بیش آٹھ سو سال پہلے منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب وحدۃ الوجود کی شارح اور غماز ہے۔ بڑے دقیق مسائل بڑے لطیف پیرایہ میں بیان فرمائے ہیں۔ اس کی شان نزول یہ ہے کہ ایک صاحب کے سترہ سوالات جو غامض ترین فلسفہ کی پیداوار اور نازک ترین مسائل خودی و خدا سے متعلق تھے، پیش کیے۔ شبستری نے انہی کا جواب لکھ کر خود غیر فانی شہرت حاصل کر لی اور کتاب بھی اس موضوع پر حیرت آفرین تھی۔

اقبال کا زمانہ شبستری سے زیادہ نازک اور پیچیدہ معاملات و مسائل کا دور تھا۔ انھوں نے نئے رنگ میں، لیکن بنیادی طور پر علامہ محمود شبستری کے نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہو کر لکھی ہے۔ شبستری نے دُنیا کا بہت بڑا فتنہ آشوبِ چنگیز کی صورت میں دیکھا تھا۔ چنگیز کی ہلاکت سامانیاں، سفاکیاں، درندگی اور شقاوت کے مظاہرے، وحشت اور بربریت کے نمونے، انسانی خون کی ارزانی، مسلمانوں کی تباہی و بربادی اور ہلاکت، یہ سب کچھ دیکھ کر شبستری نے مسلمانوں کو تلقین کی تھی کہ وہ اپنی حقیقت کو سمجھیں، اپنے دین پر غور کریں اور وہی بن جائیں جو اُن کا رب چاہتا ہے۔

اقبال کا دور بھی بڑا ہنگامہ پرور تھا۔ شبستری نے اگر آشوبِ چنگیز کا نظارہ کیا تو اقبال کے حصہ میں آشوبِ فرنگ آیا جس نے مسلمانوں کے فکر و عقائد کی بنیادیں متزلزل کر کے رکھ دیں۔

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

(بالِ جبریل:۱۱)

اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ غمزۂ خوں ریز کافر مغرب کا تھا۔ چنگیز نے صرف گردنیں کاٹی تھیں، عمارتیں ڈھائی تھیں، جان وتن کا رشتہ منقطع کیا تھا، کھیتوں میں آگ لگائی تھی۔ شہروں کو کھنڈر بنا دیا تھا، آبادیوں کو بن میں منتقل کر دیا تھا، تہذیب وتمدن اور ثقافت وجرأت کے نقوش نوکِ خنجر سے کھرچ دیے تھے، لیکن یہ سب وہ نقصانات تھے جن کی تلافی ممکن تھی اور یہ امکان عمل میں آیا یعنی بے شک مسلمانوں کو نقصان پہنچا لیکن وہ فنا نہیں ہوئے، باقی رہے، درخت کی شاخیں اور پتیاں کاٹ دی جائیں تو کچھ عرصہ بعد وہ اور زیادہ ہرا بھرا اور بارآور ہو جاتا ہے۔ مسلمان بھی آشوبِ چنگیز کے گرداب میں پھنس کر تباہ ہوئے لیکن پھر ابھرے۔ پھر بڑھے، پھر دُنیا میں انھوں نے اپنا مقام حاصل کر لیا اور ایسا معلوم ہوا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ جیسے کسی طرح کا نقصان پہنچا ہی نہیں تھا۔ مسلمان جب گر کر سنبھلتا ہے تو بہت اچھی طرح چوکس ہو کر سنبھلتا اور میدانِ حیات میں قدم رکھتا ہے۔ یہی صورت ہنگامۂ چنگیز کے بعد رونما ہوئی۔

لیکن اقبال نے، جو فتنہ فرنگ دیکھا، وہ ہنگامہ چنگیز کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تباہ کن، ہلاکت خیز، مرگ آفریں اور ہولناک تھا۔ اس انقلاب نے اتنا بڑا ستم کیا جو کبھی نہ کیا تھا۔

دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

(بانگِ درا:۱۸۹)

اس فتنہ نے مسلمانوں کی گردنیں کاٹیں اور ان کی فکر ونظر پر بھی تلوار چلائی، اس انقلاب نے مسلمانوں کے تخت وتاج بھی چھینے اور ان کی متاع دین ودانش پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس آشوب نے مسلمانوں کے شہر بھی ویران کیے اور ان کی دُنیائے دل بھی تاراج کر دی، اس سیل سبک سیر وزمین گیر نے مسلمانوں کی دولت وسطوت بھی لوٹی اور اعتقاد ویقین پر چھاپہ مارا اس عفریت فرنگ نے مسلمانوں کی صحیح تاریخ کو دریا برد کر دیا۔ غلط تاریخ لکھی،

پڑھائی' از بر کرائی اور اسے ایک صحیفہ کا درجہ دے دیا، اس ابلیسِ فرنگ نے مسلمانوں کو غلام بنایا' لیکن تن کے ساتھ ساتھ من کی دُنیا پر بھی اپنا سکہ چلایا۔ چنگیز جوانوں کو غلام بناتا تھا ساحر فرنگ نے بچوں کو بھی نہ چھوڑا۔ اس نے مدرسے کھولے' کالج کھولے' یونیورسٹیاں قائم کیں اور نئی پود ایسی تیار کی جو اپنے آبا سے منحرف ہوگئی، اپنے اسلاف کو برا سمجھنے لگی، اپنے اکابر پر طعن کرنے لگی، اپنے اور اپنے اسلاف کا مذاق اڑانے لگی، اپنے ماضی کو بے کیف اور بے رنگ سمجھنے لگی، اپنے علمی، سائنسی اور تاریخی کارناموں کو افسانہ اور داستان سمجھنے لگی، اپنے آپ سے غافل ہوگئی' اپنی خودی سے محروم ہوگئی۔ اس نے اپنا دین' اپنا ایمان' اپنا عقیدہ' اپنا یقین' اپنا علم' اپنی دانش ہر چیز جلوہ فرنگ کی نذر کردی۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی آشوب ہوسکتا تھا؟

عروج وزوال' ادبار وانحطاط' عارضی اور وقتی چیز ہے، قومیں ابھرتی ہیں اور گرتی ہیں، اٹھتی ہیں اور گر پڑتی ہیں، ٹھوکر کھاتی ہیں اور سنبھلتی ہیں، یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر ماتم کیا جائے اور نوحہ خوانی کی جائے، اقبال نے ایسے ہی موقعہ پر کہا تھا

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے

(بانگِ درا:۲۰۶)

ایران مٹ جائے' کوئی پروا نہیں، تیرا مسکن ساری دُنیا ہے تو نہیں اور کا مکیں ہو جائے گا اور اپنا ایران بنالے گا۔ لیکن اگر ایران رہ گیا لیکن تو مٹ گیا تو کیا ہوگا؟ مقصود تو ہے یا ایران واصفہان؟ پاکستان اور افغانستان؟ نہیں یہ زمین کے ٹکڑے مقصد نہیں ہو سکتے۔ مقصود تو ہے، تجھے زندہ رہنا چاہیے، تجھے آفات وحوادث سے محفوظ رہنا چاہیے، تیری آن اور تیری خودی میں فرق نہیں آنا چاہیے۔ ساحرِ فرنگ نے دوہری چال چلی۔ اس نے ایران کو بھی مٹایا اور تجھے بھی، عراق کو بھی پامال کیا اور تجھے بھی، شام ولبنان کو بھی کچلا اور تجھے بھی، مصر اور مغرب اقصیٰ اور طرابلس الغرب کو بھی خون کا غسل دیا اور تجھے بھی، تیرے فکر ونظر کو بھی، تیرے ایمان' عقیدے اور یقین کو بھی، تیرے قلب' روح اور خودی کو بھی۔ بخارا اور ترکستان تو نے بسائے تھے، آذر بائیجان اور خراساں کو تو نے رونق بخشی تھی، ترکمان اور کوہ قاف کی زینت تیرے دم سے تھی، آج یہ سب موجود ہیں لیکن تو کہاں ہے؟ تو کیوں نہیں ہے؟

اس تاریخ کی سب سے بڑی اور ہولناک ٹریجڈی نے اقبال کو مجبور کیا کہ وہ ایک نئی ''گلشن راز'' لکھیں۔ رنگ وہی ہو' بات کا انداز بدلا ہوا ہو۔ اصول وہی ہو' پیرایہ دوسرا ہو۔ بنیاد وہی ہو' لیکن طرز کچھ اور ہو۔

اس جذبہ کے ماتحت اقبال نے مثنوی گلشن راز جدید'' لکھی اور کوئی شبہ نہیں اس مختصر سے کتابچہ کو وہ مقام حاصل ہے جو بڑے بڑے فکری صحیفوں کو بھی نہیں حاصل ہے۔ یہ بھی اقبال کا کمال ہے۔۔۔۔اور بہت بڑا کمال۔

ہمارے موضوع سے' مثنوی گلشن راز جدید کے مباحث و مسائل خارج ہیں اس لیے کہ اس کتاب میں ہم اقبال کے فلسفہ اور پیام سے بحث نہیں کر رہے ہیں' صرف اقبال کو تلاش کر رہے ہیں کہ اپنے اشعار کے آئینہ میں وہ کیسا نظر آتا ہے؟ اس کے خدوخال کیسے ہیں؟ اس کا چہرہ مہرہ کیسا ہے؟ اس کی جبین پرشکن اور چشم جہاں بین کی کیا کیفیت ہے؟ اور یہ کہ وہ خود اپنے بارے میں۔۔۔ تعلّی اور خودستائی سے ہٹ کر۔۔۔۔ کیا رائے رکھتا ہے؟ کن الفاظ میں اظہار خیال کرتا ہے؟

اگر ہم اقبال کی شخصیت کو صحیح طور پر سمجھ لیں تو اس کے پیام اور فلسفہ کو سمجھنے میں ذرا دیر بھی نہیں لگے گی، پھر تمام اسرار منکشف ہو جائیں گے، تمام گرہیں کھل جائیں گی، تمام مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

لیکن کسی شخصیت کا سمجھنا آسان نہیں ہے جب کہ وہ شخصیت معمولی نہ ہو، بلکہ اقبال جیسی ہمہ جہتی شخصیت ہو۔ جو فلسفی بھی ہے اور حکیم بھی، شاعر بھی ہے اور صوفی بھی' مفکر بھی ہے اور واعظ بھی، رند بھی ہے اور شیخ حرم بھی، عالم بھی ہے اور ناصح بھی، غازی بھی ہے اور مجاہد بھی، زندہ بھی ہے اور شہید بھی۔ اس کی ذات رنگا رنگیوں اور بوقلمونیوں کا مجموعہ ہے۔ ان رنگوں کو ان کے صحیح مقام پر رکھنا، انہیں صحیح زاویہ سے دیکھنا، انہیں ان کی حقیقت کے اندر محبوس و مقید ہو کر سمجھنا نہ آسان ہے نہ ہر شخص کے بس میں ہے۔ اس کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ ہم خود اقبال سے پوچھیں۔ کہیے اپنے بارے میں بغیر کسی تکلف اور خودستائی کے آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟ کیونکہ قاعدہ ہے۔

تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں

آپ خود ہی اپنی تحقیق ہیں۔ دوسروں کے مقابلہ میں اپنی شرح و تفسیر زیادہ خوبی اور سچائی سے کر سکتے ہیں۔ لہٰذا آپ جو کچھ اپنے بارے میں ارشاد فرمائیں گے، وہی صحیح اور درست ہوگا، کیونکہ ہم آپ کے بارے میں یقین رکھتے ہیں۔

مستند ہے تیرا فرمایا ہو

اس سوال کے جواب میں جو کچھ اقبال نے کہا ہے اس کا کچھ حصہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں اور وہ اقبال کو سمجھنے کے لیے بہت کافی ہے۔ کیونکہ اقبال اپنے بارے میں فرماتے ہیں۔

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

(بانگِ درا:۶۰)

لیکن معاف کیجیے گا

تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

اقبال سے بڑھ کر اقبال کا اداشناس، مزاج داں اور شناسا کون دوسرا ہو سکتا ہے؟ وہ خود اپنا بہترین مفسر اور بہترین شارح ہے۔

فرماتے ہیں:

گزشت از پیشِ آں دانائے تبریز
قیامت ہا کہ رست از کشتِ چنگیز

(زبورِ عجم:۱۴۶)

دانائے تبریز (علامہ محمد شبستری) کی آنکھوں کے سامنے وہ خوں چکاں قیامت گزری جسے فتنۂ چنگیز کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

نگاہم انقلابے دیگرے دید
طلوعِ آفتابے دیگرے دید (زبورِ عجم:۱۴۶)

لیکن میری نگاہ بھی ایک بہت بڑا اور خوفناک اور ہلاکت خیز انقلاب دیکھ چکی ہے جو اپنی نوعیت اور نتیجہ کے اعتبار سے آشوبِ چنگیز کے مقابلہ میں بہت بڑھا ہوا ہے۔ میں نے بھی ایک دوسرے سورج کی چمک دمک دیکھی ہے جو تن بدن کو جھلسائے دیتی ہے۔

کشودم از رُخِ معنی نقابے
بدستِ ذرّہ دادم آفتابے

(زبورِ عجم: ۱۴۶)

میں بھی اب ضبط نہیں کر سکتا' اور شبستری کی طرح عروسِ معنی کو بے نقاب کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ میں بہت بڑا کام کر رہا ہوں، ذرّہ بے مقدار کے ہاتھ میں سورج کی شمع دے رہا ہوں کہ

لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان
کیا اس کی روشنی میں بھی وہ اپنا جادہ اپنی منزل نہیں دیکھ سکے گا؟

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم
مثالِ شاعراں افسانہ بستم

(زبورِ عجم: ۱۴۶)

یہ خیال نہ کرنا کہ بغیر پئے مست ہوں اور عام شاعروں کی طرح افسانہ طرازی میں معروف ہوں۔ میں حقیقت بیان کرتا ہوں' برہنہ اور عریاں حقیقت۔

نہ بینی خیرازاں مردِ فرودست
کہ برمن . تہمتِ شعر و سخن بست

(زبورِ عجم: ۱۴۶)

اس آدمی سے کسی سچائی کی توقع نہ رکھنا جو مجھ پر شعر و سخن کی تہمت رکھتا ہے یعنی یہ کہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں الفاظ سے کھیلنے والا شاعر ہوں۔

بہ کوئے دلبراں کارے نہ دارم
دلِ زارے غمِ یارے نہ دارم (زبورِ عجم: ۱۴۶)

دلبروں، زہرہ وشوں اور مہ جبینوں کے کوچہ سے مجھے کیا کام؟ میں عشق مجازی کا قائل نہیں، عشق حقیقی کا نام لیوا ہوں۔

نہ خاکِ من غبارِ رہ گزارے
نہ در خاکم دلِ بے اختیارے

(زبورِ عجم: ۱۴۶)

میں والا مقام اور بلند بام ہوں۔ میری خاک رہ گزار کے لیے نہیں ہے۔ نہ میں ایسے دل کا مالک ہوں کہ جہاں پھسل جائے اور میں اس کے سامنے بے بس ہو جاؤں۔

بہ جبریلِ امیں ہم داستانم
رقیب و قاصد و درباں نہ دانم

(زبورِ عجم: ۱۴۶)

میں جبریل امین کا ہم زباں اور ہم نفس ہوں۔ نہ میرا کوئی رقیب ہے جس سے مجھے اندیشہ ہو، نہ میں کوئی قاصد رکھتا ہوں کہ اسے نامہ بر بنا کر کسی معشوق ہرجائی کے پاس بھیجوں اور اشک و آہ مصنوعی کی سوغات روانہ کروں۔

سوزِ فغاں جنبشِ دیوار و در غلط

میں ان سب باتوں سے بے نیاز ہوں۔

مرا با فقر سامانِ کلیم است
فرِ شاہنشہی زیرِ گلیم است

(زبورِ عجم: ۱۴۶)

اگر چہ میں مردِ فقیر ہوں، لیکن سامان کلیم سے بہرہ ور ہوں، کمبل اوڑھتا ہوں لیکن فرِ شہنشاہی داب سلطانی اور رعب شہریاری میرے کمبل کے نیچے دبا رہتا ہے۔ یہ چیزیں مجھ پر حکومت نہیں کر سکتیں۔ میں ان پر قائم اور ان کا کارفرما ہوں۔ اس لیے کہ اسلام کا فقر روباہی نہیں سکھاتا، اس میں شان ہوتی ہے، جلال ہوتا ہے، دبدبہ ہوتا ہے، قوت ہوتی ہے۔ وہ دُنیا والوں سے نہیں ڈرتا، ملوک و سلاطین کی پروا نہیں کرتا، امراء کے در کا طواف اس کا شعار

نہیں۔وہ خود ایک طاقت ہے اور اتنی بڑی طاقت کہ بادشاہ اسے خراج دیتے ہیں اور سلاطینِ عالم اس کے در پر حاضری دیتے ہیں۔

اگر خاکم بہ صحرائے نہ گنجم
اگر آبم بہ دریائے نہ گنجم

(زبورِ عجم:۱۴۶)

اگر خاک ہوں تو بھی ایسی خاک جو صحرا کی وسعت میں نہیں سما سکتی اور اگر قطرہ ہوں تو بھی ایسا جسے سمندر کی پہنائی بھی کافی نہیں ہے۔

دل سنگ از زجاجِ من بہ لرزد
یمِ افکارِ من ساحل نہ ورزد

(زبورِ عجم:۱۴۶)

میں شیشہ ہوں، لیکن ایسا شیشہ جس سے پتھر کا دل لرزتا ہے۔میرے افکار کا سمندر اتنا گہرا، اتنا چوڑا، اتنا بے کراں ہے کہ اس کا ساحل ہی نہیں ہے۔

نہاں تقدیر ہا در پردۂ من
قیامت ہا بغل پروردۂ من

(زبورِ عجم:۱۴۶)

میرے پردہ میں تقدیریں پوشیدہ ہیں، قیامتیں، ہنگامے، طوفان، آشوب، ان سب کو میرے ہی دامن میں تو تربیت عطا ہوتی ہے، ورنہ ہنگامہ سکون بن جائے، آشوب موت بن جائے، طوفان جامد ہو جائے۔

دمے در خویشتن خلوت گزیدم
جہانے لا زوالے آفریدم

(زبورِ عجم:۱۴۶)

جب کبھی خود اپنے آپ سے مخاطب ہو کر بیٹھتا ہوں تو یہ وقت بھی رائگاں نہیں جاتا، میری حکومت میں لازوال، زمانے ڈھلتے ہیں۔میری کارگاہِ فکر میں نئی نئی دنیائیں تعمیر ہوتی ہے۔

به جانم رزم مرگ و زندگانی است
نگاهم بر حیات جاودانی است

(زبورِ عجم:۱۴۷)

میں مرگ وحیات کے اسرار سے واقف ہوں' میری نگاہِ حیات جاوداں کی راز آشنا ہے۔

ز جاں خاک ترا بیگانہ دیدم
به اندامِ تو جانِ خود دمیدم

(زبورِ عجم:۱۴۷)

تیری خاک کو زندگی کی حرارت سے بیگانہ دیکھتا ہوں، اس لیے چاہتا ہوں کہ تیرے تن ناتواں میں اپنی روح پھونک دوں تا کہ تو بھی وہی ہو جائے جو میں ہوں۔ تیرے سینہ میں بھی وہی جذبہ مچلنے لگے جس نے مجھے بے قرار کر رکھا ہے۔

ازاں نارے که دارم داغ داغم
شبِ خود را بیفروز از چراغم

(زبورِ عجم:۱۴۷)

یہ میرے دل کے داغ آخر کس کام آئیں گے۔ میرے اس چراغ سے تو اپنی شب تاریک کیوں نہیں روشن کر لیتا؟

به خاکِ من دلے چوں دانه کشتند
به لوحِ من خطِ دیگر نوشتند

(زبورِ عجم:۱۴۷)

جس طرح کھیت میں دانۂ گندم ڈالا جاتا ہے اور اس کی کاشت ہوتی ہے اسی طرح میری خاک سے دلوں کی کھیتی ہوتی ہے۔ لوح میری ہے، تقدیر دوسروں کی۔

اسرارِ حیات

رہزنِ ہمت ہوا ذوقِ تن آسانی ترا
بحر تھا صحرا میں تو، گلشن میں مثلِ جو ہوا
اپنی اصلیت پہ قائم تھا، تو جمعیت بھی تھی
چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروانِ بو ہوا
زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا

(بانگِ درا: ۱۹۰-۱۸۹)

(۸۵)

معنیٔ تازہ

مسلمان کی نارسائی اور ناکامی کے اسباب وعوامل کیا ہیں؟۔۔۔ان کے خواص وعام میں مذہب پر کٹ مرنے کا جذبہ ہے لیکن رہنما انہیں دھوکہ دیتے ہیں، فریب میں مبتلا رکھتے ہیں، صوفی انہیں اسیرِ دام کرتا ہے، ملا ان سے حقائق کو چھپاتا ہے، عالم انہیں جاہل سمجھتا ہے، یہ لوگ اگر راستہ سے ہٹ جائیں تو مسلمان پنپ سکتا ہے یا یہ لوگ خود سدھر جائیں تو عوام کو بھی سدھار سکتے ہیں۔

اقبال مردِ مسلمان کو مشورہ دیتے ہیں کہ تو ان سب کو چھوڑ، خود اپنے آپ کو پہچان، خود اپنے ضمیر سے فتویٰ لے، خود اپنی رائے پر عمل کر اور خود اپنے رستے پر چل۔۔۔۔اس لیے کہ جن لوگوں سے تو نے آس لگائی ہے یہ تجھے کبھی بھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتے، یہ خود گم کردہ راہ ہو چکے ہیں۔

سب سے پہلے بے ثباتیٔ عالم پر اظہارِ خیال کرتے ہیں:

ایں گل و لالہ تو گوئی کہ مقیم اند ہمہ
راہ پیما صفتِ موجِ نسیم اند ہمہ

(جاویدنامہ:۸۳)

یہ گل ولالہ یعنی یہ جاہ وجلال، یہ شان وشکوہ، یہ اقتدار واختیار، یہ فرمانروائی اور جہاں کشائی، یہ کارفرمائی اور دولت وثروت، کیا تو انہیں مستقل، غیر فانی اور ابدی سمجھتا ہے؟

نہیں، یہ تیری غلط فہمی ہے، ان سب کو فنا ہونا ہے اور موجِ نسیم کی طرح، یہ فنا کی منزل کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

یہ بیان کر چکنے کے بعد وہ مسجد و مکتب کی طرف رخ کرتے ہیں:

معنئ تازہ کہ جوئیم و نیا بیم کجاست
مسجد و مکتب و مے خانہ عقیم اند ہمہ

(جاوید نامہ:۸۳)

میں زندگی کے نئے معنی تلاش کرتا ہوں مگر کہیں نہیں پاتا۔ مسجد میں جاتا ہوں، تو وہاں وہی ملا کی کم نظری، خانقاہ کا رخ کرتا ہوں تو وہاں وہی صوفی کی کم نگاہی، مے خانے پہنچتا ہوں تو وہاں وہی رہنماؤں اور رہبروں کی جنگ زرگری۔

نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

ایسا معلوم ہوتا ہے، یہ سارے ادارے بانجھ ہو چکے ہیں۔ نہ ان میں شوخی افکار ہے نہ فکر و تعمق، نہ سعی و جہد، نہ ذوقِ اجتہاد، ہے کیا؟ صرف جمود، قدامت، یہ لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں، واقعات اور حقائق سے آنکھیں چراتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ اس طرح آنکھیں بند کر لینے سے وہ ٹھوس حقائق، وہ اہم مسائل خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ یہ ان کی سادگی ہے، حقیقت سے کہیں نظر چرائی جا سکتی ہے؟

حقیقت آپ منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

غرض ان مقامات پر صلاح و فلاح کی امید لے کر جانا حماقت ہے۔

اس مایوسی کے بعد وہ اُمید کا چراغ روشن کرتے ہیں اور خود اعتمادی کا پیام دیتے ہیں۔

حرفے از خویشتن آموز و دراں حرف بہ سوز
کہ دریں خانقاہ بے سوزِ کلیم اند ہمہ

(جاوید نامہ:۸۳)

لہٰذا تقاضائے دانش و مصلحت یہ ہے کہ تو ان سے الگ ہو جا۔ خود غور و فکر کی عادت ڈال، اپنی عقل و فہم سے کام لے، اپنے ضمیر کو رہنما بنا، یہ خانقاہوں میں رہنے والے وہ لوگ ہیں جو سوز سے محروم ہیں جانتے ہی نہیں سوز و تپش کی لذت کیا ہوتی ہے؟ انہیں جو کچھ معلوم ہے، وہ

صرف یہ کہ دوا اور دو چار روٹیاں' یا پھر پیکار باہمی' اس سے فرصت ملے تو باہمی تکفیر۔

کار کافر فکر وتدبیر جہاد
کار ملا فی سبیل اللہ فساد

لہٰذا تو خود اپنا رہنما بن' ان رہزنوں سے آس نہ لگا۔

از صفا کوشی ایں تکیہ نشیناں کم گوئے
موئے ژولیدہ ونا شستہ گلیم اند ہمہ

(جاوید نامہ:۸۳)

ان تکیہ نشینوں' ان پیروں' ان نام نہاد فقیروں کے دام ہمرنگ زمین کا شکار نہ بن۔ یہ صرف اسلاف کے مجاور بن کر بیٹھے ہیں اور اس کی روٹی کھا رہے ہیں۔ یہ خود کچھ نہیں ہیں۔ نہ ان کے پاس علم ہے نہ معرفت' نہ نگاہ' نہ خود شناسی' نہ خودنگری' نہ خوداعتمادی' نہ ایمان' نہ یقین' یہ اپنے قیاس سے' اپنے اقوال سے' اپنی چرب زبانی سے کام لے کر تیرے اوپر مسلط ہو گئے ہیں اور تجھے اپنا آلۂ کار بنائے ہوئے ہیں، تو ان کے چنگل میں کیوں پھنسا ہوا ہے، اٹھ اپنی منزل آپ تلاش کر۔۔۔۔۔وہ مل جائے گی' وہ ضرور ملے گی۔

چہ حرم ہا کہ درونِ حرم حرمے ساختہ اند
اہلِ توحید یک اندیش و دونیم اند ہمہ

(جاوید نامہ:۸۳)

یہ شعر نہیں حقائق ومعارف کا ایک دفتر ہے۔

دریا بہ حباب اندر

اسی کو کہتے ہیں۔ واقعی اقبال نے اس ایک شعر میں سمندر سمو دیا ہے۔

یہ موجودہ دور کے علماء۔۔۔ان کی حقیقت کیا ہے؟ چند مستثنیات سے قطع نظر کر کے عام طور پر ان کے حالات کیا ہیں؟ یہ ہیں کہ نہ ان کے پاس علم ہے' نہ ان کے پاس نظر۔ علم حاصل کرنا گناہ سمجھتے ہیں' لیکن عالم بنے ہوئے ہیں۔ خدا نے بار بار اپنے قرآن میں غور وتفکر کی دعوت دی ہے، مگر یہ غور وفکر کو کارِ بے کاراں سمجھتے ہیں۔ اسلام' ایک زندہ متحرک اور فعال

مذہب ہے' لیکن انھوں نے اسے جامد بنادیا ہے۔ اسلام کا حکم مسلمان کے لیے یہ ہے کہ وہ سارے آفاق کو تسخیر کرلے' لیکن یہ مسلمان میں بے دلی اور بے حسی پیدا کررہے ہیں اور خود ان کا حال یہ ہے کہ اپنے نفس کو بھی تسخیر نہیں کرسکتے۔ انہیں صرف اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔ اسلام پر کیا گذر رہی ہے' ملت اسلامیہ پر آفات و مصائب کا کس طرح نزول ہورہا ہے؟ ان مسائل سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں، ہاں اگر کچھ دلچسپی ہے تو فرقہ بندی سے۔ انھوں نے حرم کے اندر اور بہت سے حرم بنا رکھے ہیں۔ کوئی کسی جماعت سے وابستہ ہے کوئی کسی مسلک سے اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کو کافر سمجھتا ہے' جو اسے کافر نہ مانے اسے کافر قرار دیتا ہے۔ سود مرکب کی طرح اس کا فتوائے کفر بھی مرکب ہے۔ ایک آدمی سے شروع ہوتا ہے اور پھر سارے خاندان تک' سارے حلقہ احباب تک پہنچ جاتا ہے۔ ان کا کام یہ تھا کہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے' اسلام کی تبلیغ کرتے' اسلام کے حقائق دُنیا کے سامنے پیش کرتے' دُنیا کو اسلام سے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں انہیں دُور کرتے' مسلمانوں کی اصلاح کرتے، ان میں غیر مذہبی رسوم و عادات جو پیدا ہوگئے ہیں انہیں دور کرانے کی کوشش کرتے، مسلمانوں کو قرآن سکھاتے، قرآن کے حقائق سے آشنا کرتے، اسوۂ نبیؐ کو ان کے سامنے پیش کرتے اور ان کے کردار کو مسلم اور مستحکم بنادیتے، اسلاف کے کارنامے ان کے علم میں لاتے اور ان میں یہ جذبہ پیدا کردیتے کہ وہ اپنے اکابر پر' اپنے اسلاف پر' اپنے ماضی پر فخر کرنے لگتے۔

لیکن یہ کچھ نہیں کرتے۔ ایسا کام جس سے مسلمان سربلند ہوں، اپنے دین کو پہچانیں، اپنی حقیقت سے واقف ہوں، ان کے نزدیک یہ معیوب ہے قابلِ ملامت ہے۔ ان کا محبوب مشغلہ صرف یہ ہے کہ تکفیر کی تلوار چلاتے رہیں اور جو سامنے آجائے بغیر کسی امتیاز اور تخصیص کے اس تلوار سے اس کی گردن کاٹ لیں۔ یہ اپنی طویل اور پرفن زندگی میں ایک مسلمان بھی نہ بنا سکے۔ ہاں بہت سے مسلمانوں کو انھوں نے کافر ضرور بنادیا۔

کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی افسوسناک کام ہوسکتا ہے؟ یہ اگر کچھ نہیں کرسکتے تھے تو کم از کم میدان سے ہٹ جاتے۔ لیکن یہ بھی ان پر گراں ہے۔ یہ مسلط بھی رہنا چاہتے ہیں اور ملت اسلامیہ کی سالمیت کو پارہ پارہ کررہے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اہلِ توحید آپس

میں ایک دوسرے کے حریف بن کر کھڑے ہوئے ہیں۔ان میں اختلاف اور انتشار پیدا ہو چکا ہے۔

مشکل ایں نیست کہ بزم از سرِ ہنگامہ گزشت
مشکل ایں است کہ بے نقل وندیم اند ہمہ

(جاویدنامہ:۸۳)

اصل مشکل یہ نہیں ہے کہ بزم شور زندگی سے محروم ہو چکی ہے۔وہ تو ہر وقت پیدا ہو سکتا ہے۔اصل مشکل یہ ہے کہ ان عناصر نے جن کا ابھی ذکر ہوا ساری قوم کو مفلوج اور معطل بنا دیا ہے' نہ اس کے سامنے کوئی لائحہ عمل ہے نہ اس کا کوئی مسلک ہے۔

اعجاز شعر

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم
شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم
پاک رکھ اپنی زباں، تلمیذِ رحمانی ہے تو!
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو!
سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلادے شعلۂ آواز سے

(بانگِ درا:۵۳)

(۸۶)

آہ فغان بے اثر

جاوید نامہ میں فلک زہرہ پر پہنچنے اور مرشد رومی سے نیاز حاصل کرنے سے پہلے اقبال اپنے واردات بیان کرتے ہیں اور اپنی نفسی کیفیتوں کا جائزہ لیتے ہیں اور بڑی حسرت کے ساتھ اپنے اور اپنی قوم کے فرض کو واضح کرتے ہیں۔

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے

(بالِ جبریل:۷۹)

لیکن بات ایسی اثر انگیز ہے کہ ایک ایک لفظ تیر کی طرح دل میں ترازو ہوتا جاتا ہے۔جس کیفیت کو بیان کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ میرا دل تو محشرستان بنا ہوا ہے،اس میں طوفان اٹھتے ہیں' شورشیں برپا ہوتی ہیں،امیدوں اور آرزوؤں کے ایوان تیار ہوتے ہیں،میری نگاہ بلند ان پر جا کر بھی نہیں رکھتی،وہ اونچی ہوتی رہتی ہے اور زیادہ اونچی ہوتی رہتی ہے،لیکن میری قوم۔۔۔۔؟ وہ مستِ خواب ہے،اس میں نہ حرکت ہے نہ زندگی' نہ شرارِ آرزو' نہ سوزِ حسرت نہ ذوقِ نظر' نہ شوقِ جستجو۔اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

از مقامِ خود نہ می دانم کجاست

ایں قدر دانم کہ از یاراں جداست

(جاوید نامہ:۸۸)

میرا مقام کیا ہے؟ میں کہاں ہوں؟ یہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ساتھیوں اور دوستوں سے رفیقوں اور ندیموں سے میرا راستہ مختلف ہے۔وہ اپنی جگہ پر منجمد

ہیں لیکن حرکت اور جنبش مجھے ٹھہرنے نہیں دیتی۔ شوقِ جستجو ہے جو مجھے آوارہ رکھتا ہے اور میں رواں دواں چلتا رہتا ہوں۔

اندرونم جنگ بے خیل و سپہ
بیند آں کو ہم چو من دارد نگہ

(جاوید نامہ:۸۸)

میرے مقصد، میری غایت، میری منزل۔۔۔اسلام۔۔۔ کے خلاف جتنے طوفان اٹھتے ہیں، میں ان سب کا مقابلہ کرتا رہتا ہوں۔ میرے پاس نہ فوج ہے، نہ سپاہ ہے، لیکن میرے دم خم میں فرق نہیں آتا۔ پیکار میرا اشعار ہے اور میں برابر جنگ میں مصروف رہوں گا، جب تک یہ جنگ جیت نہ لوں۔ یعنی غیر الٰہی قوتوں کو پامال کر کے مسلمان کو پھر مسلمان بنا دوں۔

بے خبر مرداں ز رزمِ کفر و دیں
جانِ من تنہا چو زین العابدینؑ!

(جاوید نامہ:۸۸)

میری قوم کے لوگ، میرے ساتھی اور ندیم، اس جنگ سے ناواقف اور لاعلم ہیں جو کفر و دیں کے درمیان جاری ہے اور جو اپنے اثرات کے لحاظ سے بڑی نتیجہ خیز اور دوررس ہے۔ غفلت اور خود فراموشی کی اس سے بڑھ کر اور کیا کیفیت ہوگی کہ قوم اس کشمکش سے دلچسپی نہ رکھتی ہے، نہ اس جنگ کو جیتنے کے لیے حرکت کرتی اور میدانِ عمل میں اترنے کی جرأت کرتی ہے۔
لیکن میں اکیلا میدان میں ڈٹا ہوا ہوں۔ جیسے امام زین العابدین کربلا کے میدان میں اپنا سب کچھ لٹا چکنے کے بعد بھی موجود تھے۔ ان پر نہ ہراس طاری ہوا تھا نہ دشمن کی دہشت۔

غرقِ دریا طفلک و برناؤ پیر
جاں بہ ساحل بردہ یک مردِ فقیر! (جاوید نامہ:۸۸)

صورت حالات یہ ہے کہ چاہے جوان ہو یا بوڑھا، یا بچہ، یہ سب دریائے غفلت میں

غرق ہیں۔ان میں سے کسی میں نہ حوصلہ ہے نہ امنگ۔یہ ڈبکیاں کھا رہے ہیں مگر ساحلِ مراد کی طرف بڑھتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔بس یہ ایک مردِ فقیر۔۔۔اقبال۔۔۔ہے جو ساحل کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔

برکشیدم پردہ ہائے ایں و ثاق
ترسم از وصل و نیالم از فراق

(جاوید نامہ:۸۸)

میں نے حجابات اٹھا دیے ہیں اور راز کی بات بتا دی ہے اور وہ راز کی بات یہ ہے کہ خبردار وصل کی آرزو نہ کرنا' فراق کی آگ میں سلگتے رہنا۔قرب کی آرزو کی اور شوق و جستجو کا سلسلہ بند ہوا' اور اس سلسلہ کے بند ہوتے ہی مرگِ نوم کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے' جو اقوام وملل کے لیے بھی تباہ کن ہے اور افراد و اشخاص کے لیے بھی' کیونکہ

وصل اگر پایانِ شوق است الحذر
اے خنک آہ و فغانِ بے اثر!

(جاوید نامہ:۸۸)

اگر مطلوب و مقصود کی انتہا وصل ہی ہے تو یہ کم ہمتی کی افسوس ناک مثال ہے۔وصل تو شوق کی ابتدا بھی نہیں ہے' نہ کہ انتہا۔میں کتنے دنوں سے یہ نکتہ اپنی قوم کے نوجوانوں اور ذوقِ طلب رکھنے والوں کو سمجھا رہا ہوں' لیکن کیا کروں' قوم آہ و فغاں یعنی درد و سوز' سوز کی لذّت سے بے پروا ہو چکی ہے۔میں اپنی کہتا رہوں اور لوگ من مانی کرتے رہتے ہیں۔ذرا غور نہیں کرتے' میں کیا کہہ رہا ہوں' کس طرح رہنمائی کر رہا ہوں؟

راہ رو از جادہ کم گیرد سراغ
گر بہ جانش سازگار آید فراغ

(جاوید نامہ:۸۸)

وہ راہ رو منزل کی طرف کیا سفر جاری رکھ سکے گا جو عافیت اور آرام کا خوگر ہو جائے' یہ سعادت تو انہی لوگوں کے حصہ میں آئی ہے جو فراغ کے دشمن اور عافیت کے عدو ہوتے

ہیں۔لہٰذا اے مسلمان اگر منزل تک پہنچنے کا سودا سر میں واقعی سمایا ہے تو پھر فراغ وعافیت سے کنارہ کشی اختیار کر۔ دیوانہ بن اور منزل کی طرف بے پرواہو کر چل کھڑا ہو۔

آں دلے دارم کہ از ذوقِ نظر
ہر زماں خواہد جہانے تازہ تر

(جاوید نامہ:۸۸)

میں تو اپنے سینہ میں وہ دل رکھتا ہوں جس کا ذوق نظر ہر آن اور ہر لحہ ایک نئے جہاں اور نئے زماں کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔ بھلا ان لوگوں کے ساتھ میں کس طرح گذر کرسکوں گا جو عافیت کے خوگر اور آسائش کے متلاشی ہیں؟

درسِ عمل

خوب ہے تجھ کو شعارِ صاحبِ یثربؐ کا پاس
کہہ رہی ہے زندگی تیری کہ تو مسلم نہیں
جس سے تیرے حلقہٗ خاتم میں گردوں تھا اسیر
اے سلیماں! تیری غفلت نے گنوایا وہ نگیں!
وہ نشانِ سجدہ جو روشن تھا کوکب کی طرح
ہوگئی ہے اس سے اب ناآشنا تیری جبیں!
دیکھ تو اپنا عمل ، تجھ کو نظر آتی ہے کیا
وہ صداقت جس کی بے باکی تھی حیرت آفریں
تیرے آبا کی نگہ بجلی تھی جس کے واسطے
ہے وہی باطل ترے کاشانۂ دل میں مکیں

(باقیات:۲۳۱)

(۸۷)
حسرتِ تعمیر

اب گھومتے گھامتے' اقبال فلک مریخ پر پہنچتے ہیں، مرشد رومی خضر راہ ہیں۔ یہاں وہ ایک پیر مرد سے اقبال کو ملاتے ہیں' اور اس پیر مرد سے مل کر وہ بہت متاثر ہوتے ہیں:

دیر سال و قامتش بالا چو سرو
طلعتش تابندہ چوں ترکانِ مرد

(جاوید نامہ:۱۰۳)

وہ بھی بہت جلد رومی کے تعارف پر اعتماد کرتے ہوئے اقبال سے گھل مل جاتا ہے۔ ان کا ہاتھ پکڑتا ہے اور اپنے ایک شہر مرغدین کا چکر لگاتا ہے۔وہاں کے بام ودر' وہاں کی عمارتیں' باغ وچمن' بندۂ مزدور اور کسان' ہر طرح کے لوگوں سے ملاتا ہے۔ ہر طرح کے طبقات سے اور ان کے خصوصیات سے آشنا کرتا ہے۔اقبال اس کے ساتھ شہر کا گشت کر رہے ہیں۔ ہر قدم پر ایک نیا جلوہ دیکھتے ہیں اور حیران وششدر رہ جاتے ہیں۔اس لیے کہ یہاں کی ہر چیز انوکھی اور نرالی نظر آتی ہے۔اپنی دُنیا میں جو کشت وخون' کشمکش اور کشاکش' مفاد کا تصادم' اغراض کی جنگ' خود غرضی کے مظاہر ہر روز اور ہر آن دیکھتے رہتے ہیں،ان کا یہاں دور ونزدیک پتہ بھی نہیں۔ عجیب خوش قسمت شہر ہے، جہاں سب یکسوئی سے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ نہ لڑائی نہ جھگڑا' نہ فتنہ نہ شورش' نہ اسٹرائیک نہ ہڑتال' نہ یوم مطالبات نہ مزدور یونین' نہ مل اونرس ایسوسی ایشن۔۔۔۔۔۔۔یہ تھی مرغدین کی دُنیا۔

درحقیقت' پیر مرد مریخ کے روپ میں اقبال خود بول رہے ہیں اور شہر مرغدین کی صورت میں وہ اس مثالی اور اسلامی ریاست STATE کا تصور پیش کر رہے ہیں جو ان کا

مقصود منتہا تھا۔ یعنی وہ اپنی قوم کو بتانا چاہتے ہیں کہ اس دُنیا کا موجودہ نظام اپنی بے بضاعتی نمایاں کر چکا ہے۔ یہ ہمارے درد کی دوا نہیں۔ اس کی بنیاد شور و شر اور فتنہ و فساد پر ہے، اس میں خودغرضی اور مفاد پرستی ہے، اس میں ایک کماتا ہے سو کھاتے ہیں، اس میں محنت کرنے والے کو محنت کا پھل نہیں ملتا، کام کرنے والے کو اس کا پورا صلہ نہیں ملتا، نہ کاوش دماغ کوئی نسبت رکھتا ہے نہ دست و قلم کی محنت کا کوئی مقام ہے۔ جو کچھ ہے' بس استحصال زر اور استحصال بالجبر ہی سے عبارت ہے۔ لہٰذا اقبال مرغدین پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک نئی دُنیا دیکھتے ہیں اور یہ دُنیا بالکل وہی ہے جو اسلامی نظام کے ماتحت ہو سکتی ہے' بلکہ ہے ہی اسلامی' اس کی خوبیاں اور اچھائیاں مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہماری دُنیا میں بھی مرغدین کا نظام' جو درحقیقت نظام اسلامی ہے رائج ہو جائے۔

آیئے اب اقبال کے ساتھ' تھوڑی دیر مرغدین کی زیارت ہم بھی کرلیں۔

مرغدین و آں عمارات بلند
من چہ گویم زاں مقام ارجمند (جاویدنامہ:۱۰۶)

میں مرغدین جیسے مقام بلند کی توصیف کیا کروں' صرف وہاں عمارتوں کی بلندی اور شان و شکوہ دیکھو تو حیران و ششدر رہ جاؤ۔

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش
خوب روئے و نرم خوئے و سادہ پوش

(جاویدنامہ:۱۰۶)

یہاں کے رہنے والے بڑے نیک طینت اور پاک باطن لوگ ہیں۔ باتیں سنیئے تو شیریں سخن اور ویسے بھی بڑے خوبصورت' نرم خو اور سادہ پوش' نہ فوق البھڑک لباس' نہ غرور و تکبر نہ نمائش اور تصنع۔

ہر کہ خواہد سیم و زر گیرد ز نور
چوں نمک گیریم ما از آب شور (جاویدنامہ:۱۰۶)

یہاں جس کسی کو سونے چاندی کی ضرورت ہوتی ہے وہ سورج کی شعاعوں سے سیم

وزر بنالیتا ہے، جس طرح ہم کھارے پانی سے نمک بنالیتے ہیں۔

خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر
کارہا را کس نمی سنجد بہ زر!

(جاوید نامہ:۱۰۶)

یہاں علم و ہنر کا مقصد "خدمت" ہے مال و زر نہیں۔

کس ز دینار و درم آگاہ نیست
ایں بتاں را در حرم ہا راہ نیست

(جاوید نامہ:۱۰۶)

یہاں روپے اور اشرفی کا چلن نہیں ہے۔ان کے حرم میں سوداگری، کاروبار اور سونے چاندی کے بت نہیں ہیں۔اس لیے کہ جہاں خدمت مقصدِ ہنر ہو نہ کہ جلب منفعت، وہاں ان چیزوں کی کیا ضرورت پیش آ سکتی ہے؟

بر طبیعت دیوِ ماشیں چیرہ نیست
آسماں ہا از دخاں ہا تیرہ نیست!

(جاوید نامہ:۱۰۶)

یہاں بے درد، بے رحم، بے مروت اور انسانیت کش مشین کی حکومت نہیں ہے جس نے انسان کو بے کار اور اس کے ہنر کو پامال کر دیا ہے۔نہ یہاں کا آسمان کارخانہ کے دھوئیں سے تیرہ و تار ہو رہا ہے جہاں، مزدوروں کا خون چوسا جاتا ہے۔

سخت کش دہقاں، چراغش روشن است
از نہابِ دہ خدایاں ایمن است!

(جاوید نامہ:۱۰۶)

یہاں کا کسان بڑا مطمئن ہے، بہت خوش ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ زمیندار کے ڈنڈے اور ظلم شقاوت سے بالکل آزاد ہے۔کیونکہ یہاں کا کسان خود ہی زمین کا مالک ہے۔وہ نہ کسی کا دبیل ہے نہ ماتحت، نہ غلام، نہ کوئی اس سے بیگار لیتا ہے، نہ لگان کے نام پر

اس کا خون چوستا ہے۔ پورے اطمینان اور یک سوئی کے ساتھ اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔

کشت وکاوش بے نزاعِ آبِ جوست
حاصلش بے شرکتِ غیرے از وست!

(جاوید نامہ:۱۰۶)

وہ بوتا ہے، فصل اگاتا ہے اور خود ہی اسے کاٹتا ہے۔ کھیتوں کو سینچنے کے لیے نہر کے پانی پر جھگڑا نہیں ہوتا۔ ہر شخص اتنا ہی پانی لیتا ہے، جتنی اسے ضرورت ہوتی ہے۔ ہر شخص دوسرے کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتا ہے۔ لہٰذا کسی طرح کی تلخی اور بدمزگی سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتی۔ زمیندار کے دستِ تظلم سے محفوظ ہے۔ اپنا کھیت، اپنا اناج، اپنا مال۔

نے غم و زد نے غم کالا

اس سے بڑھ کر عافیت کی زندگی اور کیا ہو سکتی ہے؟

اندریں عالم نہ لشکر نے قشوں
نے کسے روزی خورد از کشت وخوں

(جاوید نامہ:۱۰۶)

یہ شہر عجیب دُنیا ہے، یہاں نہ فوج ہے نہ سپاہ، ضرورت ہی نہیں پیش آتی ان چیزوں کی۔ نہ لوگ آپس میں جھگڑتے ہیں کہ انہیں کشت وخون سے بچانے کے لیے ڈنڈے اور جیل خانے کی ضرورت ہو۔ نہ کوئی ریاست، کسی ریاست کی دشمن ہے کہ باہمی نزاعات کا فیصلہ جنگ وپیکار سے کیا جائے۔ سب مل جل کر رہتے ہیں۔ ہر طرف امن وآسائش کی کارفرمائی ہے۔

نے قلم در مرغدین گیرد فروغ
از فنِ تحریر و تشہیرِ دروغ

(جاوید نامہ:۱۰۶)

اور مرغدین کے شہرِ ارجمند میں ایک بات اور بھی ہے۔۔۔۔ یہاں جھوٹ نہیں بولا جاتا۔ جھوٹا پروپیگنڈا، ایک دوسرے کے خلاف نہیں کیا جاتا۔ نہ "قرطاس ابیض" شائع ہوتا ہے نہ قرطاس اسود۔"

نے بہ بازاراں ز بے کاراں خروش
نہ صدا ہائے گدایاں درد گوش!

(جاوید نامہ:۱۰۶)

سب سے بڑھ کر یہ کہ یہاں بازاروں میں بے کاروں اور بے روزگاروں کے جلوس نہیں نکلتے۔روٹی اور روزی کا مطالبہ نہیں کیا جاتا۔اس لیے کہ جب کوئی بیکار ہی نہیں ہے، بے روزگار ہی نہیں ہے تو مطالبہ کیا کیا جائے؟اور جلوس کیوں نکالا جائے۔

ایک اور بات بھی ہے۔۔۔۔سوسائٹی اتنی آسودہ فارغ البال اور مطمئن ہے کہ یہاں کوئی فقیر بھی نہیں ہے جس کی صدائیں دردگوش ہوتی ہیں۔اس لیے کہ یہاں کا نظام امیر و غریب اور شاہ و گدا کی اپنے اندر گنجائش ہی نہیں رکھتا۔یہاں سب برابر ہیں اور بڑے چین کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

(۸۸)

نوائے شوق

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں!
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں!

☆

حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں!

☆

گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقش بند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں؟

☆

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجُود
گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں!

(بال جبریل:۵)

یہ بال جبریل کا حرف آغاز ہے۔۔۔اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان خوشنما' سبک' سادہ اور دل نشین الفاظ میں' اقبال نے اپنے موقلم سے' اپنے افکار و خیالات کی تصویر بڑی کامیابی اور دل آویزی سے نہیں کھینچ دی ہے؟

(۸۹)

نوائے عاشقانہ

خدا سے:

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تُو مجھے گوہرِ شاہوار کر

(بالِ جبریل:۷)

تری دُنیا جہانِ مُرغ و ماہی
مری دُنیا فغانِ صبح گاہی!
تری دُنیا میں مَیں محکوم و مجبور
مری دُنیا میں تیری پادشاہی!

(بالِ جبریل:۸۶)

اپنے بارے میں:

فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی
بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی!

(بالِ جبریل:۱۱)

مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانہ میں
کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو!

(بالِ جبریل:۱۳)

سوزِ آرزو

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

(بالِ جبریل:۱۴)

میں خود

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

(بالِ جبریل:۱۴)

شکایت ہم صفیر

مرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے!
انھیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ!

(بالِ جبریل:۱۵)

جدید کی جستجو

پرانے ہیں یہ ستارے ، فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیے مجھ کو جو ہو ابھی نوخیز!

(بالِ جبریل:۱۶)

دلِ غمیں

دلِ غمیں کے موافق نہیں ہے موسمِ گل
صدائے مرغِ چمن ہے بہت نشاط انگیز!

(بالِ جبریل:۱۶)

درویش خدامست

درویش خدامست نہ شرقی ہے ، نہ غربی
گھر میرا نہ دلّی، نہ صفاہان ، نہ سمرقند!

(بالِ جبریل:۲۱)

شانِ قلندری

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں، نہ تہذیب کا فرزند!

(بالِ جبریل:۱۶)

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں، بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

(بالِ جبریل:۱۶)

بندۂ مومن:

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں، نہیں دانۂ اسپند!

(بالِ جبریل:۲۱)

پُرسوز و نظر باز و نکوبیں و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند!

(بالِ جبریل:۲۱)

ذوقِ شکر خند

ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند!

(بالِ جبریل:۲۱)

یدِ بیضا:

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی
مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختیِ خارا!

(بالِ جبریل:۲۵)

☆

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا!

(بالِ جبریل:۲۵)

چنگاری

وہ چنگاری خس وخاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا!

(بالِ جبریل:۲۵)

میں

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار وزبوں

(بالِ جبریل:۲۷)

تو اور میں

تو کفِ خاک و بے بصر، میں کفِ خاک وخودنگر!
کشتِ وجود کے لیے آبِ رواں ہے تو کہ مَیں؟

(بالِ جبریل:۲۸)

خارا شگافی

حدیثِ بادۂ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا!

(بالِ جبریل:۳۲)

میں کیا ہوں؟

بجلی ہوں نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری
میرے لیے شایاں خس وخاشاک نہیں ہے!

(بالِ جبریل:۳۴)

داستانِ خویش

اک اضطراب مسلسل عتاب ہو، کہ حضور!
میں خود کہوں تو مری داستاں دراز نہیں

(بال جبریل:۳۹)

میرا مذہب

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

(بال جبریل:۴۰)

کچھ اپنے متعلق

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی!

(بال جبریل:۴۰)

کہیں سرمایۂ محفل تھی میری گرم گفتاری
کہیں سب کو پریشاں کر گئی میری کم آمیزی!

(بال جبریل:۴۰)

جنوں

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک، یا دامنِ یزداں چاک!

(بال جبریل:۴۲)

میرا حلقۂ سخن

میرے حلقۂ سخن میں ابھی زیرِ تربیت ہیں
وہ گدا کہ جانتے ہیں رہ و رسمِ کج کلاہی

(بال جبریل:۴۵)

خودی کی موت

کسے نہیں ہے تمنائے سروری ، لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے!

(بال جبریل:۴۸)

نوائے پریشاں

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ دورونِ میخانہ

(بال جبریل:۵۱)

افسانۂ دل

کلی کو دیکھ، کہ ہے تشنۂ نسیمِ سحر
اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ!

(بال جبریل:۵۱)

دردآشنا

مجھے فطرت نوا پر پے بہ پے مجبور کرتی ہے
ابھی محفل میں ہے شاید کوئی درد آشنا باقی!

(بال جبریل:۵۸)

دردِمجبوری

کبھی حیرت، کبھی مستی، کبھی آہِ سحر گاہی
بدلتا ہے ہزاروں رنگ میرا دردِ مجبوری!

(بال جبریل:۶۰)

نکتہ ہائے خودی

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغِ اصیل!

(بال جبریل:۶۳)

شعلہ نوا

اندھیری شب ہے، جدا اپنے قافلہ سے ہے تُو
ترے لیے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل!

(بالِ جبریل:۶۳)

آئینۂ ادراک

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

(بالِ جبریل:۶۴)

نالۂ بیباک

نہ ستارے میں ہے، نَے گردشِ افلاک میں ہے
میری تقدیر مرے نالۂ بیباک میں ہے!

(بالِ جبریل:۶۵)

بادۂ ناب

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی، نہ خانقاہ میں ہے!

(بالِ جبریل:۶۹)

رموزِ قلندری

کیے ہیں فاش، رموزِ قلندری میں نے
کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ سے ہو آزاد!

(بالِ جبریل:۷۰)

اقبال کے خلاف فرشتوں کی غمازی

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اِس نے
آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی! (بالِ جبریل:۷۱)

صلۂ نوا

تیرے نفس سے ہوئی آتشِ گُل تیز تر
مُرغِ چمن! ہے یہی تیری نوا کا صِلہ!

(بالِ جبریل:۷۲)

عارف و عامی پر میرا اثر

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی!
دیا ہے میں نے انہیں ذوقِ آتش آشامی!

(بالِ جبریل:۷۳)

جامہ احرام

حرم کے پاس کوئی اعجمی ہے زمزمہ سنج
کہ تار تار ہوئے جامہ ہائے احرامی!

(بالِ جبریل:۷۳)

دُرِناب

میں نے پایا ہے اسے اشکِ سحر گاہی میں!
جس دُرِ ناب سے خالی ہے صدف کی آغوش!

(بالِ جبریل:۷۵)

فکرِ بلند

صفتِ برق چمکتا ہے مرا فکرِ بلند
کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمتِ شب میں راہی!

(بالِ جبریل:۷۶)

فقیہانِ شہر

یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لیے
کہ یک زباں ہے فقیہانِ شہر میرے خلاف! (بالِ جبریل:۷۸)

نے نوازی

کوئی دیکھے تو میری نے نوازی
نفس ہندی ' مقامِ نغمہ تازی!
نگہ آلودہ اندازِ افرنگ!
طبیعت غزنوی ' قسمت ایازی!

(بال جبریل:۸۲)

افکار

پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

(بال جبریل:۱۰۰)

عتابِ ملوک

اسی خطا پہ عتابِ ملوک ہے مجھ پر
کہ جانتا ہوں مآلِ سکندری کیا ہے!

(بال جبریل:۴۸)

انقلاب

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب!

(بال جبریل:۱۰۰)

احتسابِ عمل

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب!

(بال جبریل:۱۰۱)

نقش ناتمام

نقش ہیں سب ناتمام، خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر!

(بالِ جبریل:۱۰۱)

میری سرگزشت

مَیں، کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!

(بالِ جبریل:۱۱۳)

نشوونمائے آرزو

بادِ صبا کی موج سے نشوونمائے خار و خس!
میرے نفس کی موج سے نشوونمائے آرزو!

(بالِ جبریل:۱۱۳)

☆

میرا عشق، میری نظر
(خدا سے خطاب)

ترے آسمانوں کی تاروں کی خیر!
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر!

(بال جبریل:۱۲۴)

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق، میری نظر بخش دے

(بال جبریل:۱۲۴)

مری ناؤ گرداب سے پار کر
یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر!

(بال جبریل:۱۲۵)

بے خوابیاں، بے تابیاں
(خدا سے التجا)

بتا مجھ کو اسرارِ مرگ وحیات
کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات!

(بال جبریل:۱۲۵)

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں!

(بال جبریل:۱۲۵)

مرے نالۂ نیم شب کا نیاز!
مری خلوت و انجمن کا گداز!

(بال جبریل:۱۲۵)

امنگیں مری، آرزوئیں مری
امیدیں مری، جستجوئیں مری!

(بال جبریل:۱۲۵)

مری فطرت آئینۂ روزگار
غزالانِ افکار کا مرغزار

(بال جبریل:۱۲۵)

مرا دل، مری رزم گاہِ حیات!
گمانوں کے لشکر، یقین کا ثبات!

(بال جبریل:۱۲۵)

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اِسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!

(بال جبریل:۱۲۵)

مرے قافلے میں لٹادے اسے!
لٹا دے! ٹھکانے لگا دے اسے! (بال جبریل:۱۲۵)

غریبی میں نام پیدا کر (جاوید کے نام)

مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے!
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر!

(بال جبریل:۱۲۷)

خانقاہ

رمز و ایما اس زمانے کے لیے موزوں نہیں
اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن (بال جبریل:۱۶۱)

"قم باذن اللہ" کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن!
(بالِ جبریل:۱۶۱)

جوشِ جنوں

اقبال نے کل اہلِ خیاباں کو سنایا
یہ شعرِ نشاط آور و پرسوز و طرب ناک
میں صورتِ گُل دستِ صبا کا نہیں محتاج
کرتا ہے مرا جوشِ جنوں میری قبا چاک
(بالِ جبریل:۹۰)

میری فطرت

فطرت مری مانندِ نسیمِ سحری ہے
رفتار ہے میری کبھی آہستہ کبھی تیز
(بالِ جبریل:۱۷۰)
پہناتا ہوں اطلس کی قبا لالہ و گُل کو
کرتا ہوں سرِ خار کو سوزن کی طرح تیز
(بالِ جبریل:۱۷۰)

میری آرزو

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے
(بالِ جبریل:۸۶)

واردات نو بہ نو

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لیے مئے حیات
کہنہ ہے بزمِ کائنات، تازہ ہیں میرے واردات (بالِ جبریل:۱۱۲)

تلخ نوائی (مسلمانوں سے خطاب)

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی
(بالِ جبریل:۲۶)

مشعلِ راہ

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں میں ہے صاحبِ ادراک
جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی
میرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک!
(بالِ جبریل:۶۷)

دانشِ حاضر

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل!
(بالِ جبریل:۶۳)

سیلِ معانی

خلوت کی گھڑی گزری، جلوت کی گھڑی آئی
چھٹنے کو ہے بجلی سے آغوشِ سحاب آخر!
تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر!
(بالِ جبریل:۵۲)

(۹۰)

شعلہ بے باک

عطا ہوا خس وخاشاکِ ایشیا مجھ کو
کہ میرے شعلہ میں ہے سرکشی و بیباکی!

(ضربِ کلیم:۱۲)

عہد حاضر کے خلاف میں نے جنگ کیا ہے۔ یہ عہد خدافراموشی کا ہے، نفس پرستی کا ہے، باطل نوازی کا ہے۔ اس نے اقدار حیات بدل دی ہیں' خوب کو زشت کر دیا ہے، زشت کو خوب بنادیا ہے' گناہ اس کے نزدیک ثواب ہے اور ثواب اس کی نگاہ میں معصیت' حیا کو یہ بے حیائی سمجھتا ہے اور بے حیائی کا نام اس نے عشوہ وادا رکھا ہے۔ عورتوں کو کلب کی زندگی بھا گئی ہے۔ وہ مادریت سے محرومی کو اپنی زندگی کا شعار بنا چکی ہیں' مردوں کو شب گردی پسند آ گئی ہے۔ وہ گھر چھوڑ کر' شبستان عیش میں رات کی گھڑیاں گزارتے ہیں' جو مجاہد تھے' اب گوشہ نشین بن چکے ہیں جو غازی تھے' انھوں نے تلوار میان میں رکھ لی ہے۔

قدرت نے مجھے قلم دیا ہے کہ میں اس کثافت کو لطافت سے بدل دوں اور یہ کثافت دور نہیں ہو سکتی جب تک اسے بھٹی میں تپایا نہ جائے، آگ میں جلایا نہ جائے، لہٰذا قدرت نے مجھے خس وخاشاک ایشیا مرحمت فرمایا ہے' جس میں ذرا سی چنگاری آگ قبول کرنے کی' شعلہ بننے کی' اور سب کچھ پھونک دینے کی صلاحیت ہے اور میرے پاس چنگاری نہیں' شعلہ ہے اور وہ شعلہ بھی کیسا؟ سرکش اور بے باک' جس میں یہ طاقت ہے کہ

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے

(بانگِ درا:۲۶۰)

فروغِ جاوداں ممکن نہیں جب تک' میرا شعلۂ بے باک وسرکش' ہر طرح کی کثافت کو جلا کر خاک نہ کر دے۔

متاعِ دیدۂ تر

کلبۂ افلاس میں' دولت کے کاشانے میں موت!!
دشت و در میں' شہر میں، گلشن میں ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں
بے محالِ شکوہ ہے، نے طاقتِ گفتار ہے
زندگانی کیا ہے، اک طوقِ گلو افشار ہے!
قافلے میں غیرِ فریادِ درا کچھ بھی نہیں
اک متاعِ دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں!

(بانگِ درا:۲۳۰)

(۹۱)

پیام

حقائقِ حیات

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

(ضرب کلیم:۱۰)

حقائق حیات سے فرار نہ اختیار کر، ان کا مقابلہ کر حب تک یہ صلاحیت تجھ میں پیدا نہیں ہوتی، تیرا جسم ناتواں، حقائق کی سنگینی کا حریف نہیں بن سکتا۔

میدانِ جنگ

یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ!

(ضرب کلیم:۱۰)

یہ وقت کشمکش اور کشاکش کا ہے۔ جہد للحیات اور تنازع للبقا کا ہے، تو آسودگی اور عافیت ڈھونڈتا ہے۔ اگر زند، رہ... مىدان ىں، ورد شمن سے مقابلہ کر۔ میدان جنگ میں بیٹھ کر جو تلو: کی جھنکار کے بجائے، نوائے چنگ سے جی بہلانے کی کوشش کرے گا دُنیا اس پر ہنسے گی اور اس کا انجام موت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

قاضی الحاجات

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میسر تونگری سے نہیں!

(ضربِ کلیم:۲۰)

تونگری سب سے بڑی گدائی ہے۔ فقر، اصل بادشاہت ہے، جب تک تو یہ حقیقت نہ محسوس کر لے مسلمان نہیں بن سکتا۔

قلندر اور سکندر

اگر جواں ہوں مری قوم کے جسُور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں!

(ضربِ کلیم:۲۰)

میری قوم کے نوجوانو! اگر جسور و غیور ہوں، ان میں ہمت اور حوصلہ ہو، وہ اپنے ماضی سے واقف ہوں اور اپنے مستقبل کو ماضی سے مربوط رکھنا چاہتے ہوں تو میری قلندری سے سبق لیں، جو نہ صرف یہ کہ سکندری سے کم نہیں بلکہ اس سے بڑھی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ سکندر نے شہر فتح کیے تھے، جسموں پر حکومت کی تھی۔ میں نے دل فتح کیے ہیں، روح پر حکومت کرتا ہوں۔

شبنم اور نسیم

چمن میں تربیت غنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریکِ نسیم

(ضربِ کلیم:۲۶)

صرف مادہ ہی سب کچھ نہیں ہے، قدرت کی کارفرمائیاں ہی سب کچھ ہیں۔ مادہ اگر روح سے بے نیاز ہو تو وہ جامد ہے۔ تخلیق میں اگر لطف بھی شامل نہ ہو تو وہ پیکر ہستی اختیار ہی نہیں کر سکتی۔ کیا ہم نہیں دیکھتے کہ یہ غنچہ جو چمن میں بالیدگی نظر کا سامان بنا ہوا ہے، اپنی تشکیل و تخلیق میں، جس طرح نسیم بہاری کا ممنون ہے، اسی طرح قطرۂ شبنم سے بھی اس کی آبرو ہے۔

وہ علم، کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم!

(ضرب کلیم:۲۶)

علم کے لیے نظر اور خرد لازم و ملزوم ہیں۔ مشاہدات کلیم کے ساتھ تجلیاتِ کلیم بھی ضروری ہیں۔

چاک مت کر جیب بے ایام گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

علم وہ ہے' جس میں تمہارے مشاہدات وتجارب' علم الٰہی سے ہم آہنگ ہوں۔

فقرِ غیور

اب ترا دور بھی آنے کو ہے اے فقرِ غیور
کھا گئی رُوحِ، فرنگی کو ہوائے زر و سیم!

(ضرب کلیم:۳۰)

اے مسلمان!

تیری پستی اور انحطاط کا دور رخصت ہوا' دُنیا نے دانش افرنگ کی جگمگاہٹ دیکھ کر دین الٰہی ترک کر دیا تھا اور دین مادی اختیار کر لیا تھا' لیکن چونکہ اس کی بنیاد' سونے چاندی کی ہوس پر تھی جوع الارض اور جوع البقر پر تھی اس لیے یہ قائم نہ رہ سکی۔ اس کا چہرہ زشت' چشم حقیقت بین نے دیکھ لیا۔ یہ دور اب رخصت ہو رہا ہے اور تیسرا دور شروع ہونے کو ہے۔

مرضِ کہن کا چارہ

دلِ مردہ دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ
ترا بحر پرسکوں ہے، یہ سکوں ہے یا فسوں ہے؟
نہ نہنگ ہے، نہ طوفاں نہ خرابیٔ کنارہ (ضرب کلیم:۳۶)

دل اگر مردہ ہو جائے تو دل نہیں رہتا۔ صرف مضغۂ گوشت رہ جاتا ہے۔ اسے زندہ کر۔ اس پر موت کبھی طاری نہیں ہوتی' ہاں غفلت طاری ہو سکتی ہے۔ اسے جھنجھوڑ۔۔ یہ غفلت ابھی دور ہو جائے گی۔

امتوں اور ملتوں کے امراض کا بھی ایک دیرینہ اور کامیاب نسخہ ہے۔ اس پر عمل کر کے وہ حیاتِ نو سے آشنا ہو سکتی ہیں اور اسے نظر انداز کر کے صرف موت ہی کو دعوت دی سکتی ہیں۔ بقول شاعر

مجھے یہ ڈر ہے کہ دل زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

اور ہاں' تیری زندگی کے سمندر میں فلک فرسا موجیں کیوں نہیں اٹھتیں؟ اس میں سکوت و سکون کیوں ہے؟ سکون' موت ہے۔ حرکت' زندگی ہے۔ یہ تجھ پر جو سکوت چھایا ہوا ہے یہ موت کا پیغامبر ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ' نہ طوفان سے تو الجھتا ہے' نہ نہنگوں کو ٹوکتا ہے۔ نہ خرابیِ کنارہ تیری ہمت میں استحکام پیدا کرتی ہے۔۔۔ یہ اندازِ زندگی بدل ڈال۔

کشمکشِ حیات

گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست!

(ضرب کلیم: ۳۹)

مرد کا کام کشمکش میں حصہ لینا ہے۔ آرام اور عافیت اختیار کر کے گوشہ نشین ہو جانا نہیں ہے بڑے سے بڑا خطرہ' بڑی سے بڑی مشکل' بڑی سے بڑی مصیبت کوئی چیز بھی اسے ہراساں نہیں کر سکتی، اس کے عزم و عمل پر اثر انداز نہیں ہو سکتی، اس کی استقامت میں تزلزل نہیں پیدا کر سکتی، اس کے ثبات و تہور میں کمزوری کا شائبہ بھی نہیں آ سکتی۔ تو اگر مرد ہے تو کشمکشِ زندگی سے راہِ فرار نہ اختیار کر۔ میدان میں آ۔ اور اس [illegible] مردانہ وار حصہ لے' جو لوگ اس کشمکش سے بھاگتے ہیں انہیں شکست قبول کرنا پڑتی ہے اور کارگاہِ حیات میں جو مرد شکست قبول کر لے اس نے گویا اپنے محضرِ قتل پر دستخط [illegible]

لیکن اس کا شمار زندوں میں نہیں ہو سکتا۔

فقر و راہبی

کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی
تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی

(ضرب کلیم:۵۰)

ایسا معلوم ہوتا ہے' تیرا اسلام' اصلی اسلام سے کچھ مختلف ہے۔اسلام کا فقر تسخیر کائنات کی دعوت دیتا۔ ،اور رہبانیت' ترک دُنیا کی تعلیم دیتی ہے اور تو نے اپنی عقلمندی سے اسلام کے فقر اور دوسروں کی رہبانیت کو ایک ہی سمجھ لیا ہے۔یہ تو بیماری ہے۔

وہی دیرینہ بیماری!وہی نامحکمی دل کی!

لیکن اس کی دارو بھی موجود ہے۔

علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!

(بال جبریل:۱۱)

سکون و طوفان

سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

(ضرب کلیم:۵۰)

راہب پہاڑ کی کھوہ میں' جنگل بیابان میں' پہاڑ کی چوٹی پر' گم صم' اکیلا اور تنہا بیٹھ جاتا ہے اور اس کو اپنی معراج سمجھتا ہے۔لیکن اسلام کا فقر مسلمان کو سکھاتا ہے متلاطم اور پرشور موجوں سے جنگ' طوفانوں سے ٹکر' وہ ہار نہیں مانتا۔کارزارِ حیات میں ڈٹا رہتا ہے لہٰذا اس کا سفینہ ہمیشہ طوفانوں سے الجھتا رہتا ہے۔وہ کبھی راہب کی طرح آشنائے سکون نہیں ہوتا۔تو بھی مسلمان ہے۔لہٰذا وہی فقر اختیار کر جو تجھ میں شوکت و سطوت پیدا کرے جو تجھ میں طوفانوں اور یلغاروں کا مقابلہ کرنے کی ہمت دے' ترکِ دُنیا تو برا ہی ہے شکست کا قبول کر لینا ہے۔ناکامی کا اعتراف کر لینا ہے۔

بلا تبصرہ

خودی کو جس نے فلک سے بلند تر دیکھا
وہی ہے مملکتِ صبح وشام سے آگاہ
وہی نگاہ ہے ناخوب و خوب سے محرم
وہی ہے دل کے حلال وحرام سے آگاہ

(ضربِ کلیم:۷۰)

کارسازی

ترے دست ودر میں مجھ کو وہ جنوں نظر نہ آیا
کہ سکھا سکے خرد کو رہ و رسمِ کارسازی!

(ضربِ کلیم:۷۴)

درویش کی بات

ہے مریدوں کو تو حق بات گوارا لیکن
شیخ و مُلا کو بری لگتی ہے درویش کی بات

(ضربِ کلیم:۷۷)

قوم کے ہاتھ سے جاتا ہے متاعِ کردار
بحث میں آتا ہے جب فلسفہ ذات وصفات!

(ضربِ کلیم:۷۷)

ربط ونظام

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط ونظام!

(ضربِ کلیم:۸۱)

تعلیمِ جدید

اُس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش!

فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش
(ضربِ کلیم:۸۳)

مدرسہ

مدرسہ نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش!
(ضربِ کلیم:۸۳)

ادب و دیں

ہوئی ہے زیرِ فلک اُمتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ!
(ضربِ کلیم:۱۰۰)

ضمیرِ وجود

جبینِ بندۂ حق میں نمود ہے جس کی
اُسی جلال سے لبریز ہے ضمیرِ وجود!
(ضربِ کلیم:۱۱۰)

ساحل کی سوغات

دریا میں موتی اے موجِ بے باک!
ساحل کی سوغات؟ خار و خس و خاک
(ضربِ کلیم:۱۱۳)

تاثیرِ افلاک

تیرا زمانہ تاثیر تیری!
ناداں! نہیں یہ تاثیرِ افلاک!
(ضربِ کلیم:۱۱۳)

مقامات وجود

اے کہ ہے زیرِ فلک مثلِ شرر تیری نمود
کون سمجھائے تجھے، کیا ہیں مقاماتِ وجود

(ضرب کلیم:۱۱۴)

تعمیرِ خودی

گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری ونائے وسرود!

(ضرب کلیم:۱۱۴)

صاحبِ دل

کیا بات ہے کہ صاحبِ دل کی نگاہ میں
جچتی نہیں ہے سلطنتِ روم وشام ورے؟

(ضرب کلیم:۱۱۵)

تختِ جم وکے

ایسی کوئی دُنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم وکے

(ضرب کلیم:۱۲۷)

نغمہ

وہ نغمہ سردیٔ خونِ غزل سرا کی دلیل
کہ جس کو سُن کے ترا چہرہ تاب ناک نہیں

(ضرب کلیم:۱۳۱)

فیضِ مکاتب

جسور و زیرک و پُردَم ہے بچہ بدوی
نہیں ہے فیضِ مکاتب کا چشمہ جاری(ضرب کلیم:۱۵۲)

متعدد مواقع پر اقبال بتا چکے ہیں کہ عہد حاضر کے یہ مدرسے اور دانش گاہیں' ایک بیکار سے مقام ہیں جن سے فائدہ کچھ نہیں پہنچتا' نقصان غیر معمولی پہنچ جاتا ہے۔ان مدرسوں میں نہ آزادی افکار ہے نہ شوخیٔ افکار' نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ' لیکن جو لوگ ان "مدرسوں" کی لعنت سے محفوظ ہیں ان کا کردار بے داغ ہے۔ان کی سیرت بے لوث ہے۔ان کی شخصیت پرسوز وطربناک ہے۔حجاز میں ابھی تک تہذیب فرنگ نہیں پہنچی ہے' اور وہاں کے بارے میں:

نظر ورانِ فرنگی کا ہے یہی فتویٰ
وہ سرزمیں مدنیت سے ہے ابھی عاری!

(ضربِ کلیم:۱۵۲)

بے شک وہ سرزمین مدنیت سے عاری ہے لیکن وہاں کے بدوی بچے کا مقابل ہے کوئی جو جسور وغیور و پردم ہونے کا دعویٰ کر سکے۔

مسجد اور مندر

یہ آیۂ نوجیل سے نازل ہوئی مجھ پر
گیتا میں ہے قرآن تو قرآن میں گیتا
کیا خوب ہوئی آشتی شیخ و برہمن
اس جنگ میں آخر نہ یہ ہارا نہ وہ جیتا
مندر سے تو بیزار تھا پہلے ہی سے "بدری"
مسجد سے نکلتا نہیں، ضدّی ہے "مسیتا"

(بانگِ درا:۲۸۹)

(۹۲)

تزکِ اقبال

میرا گناہ

ترا گناہ ہے اقبال مجلس آرائی
اگرچہ تو ہے مثالِ زمانہ کم پیوند!

(ضربِ کلیم: ۱۲)

میرا گناہ یہ ہے کہ میں نے اپنا ایک حلقۂ سخن بنالیا ہے اور اس میں بیٹھ کر عہد حاضر کی فریب کاریوں اور طلسم بندیوں کے خلاف اعلانِ جہاد کرتا رہتا ہوں اور کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو میری بات سنتے ہیں، اس پر کان دھرتے ہیں اور صف بستہ ہونے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

جذبۂ بلند

جو کو کنار کے خوگر تھے ان غریبوں کو
تری نوا نے دیا ذوقِ جذبہ ہائے بلند!

(ضربِ کلیم: ۱۲)

جو افین کی پینک میں پڑے اونگھتے رہتے تھے اور پورے طور پر حقائق حیات سے راہ فرار اختیار کر چکے تھے۔ انھیں میں نے وہ ذوق بلند بخشا کہ وہ رفعت میں ثریا کے ہم دوش ہو گئے۔

نتیجۂ نوا:

تڑپ رہے ہیں فضا ہائے نیلگوں کے لیے
وہ پر شکستہ کہ صحنِ سرا میں تھے خور سند!

(ضربِ کلیم:۱۲)

یہ میری نوا کا نتیجہ ہے کہ غلاموں میں جذبہ حریت پیدا ہوگیا' جو غلامی پر قناعت اختیار کر چکے تھے۔ جنھوں نے خواری اور ذلت کی زندگی اختیار کرلی تھی' جو اپنی شکستہ پری پر خورسند اور مسرور تھے۔ وہ فضائے نیلگوں میں اڑنے کے لیے بے تاب ہوگئے۔ ان میں شوقِ پرواز پیدا ہوگیا۔

قلندری اور تونگری

اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے' تونگری سے نہیں!

(ضربِ کلیم:۲۰)

اگر دُنیا میں میرا جوہر آشکار ہوا ہے' لوگ مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں' میری قدر و منزلت کرتے ہیں' میری عظمت اور بڑائی کے قائل ہیں تو کیوں؟ کیا اس لیے کہ میں تونگر ہوں؟ یہ بات تو نہیں' میرے پاس کچھ نہیں' قلندرانہ زندگی بسر کرتا ہوں۔ لیکن ہاں ایک بات ضرور ہے۔ زر و دولت پر للچائی ہوئی نظر نہیں ڈالتا' ایمان اور ضمیر کا سودا نہیں کرتا۔ یہی قلندری ہے اور اسی نے مجھے سربلند کیا ہے۔ یہی میرا جوہر ہے اور اسی پر مجھے ناز ہے۔

ولولۂ تازہ

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند!
تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں
مرغانِ سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند!

(ضربِ کلیم:۲۳)

ان مردہ دلوں کو میں نے زندگی اور زندگی کی حرارت سے معمور کر دیا ہے۔ یہ سو رہے تھے، میں نے انہیں بیدار کر دیا۔ ان پر موت طاری ہو رہی تھی۔ میں نے انہیں حیات نو سے آشنا کیا۔ کسی ایک مقام پر نہیں، ہر جگہ، ہر اس جگہ جہاں مسلمان موجود تھے، خواہ وہ عرب ہو یا عجم۔

میرے کلام کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ خزاں کے عالم میں بھی مرغان سحر خواں، میری صحبت میں آ کر، خوش و خرم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ میں انھیں بہار کی طراوت، شگفتگی اور تازگی ورعنائی عطا کرتا ہوں۔

غلامی:

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند!

(ضرب کلیم:۲۳)

لیکن میرے رب! تو نے مجھے وطن وہ دیا ہے، جہاں کے لوگ میرے پیام کی قدر نہیں کرتے۔ میں تیری طرف بلاتا ہوں۔ وہ اصنام خیالی سے رجوع کرتے ہیں۔ میں حق کی دعوت دیتا ہوں وہ باطل سے سمجھوتے کرتے ہیں۔ میں آزادی کی نوید سناتا ہوں، وہ غلامی پر فخر کرتے ہیں۔

موج نسیم:

عشق و مستی نے کیا ضبطِ نفس مجھ پر حرام
کہ گرہ غنچے کی کھلتی نہیں بے موجِ نسیم!

(ضرب کلیم:۳۰)

جب تک میں، حقیقت سے ناواقف تھا، چپ تھا، خاموش تھا، لیکن جب سے رمز آشنائے حق و حقیقت ہوا ہوں۔ ضبط سخن میرے لیے ناممکن ہو گیا ہے۔ جس طرح غنچہ موج نسیم سے لذت آشنا ہونے کے بعد غنچہ نہیں رہ سکتا کھلتا ہے اور پھول بن جاتا ہے۔ اسی طرح عشق و مستی نے مجھے تکلم، اور خروش عطا کیا ہے۔ اب میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ اگر اب بھی خاموش

رہوں تو یہ فطرت کے خلاف ایک طرح کا اعلان جنگ ہوگا۔نوامیں فطرت سے بغاوت ہوگی اور جولوگ اس میں فطرت سے بغاوت کرتے ہیں وہ کامیاب وکامران نہیں ہو سکتے۔ان کے واسطے ہلاکت ہے۔تباہی ہے' بربادی اور رسوائی ہے۔

فروغِ صبح:

عجب نہیں کہ پریشاں ہے گفتگو میری
فروغِ صبح پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں!

(ضرب کلیم:۳۵)

میرے اندازِ تکلم کو اگر تو پریشان دیکھتا ہے تو اس پر حیرت کیوں؟۔۔۔۔فروغ صبح کو دیکھ' اگر یہ پریشان نہ ہو تو کیا رہ جائے۔

شوخیٔ نظارہ:

تیرے نیستان میں ڈالا مرے نغمۂ سحر نے
مری خاک پَے سپر میں جو نہاں تھا اک شرارہ!
نظر آئے گا اسی کو یہ جہانِ دوش و فردا
جسے آ گئی میسّر مری شوخیٔ نظارہ!

(ضرب کلیم:۳۶)

میرا احسان مان۔۔۔۔جو شرارہ میری زندگی کا حاصل تھا۔اسے میں نے تیرے نیستان میں ڈال دیا ہے۔اب یہ چنگاری بھڑکتی ہوئی آگ بن جائے گی۔اور تو خاشاک غیراللہ کو جلا کر خاکستر کر سکے گا۔

اگر تو چاہتا ہے کہ اس جہان رنگ وبو اور عالم دوش وفردا کے اسرار ورموز سے واقف ہو' تو اس کی ایک ہی صورت ہے' یہ کہ میری شوخیٔ نظارہ حاصل کر' وہ آنکھ پیدا کر جو تجھ میں بصارت کے ساتھ بصیرت بھی پیدا کردے۔جو تیری فکر ونظر میں وسعت پیدا کردے۔تب ہی تو واقف اسرار ورموز ہو سکتا ہے اور دُنیا کی صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔اور یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں' تو مسلمان ہے اور مسلمان کے معنی' تاریخ ماضی کے اوراق میں یہ لکھے ہیں کہ وہ سب کچھ کر سکتا

ہے وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا' اس کا عزم اس کا عمل جہاں کشا ہے' جہاں گیر ہے۔

بلا تبصرہ

مرقد کا شبستان بھی اسے راس نہ آیا
آرام قلندر کو تہِ خاک نہیں ہے
خاموشی افلاک تو ہے قبر میں لیکن
بے قیدی و پہنائی افلاک نہیں ہے

(ضرب کلیم:۴۰)

میری پونجی

تیری متاعِ حیات علم و ہنر کا سرور
میری متاعِ حیات، ایک دلِ ناصبور!

(ضرب کلیم:۵۱)

ایک زمانہ سے ہے چاک گریباں مرا
تو ہے ابھی ہوش میں! میرے جنوں کا قصور!

(ضرب کلیم:۵۲)

تکفیر

نہ میں اعجمی، نہ ہندی' نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی!
تو مری نظر میں کافر' میں تری نظر میں کافر
ترا دیں نفس شماری ' مرا دیں نفس گدازی!

(ضرب کلیم:۷۳)

علم خودی

اقبال یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لیے ایسے مقالات (ضرب کلیم:۷۷)

ہم عنان

ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے
عجب نہیں ہے کہ ہوں میرے ہم عنان پیدا!
(ضرب کلیم:۱۰۱)

اپنے شعر سے

ہے گلہ مجھ کو تری لذتِ پیدائی کا
تو ہوا فاش تو ہیں اب مرے اسرار بھی فاش!
شعلہ سے ٹوٹ کے مثلِ شرر آوارہ نہ رہ
کر کسی سینۂ پرسوز میں خلوت کی تلاش!
(ضرب کلیم:۱۰۲)

ذکر و فکر، جذب و سرود

مقابلہ تو زمانے کا خوب کرتا ہوں
اگرچہ میں نہ سپاہی ہوں ، نے امیرِ جنود!
مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور
عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرود!
(ضرب کلیم:۱۱۰)

جوہر

میرے شرر میں بجلی کے جوہر
لیکن نیستاں تیرا ہے نمناک!
(ضرب کلیم:۱۱۳)

مردِ قلندر

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی
مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آش!

حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر
اک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش!

(ضربِ کلیم:۱۱۸)

زورِ حیدری

مرے لیے ہے فقط زورِ حیدری کافی
ترے نصیب فلاطوں کی تیزیِ ادراک
مری نظر میں یہی ہے جمالِ زیبائی
کہ سر بہ سجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک!

(ضربِ کلیم:۱۲۳)

شعلۂ سرکش

مجھے سزا کے لیے بھی نہیں قبول وہ آگ
کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک!

(ضربِ کلیم:۱۲۳)

سرودِ حرام

نہ میرے ذکر میں ہے صوفیوں کا سوز و سرور
نہ میرا فکر ہے پیمانۂ ثواب و عذاب
اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب!

(ضربِ کلیم:۱۲۶)

مرحلۂ شوق

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے!

(ضربِ کلیم:۱۲۷)

حسرت

پھرا میں مشرق و مغرب کے لالہ زاروں میں
کسی چمن میں گریبانِ لالہ چاک نہیں!

(ضرب کلیم:۱۳۲)

میں نے ساری دُنیا چھان ڈالی' مغرب میں بھی گھوما۔ مشرق کی بھی سیر کی' روحانیت کے علمبرداروں کو دیکھا۔ مادہ کے پرستاروں کی بھی زیارت کی۔ لیکن کہیں بھی عشق کی چنگاری سلگتی ہوئی نہیں دکھائی دی۔ صحن چمن میں گلِ لالہ موجود ہے۔ اس میں داغ بھی ہے' لیکن یہ داغ صرف داغ ہے۔ شعلہ نہیں' چنگاری بھی نہیں' اور زندگی عبارت ہے صرف شعلہ سرکش ہے۔

دارورسن

مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن
زمانہ دارو رسن کی تلاش میں ہے ابھی!

(ضرب کلیم:۱۴۲)

میری خودی کو اگر "سزا" دینا چاہتے ہوتو' کم از کم یہ تو کرکہ دارورسن کا بندوبست کرو۔

عمریست کہ آوازہ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دارو رسن را
بتاؤ یہ چیز بھی ہے تمہارے پاس؟

عناصر حیات

حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسمِ افلاطوں!
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں!

(ضرب کلیم:۴۹)

زندگی ایک ٹھوس اور سنگین حقیقت ہے۔ یہ کوئی نظریہ یا تصور نہیں ہے، جسے ہم جب چاہیں ٹھکرا دیں اور بدل ڈالیں۔ اس کی بنیاد ایسے حقائق پر قائم ہے جن میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، جو اٹل ہیں۔ جنھیں خدا کے سوا کوئی نہیں بدل سکتا۔ یہ افلاطوں کا کوئی مقالہ نہیں ہے۔ جس کے الفاظ کی داد لے لو، جس کے مفہوم پر سر دھن لو۔ یہ حقیقت ہے۔ اس سے تم ٹکرا نہیں سکتے۔ بچ نہیں سکتے، گریز نہیں اختیار کر سکتے۔ راہ فرار بھی تمہیں ڈھونڈے نہیں مل سکتی۔ لہٰذا اس کے صحیح عناصر سے اسے زینت دو، اور وہ ہیں:

۱۔ روح القدس کا ذوق جمال۔۔۔۔۔۔۔۔روحانیت

۲۔ عجم کا حسن طبیعت۔۔۔۔۔۔۔۔دیدہ وری اور نکتہ سنجی

۳۔ عرب کا سوز دروں۔۔۔۔۔۔۔اخلاص ایمان

حکم اذان:

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں، لا الہ الا اللہ

(ضرب کلیم:۱۴)

میں جانتا ہوں، میری قوم میں ایسے لوگ بہت کافی ہیں جو منافق ہیں، جو دوستی کا دعویٰ کر کے دشمنی کرتے ہیں، جو قوم میں شامل ہیں، لیکن عملاً اور حقیقتاً قوم کے دشمن ہیں۔ یہ قوم کے خلاف مصروف عمل رہتے ہیں اور چاہتے ہیں۔ میں بھی انہیں جیسا بن جاؤں۔ لیکن ان کی حقیقت سے واقف ہوں۔ میں اپنا کام کرتا رہوں گا، خدا کے سوا نہ کسی کے آگے سر جھکاؤں گا نہ کسی در پر حاضری دوں گا۔

سوز قطرۂ اشک

مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں
نہیں جنسِ ثوابِ آخرت کی آرزو مجھ کو
وہ سوداگر ہوں میں نے نفع دیکھا ہے خسارے میں
سکوں ناآشنا رہنا اسے سامانِ ہستی ہے
تڑپ کس دل کی یارب چھپ کے آبیٹھی ہے پارے میں
صدائے لن ترانی سن کے اے اقبال میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے مارے میں

(بانگِ درا:۳۲۸)

(۹۳)

حقائق و معارف

اقبال وہی حقائق و معارف زبان پر لاتے ہیں جنھیں وہ پرکھ چکے ہیں' جو ان کے مشاہدات میں آ چکے ہیں۔ وہ بندہ تخمیس و ظن نہیں ہیں۔ ان کی نگاہ گہری ہے۔ فراست ان کا جوہر ہے۔ بصیرت اُن کا کمال ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ وہ صرف انہی حقائق سے بحث کرتے ہیں جنھیں وہ اپنے دل کے آئینہ میں تابناک اور درخشاں دیکھ لیتے ہیں۔ سنیے:

نوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلود
وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں

(ضرب کلیم: ۱۳۱)

کوئی کام بھی ہو' خواہ وہ نغمہ طرازی ہو یا غزل سرائی' اس میں خلوص ہونا چاہیے۔ اگر خلوص نہیں ہے' ضمیر پاک نہیں ہے تو نغمہ جیسی دل نشین چیز بھی زہر ہے۔

نغمۂ جبریل اور صورِ اسرافیل:

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن
یہ نکتہ ہے تاریخِ امم جس کی ہے تفصیل

(ضرب کلیم۔ ۱۳۲)

میں نہیں جانتا شعر کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی ماہیت کیا ہے؟ اس کی ترکیب کیا ہے؟ اس کا سحر کیا ہے؟ البتہ ایک بات جانتا ہوں اور اس کی صداقت پر تاریخ امم گواہ ہے۔

وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل!

(ضربِ کلیم:۱۳۳)

جس شعر میں حیات ابدی کا نغمہ ہو وہ یا تو نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل نغمۂ جبریل سے حیات آفریں، خلاقِ معانی، رہنمائے طریقت، بانگ سرافیل سے مراد وہ نفخ صور، جس سے مردہ بھی زندہ ہو جائیں گے۔

سلطانیٔ جاوید

غوّاص تو فطرت نے بنایا ہے مجھے بھی
لیکن مجھے اعماقِ سیاست سے ہے پرہیز
فطرت کو گوارا نہیں سلطانیٔ جاوید
ہر چند کہ یہ شعبدہ بازی ہے دل آویز
فرہاد کی خارا شکنی زندہ ہے اب تک
باقی نہیں دُنیا میں ملوکیتِ پرویز

(ضربِ کلیم:۱۴۸)

فطرت نے مجھے نگاہ تیز دی ہے۔ میں دل وجود کو چیر کر دیکھ لیتا ہوں۔ اس میں کیا ہے؟ لیکن یہ سیاست بازی مجھے پسند نہیں آتی۔ اس لیے کہ جانتا ہوں اس میں رکھا ہی کیا ہے؟ کل ہٹلر کا ڈنکا بج رہا تھا لیکن آج اس کا نشان گور بھی نہیں ملتا۔ مسولینی کے نام سے دُنیا کانپتی تھی لیکن اس کو "نیلی پوشوں" نے ہلاک کیا۔ اسٹالن خدا کی طرح اپنی قوم میں پوجا جاتا تھا۔ لیکن آج اس کے جانشین اس کے بنائے ہوئے اور چڑھائے ہوئے لوگ اسے گالیاں دے رہے ہیں۔ اس کے معائب بیان کر رہے ہیں۔ اس کی تصویریں اتاری جا رہی ہیں۔ اس کے مجسمے توڑے جا رہے ہیں۔ اس کا نام کھرچا جا رہا ہے۔ اس کی یادگاریں مٹائی جا رہی ہیں۔ یہ کھیل ہے سیاست کا۔ میرا تو دل اس سے تنگ ہے۔ میں اس میں کسی طرح کی جاذبیت اور کشش محسوس نہیں کرتا۔

اور یہ صرف میرا خیال ہی نہیں ایک سنگین حقیقت ہے' جس کی صداقت پر قدرت کے فیصلے گواہ ہیں۔ قدرت سلطانی جاوید کو پسند نہیں کرتی۔ کتنی بڑی بڑی سلطنتیں اور حکومتیں بنیں اور مٹ گئیں۔ جب ان کا آفتاب اقبال نصف النہار پر تھا۔ دُنیا ان کے سامنے سجدہ ریز تھی اور جب وہ آغوش مرگ میں پہنچیں تو ان پر ماتم کرنے کے لیے کسی کے ہاتھ سینہ تک نہ گئے۔ حرفِ غلط کی طرح انھیں قدرت نے مٹادیا۔ حرفِ غلط کی طرح دُنیا نے انھیں فراموش کردیا۔ لہٰذا میری یہ رائے فطرت کے منشا اور فیصلہ کے عین مطابق ہے۔ اگرچہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ سلطانی جاوید قائم کرلیں' اس لیے تلواریں چمکتی اور توپیں چلتی ہیں۔ لیکن آج تک کوئی اس میں کامیاب نہیں۔ ان کوششوں پر قدرت ہنستی ہے۔ اس لیے کہ یہ "تقدیر" جو بالکل اٹل ہے۔ اس کی بنائی ہوئی ہے کہ سلطانی جاوید ایک غلط اور ناقابلِ عمل تخیل ہے۔ ایسا آج تک نہیں ہوا' اور ایسا قیامت تک نہیں ہوگا۔

ہاں' ایک بات ضرور ہے۔ قدرت سلطانی جاوید کی تو قائل نہیں لیکن نقشِ جاوید کی قائل ہے۔ وہ سلطنتیں اور حکومتیں مٹاتی رہتی ہے۔ بادشاہوں اور سلطانوں کو گور میں سلاتی رہتی ہے۔ یا تو نوبت اور نقاروں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی' یا موت کا سناٹا چھا جاتا ہے۔

گلشن میں کہیں بوئے دم ساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹا' آواز نہیں آتی

لیکن ذاتی' اور شخصی طور پر' انسان اپنی جدوجہد' سعی و کوشش اور طلب و تحریک سے جو نقوش قائم کرتا ہے انہیں نہ صرف یہ کہ قدرت مٹاتی نہیں' بلکہ ان کی حفاظت کرتی ہے۔ انہیں محفوظ رکھتی ہے۔ فرعون مٹ گئے' لیکن اہرام اب تک موجود ہیں۔ جہانگیر کی حکومت اب کہاں ہے' لیکن عدل جہانگیری اب تک زندہ ہے۔ شاہجہان کو موت قید خانہ میں نصیب ہوئی۔ لیکن اس کی متاع ہنر "تاج محل" دُنیا میں اب تک قائم اور باقی ہے۔ اسپین میں کئی سو سال تک مسلمانوں نے حکومت کی' وہ ختم ہوگئی۔ وہ مسلمان بھی ختم ہوگئے۔ ان کا نام ونشان بھی مٹ گیا۔ آج وہاں ان کا کوئی نام لیوا نہیں ہے لیکن مسجد اپنی شان وجلال کے ساتھ آج بھی موجود ہے۔ قصرِ زہرہ کی تابناکی اب بھی قائم ہے۔ قطب الدین ایک ایک غلام تھا۔ تختِ

حکومت پر بیٹھا اور موت کی نیند سو بھی گیا لیکن مسجد قوت الاسلام کا وہ پہلا منارہ جو اس نے خلوص سے تعمیر کیا تھا۔ آج تک کھڑا آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔

یہ تو تھا' مادی یادگاروں کا اور مادی نقوش کا تذکرہ۔ لیکن انھیں بہر حال فنا ہے۔ گو سلطانی جاوید کے مقابلہ میں بہر حال یہ جاوید ہیں۔

لیکن غیر مادی نقوش' یعنی انسان کے کارنامے' وہ تو کبھی نہیں مرتے۔ وہ ہمیشہ قائم اور باقی رہتے ہیں بلکہ عہد ایام کے ساتھ ساتھ' ان کی تابندگی' اور درخشانی بڑھتی ہی جاتی ہے۔

کربلا کا معرکہ قتال' مدت ہوئی ختم ہو گیا۔ لیکن حسین ابن علیؑ کی قربانی بھی کیا قیامت تک ختم ہو سکتی ہے؟

جنگ صلیبی کو ختم ہوئے صدیاں بیت گئیں' لیکن اس لڑائی میں صلاح الدین نے جس بے جگری' جس بے نفسی' جس رواداری' جس وسعتِ قلب کا ایک سچے اور کھرے مسلمان کی حیثیت سے مظاہرہ کیا تھا۔ کیا اسے بھی زوال آیا؟

برطانوی حکومت ۱۸۵۷ء کے ہولناک غدر کے بعد کس دھوم دھام' جاہ وجلال اور کروفر کے ساتھ قائم ہوئی تھی۔ سو سال تک وہ اسی آن و بان کے ساتھ قائم رہی۔ لیکن غدر کے زمانہ میں جن بے نواؤں اور بوریہ نشینوں نے' جب نہتوں اور کم مایہ لوگوں نے استعمار فرنگ کا مقابلہ کیا تھا۔ کیا حکومت برطانیہ کی طرح وہ بھی افسانہ پارینہ بن گئے؟ کیا ان کی یاد بھی دلوں سے مٹ گئی؟ آج ہندوستان میں دور غدر کے فرنگی مجسمے اتارے جا رہے ہیں اور ان بہادروں کے مجسمے ان کی جگہ لے رہے ہیں' جنھوں نے یہ لڑائی لڑی تھی۔ آج بھارت کی حکومت مسلمان مجاہدوں کے نشانات چھپا رہی ہے۔ لیکن جب قدرت کے قانون کے مطابق' اپنے وقت پر اصولِ فطرت کے مطابق یہ حکومت بنے گی تو ان فراموش شدہ لوگوں کو بھی یاد کیا جائے گا۔ ان کی بھی یادگاریں قائم کی جائیں گی۔ بھولنے والے انھیں بھی یاد کریں گے۔ اس لیے کہ خون جگر سے جس کارنامہ کی تعمیر ہوتی ہے وہ کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتا۔ فطرت اس کی خود نگہبانی کرتی ہے۔ دیکھ لو پرویز کی سلطنت کو مٹے ہوئے کئی جگ بیت گئے' لیکن فرہاد کا نام آج بھی عظمت واعزاز کے ساتھ ہر زبان پر ہے۔ نہ اسے کھوجا جا سکتا ہے نہ مٹایا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے اس شعر کی اگر واقعات وحقائق اور تاریخی شواہد کی روشنی میں تفسیر کی جائے تو ایک دفتر بے پایاں تیار ہو سکتا ہے۔ قدم قدم پر اقبال کے اس نظریہ کی تائید ملے گی کہ قدرت سلطانی جاوید کو تو کسی حالت میں نہیں قائم رہنے دیتی۔ لیکن لوگوں کے پُرخلوص نقوش کو بڑی دیر تک، مدت مدید تک محفوظ رکھتی ہے۔ اتنی دیر تک جو سلطانی جاوید کے مقابلہ میں قطعاً غیر فانی ہوتے ہیں اور ان یادگاروں کے سوا جو شخصی اور ذاتی کارنامے ہوتے ہیں وہ تو ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔ ان پر موت کبھی طاری ہو ہی نہیں سکتی وہ آج بھی زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

سوز وساز حیات:

نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوز وساز حیات
خودی کی موت ہے یہ، اور وہ ضمیر کی موت!

(ضرب کلیم:۱۳۷)

ایشیا اور یورپ دونوں پر موت طاری ہے۔ اگرچہ اسباب موت مختلف ہیں۔ ایشیا اس لیے موت سے دوچار ہے کہ وہ خودی سے محروم ہو چکا ہے اور یورپ اس لیے موت کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہے کہ اس کا ضمیر مر چکا ہے۔

تخیل ملکوتی

خوشا وہ قافلہ، جس کے امیر کی ہے متاع
تخیلِ ملکوتی و جذبہ ہائے بلند!

(ضرب کلیم:۱۵۷)

مشرق ومغرب:

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری!
نہ مشرق اس سے بری ہے، نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری (ضرب کلیم:۱۶۰)

مشرق اور مغرب دونوں قلب ونظر کی رنجوری میں گرفتار ہیں۔اگر چہ ہر جگہ کے اسباب وعوامل ایک دوسرے سے جداگانہ اور مختلف ہیں۔ مشرق کے قلب ونظر کا روگ یہ ہے کہ بے چارہ غلام ہے۔ تقلید میں مبتلا ہے۔اور یہ دونوں چیزیں آزادیِ فکر وآزادیِ خیال کی دشمن ہیں۔ پھر اگر وہ رنجوری قلب ونظر میں مبتلا ہو تو حیرت کیوں کیجیے؟ اور مغرب کی بیماری کا سبب یہ ہے کہ وہ آنکھ بند کر کے ''جمہوریت پر اعتقاد رکھتا ہے جس کے بارے میں ایک دوسرے موقع پر اقبال نے کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے جہاں

بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے (ضرب کلیم:۱۴۹)

گلہ تلخی دوراں

جو فقر ہوا تلخی دوراں کا گلہ مند
اس فقر میں باقی ہے ابھی بوئے گدائی

(ضرب کلیم:۱۷۵)

مردفقیر ۱

من نہ مُلّا، نے فقیہِ نکتہ ور
نے مرا از فقر و درویشی خبر
در رہِ دیں تیز بین و سست گام
پختہ من خام و کارم ناتمام
تادلِ پر اضطرابم دادہ اند
یک گرہ از صد گرہ بکشادہ اند
از تب و تابم نصیب خود بگیر
بعد ازیں ناید چو من مرد فقیر

(پس چہ بائد کرد:۲۵)

---

۱ مثنوی مسافر صفحہ ۳۶

میں نہ مُلّا ہوں کہ کٹ حجتی کروں۔ قال اقوال اور قیل وقال کے چکر میں پڑا رہوں۔ نہ فقیہہ ہوں کہ بال کی کھال نکالوں اور ذرا ذرا سی بات پر فتویٰ دینا شروع کردوں اور بے بات کی بات میں پیدا کروں اور اپنی نکتہ دانی، حاضر دماغی اور دقیقہ سنجی کی داد لوں۔ میں اپنی کمزوریوں سے واقف ہوں۔ اپنی خامیوں پر میری نظر ہے۔ دین کے معاملات کو سمجھتا خوب ہوں لیکن عمل میں کچا ہوں۔ میری پختگی ابھی خام ہے اور میرا کام ناتمام ہاں ایک بات ضرور ہے۔ خدا نے مجھے ایک نعمت عطا فرمائی ہے اور وہ ہے دل پر اضطراب کم از کم میرے لیے تو یہ دولت کونین سے بڑھ کر ہے۔ یہ نہ ہوتی تو میرے فکر ونظر کی دُنیا ویران اور سنسان رہتی۔ میری آہ میں اثر نہ ہوتا۔ میرا نالہ نارسا رہتا۔ میں دین کی حقیقت نہ جانتا۔ میں سوز آرزو کی کیفیت سے بے خبر رہتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عشق وجنوں کی کارفرمائی کا سرمایہ بھی مجھے حاصل نہ ہوتا۔

لہٰذا اے مسلمان نوجوان! میری تب وتاب میں تیرا جو حصہ ہے اسے لے لے اور یاد رکھ میرے بعد مجھ جیسا مرد فقیر تجھے نہیں ملے گا۔

(۹۴)

اپنا تعارف

یوں تو اقبال نے اپنے ہر مجموعۂ کلام میں اپنے افکار، اپنے مقاصد اور اپنی شخصیت کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ لیکن مثنوی اسرارِ خودی میں جس جامعیت اور خوبی کے ساتھ اپنا تعارف کرایا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ یہ شاعرانہ تعلّی نہیں بیان واقعہ ہے۔۔۔۔۔۔ چند اشعار آپ بھی سن لیجیے:

راہو شب چوں مہرِ عالم تاب زد
گریۂ من بر رُخِ گُل آب زد
اشکِ من از چشمِ نرگس خواب شست
سبزہ از ہنگامہ ام بیدار رُست
باغباں زورِ کلامم آزمود
مصرعے کارید و شمشیرے درود
در چمن جز دانۂ اشکم نہ کشت
تارِ افغانم بپود باغ رشت
ذرہ ام مہرِ منیر آنِ من است
صد سحر اندر گریبانِ من است
خاکِ من روشن تراز جامِ جم است
محرم از نازِ نو ہاے عالم است

(اسرار و رموز ۶۔۵)

فکرم آں آہوئے سر فتراک بست
کو ہنوز از نیستی بیروں نجست
سبزہ نارُستہ گلشنم
گل بشاخ اندر نہاں در دامنم
محفلے رامش گری برہم زدم
زخمہ بر تارِ رگِ عالم زدم

(اسرار و رموز ۶)

میرے آنسوؤں کی آبیاری سے پھول نے رعنائی پائی۔

میرے گریہ بے اختیار نے چشم نرگس سے نیند چھین لی اور سبزۂ خوابیدہ میری ہنگامہ آرائی سے بیدار ہو گیا۔

باغبان (خدائے کون و مکان) نے میرا زور کلام دیکھ کر اس میں تندی اور سرکشی پیدا کر دی۔

میں نے اپنی ملت کے چمن میں اپنے دانک اشک کے سوا کچھ نہیں بویا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے

باغ کی کلیاں اور شگوفے ملت کے جوان اور بوڑھے میرے اشک سحر گاہی اور فغاں شب کے راز دار اور محرم اسرار بن گئے۔

بے شک میں ایک ذرہ ناچیز ہوں، لیکن اس کے باوجود، یہ مہر منیر، یہ آفتاب عالم تاب میرے حلقہ کا اسیر ہے۔ سینکڑوں صبحیں میرے جیب و دامن میں پرورش پا رہی ہیں۔ میں امید کا پیام لے کر آیا ہوں۔ اور اس پیام امید نے قوم میں ایک نئی زندگی اور ایک نئی امنگ پیدا کر دی ہے۔

ہاں میں خاک ہوں، لیکن میری خاک وہ ہے جو جام جم سے زیادہ روشن اور تابناک ہے اور اس کی بصیرت کا یہ عالم ہے، جو باتیں اس دنیا میں ابھی رونما نہیں ہوئی وہ بھی میرے علم

میں ہیں۔

میری فکر بلند نے اس آہو کو اسیر کر لیا ہے جو ابھی عدم سے وجود میں نہیں آیا ہے۔
وہ سبزہ جو ابھی اُگا نہیں، میرے گلشن تخیل میں لہلہا رہا ہے۔ وہ پھول جو ابھی شاخ کے نشیمن میں پڑا سو رہا ہے۔ میرے دامن میں موجود ہے۔
میں نے محفل رامش گری درہم برہم کر دی ہے۔ یعنی میرا پیام یہ ہے کہ:
وہ بادہ شبینہ کی سر مستیاں کہاں ☆ اٹھیے، بس ان کہ لذّت خواب سحر ہوگئی
میں نے محفل عیش و طرب کی بساط الٹ دی ہے اور دُنیا میں اپنے نے نوازی سے ایک نیا دور پیدا کر دیا ہے۔

ان تمام اشعار کا مطلب یہ ہے کہ، میں فراست مومن سے کام لے کر وہ چیزیں دیکھ رہا ہوں۔ ان حوادث کو محسوس کر رہا ہوں، وہ واقعات میرے علم میں آ رہے ہیں، جو ابھی رونما نہیں ہوئے۔ میں ان سے اپنی قوم کو متنبہ کر رہا ہوں اور اسے آمادۂ عمل کر رہا ہوں، تا کہ وہ خواب غفلت سے جاگ جائے۔ کمربستہ ہو کر میدان میں اترے، اور رزم پیکار حیات میں حصہ لے کر زندہ رہنے کا حق حاصل کر لے، کہ یہی اصل مقصود ہے۔

آگے چل کر، اسی سلسلہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

در جہاں خورشیدِ نو زائیدہ ام
رسم و آئینِ فلک نادیدہ ام

(اسرار و رموز ٦)

میں نے ایک نیا آفتاب پیدا کیا ہے۔ اس کی روشنی ان تاریکیوں کو دور کر دے گی جو صدیوں کی غلامی، تقلید جامد، اور غلط تربیت کے باعث مسلمانوں میں پیدا ہو چکی ہیں۔ میرے کلام کا آفتاب اس تاریکی کو دور کر دے گا، اور حقیقت اس روشنی میں اچھی طرح سے نظر آجائے گی۔

من و تو

انتظارِ صبح خیزاں می کشم
اے خوشا زرتشتیاں آتشم (اسرار و رموز ٦)

مجھے انتظار جو کچھ ہے، وہ اس صبح خیز گروہ کا ہے، جو میری آتش دل کا زرتشی ہوگا، جو میرے دل کی آگ کو زرتشیوں کی طرح پوجے گا اور وہ شعلہ اپنے اندر جذب کر لے گا۔

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم
من نوائے شاعرِ فرداستم

(اسرار ورموز ٦)

میں بجائے خود ایک نغمہ ہوں، ایسا نغمہ جو اضطراب کی چوٹ سے بے پروا ہے۔ جو خود بخود فضا میں پیدا ہوتا اور سننے والوں کے دل میں اتر جاتا ہے۔ میں آج کا شاعر نہیں کل کا شاعر ہوں۔ میں حال نہیں مستقبل ہوں۔ آج لوگ میرے کلام کو، مجھے، میرے پیام کو نہیں سمجھتے۔ لیکن کل وہ وقت آئے گا کہ اسے سمجھیں گے اور سر دھنیں گے۔

عصرِ من دانندہ اسرار نیست
یوسفِ من بہرِ ایں بازار نیست

(اسرار ورموز ٦)

میں اپنے زمانہ سے پہلے پیدا ہو گیا۔ میرا یہ عصر، میرے اسرار ورموز کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔ میرے خیالات صالح کا یوسف، اس بازار میں نہیں بک سکتا۔ یہ دوسری چیزوں کے خریدار ہیں۔ یوسف کو کیا خریدیں گے۔ خزف ریزوں پر مٹنے والے، جواہر کی قدر کیا کر سکتے ہیں؟

ناامید استم زیاران قدیم
طورِ من سوزد کہ مے آید کلیم

(اسرار ورموز:٧)

یاران قدیم، یعنی اپنے ہم عصروں اور ساتھیوں سے میں ناامید ہو چکا ہوں، یہ لوگ، نہ میرا مقصد سمجھ سکتے ہیں، نہ مدعا، میرے فکر ونظر کا طور، اپنے کلیم کے انتظار میں ہے، اور وہ کلیم پھر بہر حال اسے لے گا۔ میرے کلام کی حقیقت کو سمجھے گا اور دُنیا کو ان حقائق سے باخبر اور واقف کر دے گا۔ میں اسی کے انتظار میں ہوں۔

یاران قدیم سے ناامید اور مایوسی کی وجہ یہ ہے کہ ان کا سمندر، شبنم کی طرح بے

خروش ہے۔ان میں تلاطم نہیں، اضطراب نہیں، اور میرا یہ حال ہے کہ میری شبنم، سمندر کی طرح طوفان بدوش ہے۔اس میں تلاطم ہے۔ ہلچل ہے۔ اضطراب ہے۔ پھر بھلا یہ مجھے کیا سمجھ سکتے ہیں؟ ــــــ یہی بات اقبال نے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

قلزمِ یاراں چو شبنم بے خروش
شبنمِ من مثلِ یم طوفاں بدوش

(اسرار و رموز: ۷)

نغمہ من از جہانِ دیگر است
ایں جرس را کاروانِ دیگر است

(اسرار و رموز: ۷)

میرا نغمہ، کسی دوسری دُنیا کا ہے،اس دُنیا کا نہیں۔میری صدائے جرس یارانِ قدیم کے لیے نہیں،اس کا کارواں کوئی اور ہی ہے۔

برق ہا خوابیدہ در جانِ من است
کوہ و صحرا بابِ جولانِ من است

(اسرار و رموز: ۷)

میری جانِ ناتواں میں بجلیاں پوشیدہ ہیں۔

پنجہ کن با بحرم ار صحراستی
برقِ من در گیر اگر سیناستی

(اسرار و رموز: ۷)

اگر تو صحرا ہے، تو آ، اور میرے سمندر میں شامل ہو جا۔اگر تو کوہ سینا ہے تو اٹھ اور میری بجلی کی تجلی کو قبول کر۔

چشمۂ حیواں براتم کردہ اند
محرمِ رازِ حیاتم کردہ اند

(اسرار و رموز: ۷)

چشمہ حیواں، یعنی آبِ حیات میرا حصہ ہے۔ رازِ حیات کا میں محرم ہوں۔

ذرہ از سوزِ نوایم زندہ گشت
پر کشود و کرمکِ تابندہ گشت

(اسرار ورموز:۷)

میرے سوزِ نوا سے ذرہ میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس نے پر پرواز پیدا کیے اور کرمک شب تاب بن گیا۔

ہیچ کس رازے کہ من گویم نہ گفت
ہم چو فکر من دُر معنی نہ سفت

(اسرار ورموز ۹)

جو راز میں آشکارا کر رہا ہوں یہ اب تک کسی کی زبان پر نہیں آیا۔ جو موتی میں صدف کا سینہ چیر کر تیری بزم میں لایا ہوں۔ وہ آج تک کسی کے ہاتھ نہیں لگا۔

برِّ عیشِ جاوداں خواہی بیا
ہم زمیں ہم آسماں خواہی بیا

(اسرار ورموز:۸)

اگر عیش جاوداں کا راز معلوم کرنا چاہتا ہے تو میرے پاس آ، زمین اور آسمان پر حکومت کرنا چاہتا ہے تو میرا پیام سمجھ۔

پیرِ گردوں با من ایں اسرار گفت
از ندیماں راز ہا نتواں نہفت

(اسرار ورموز:۷)

یہ اسرار جو میں تجھ پر آشکار کر رہا ہوں میرا زائیدہ فکر نہیں ہے۔ اسے میں نے پیر گردوں سے معلوم کیا ہے۔ لیکن تجھے بتائے دیتا ہوں۔

(۹۵)

انتظارِ غم گسار

اقبال اپنے محرم خود تھے۔محرم اسرار اور غم گسار کے انتظار میں انھوں نے عمر گزار دی، مگر کوئی نہ ملا۔خود ہی ایک موقعہ پر فرماتے ہیں :

اقبال! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

(بانگِ درا:۸۳)

ساری زندگی، انتظارِ غم گسار کرتے رہے، مگر کامیاب نہ ہوئے۔اپنی ہر کتاب میں انھوں نے اس محرومی پر آنسو بہائے ہیں اور ہر مرتبہ انداز بیان وہ اختیار کیا ہے، جو سوز و گداز اور درد و اثر کی تصویر ہے۔اور واقعی اس سے بڑھ کر محرومی کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنے دل میں خیالات کا طوفان رکھتا ہو، لیکن کوئی ایسا شخص نہ ملے جس تک یہ راز منتقل کیا جا سکے۔دل کی بات کہہ لینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے، لیکن کوئی ایسا نہ ملے جس سے دل کی بات کہی جا سکے تو آدمی گھٹ گھٹ کر زندگی بسر کرتا ہے۔اقبال اس مصیبت میں گرفتار تھے۔وہ چپ و راست دیکھتے تھے۔مگر انہیں کوئی اپنا نہیں ملتا تھا۔جس سے وہ دردِ دل کہہ سکیں۔

یوں تو اقبال کے ندیم و ہم نیشن، قدر شناس اور عقیدت مند، دوست اور ہوا خواہ بہت تھے، لیکن بات کو سمجھنے والا، اور مزاج کو جاننے والا اور درد کو محسوس کرنے والا، خدا کی اس وسیع دُنیا میں کوئی نظر نہیں آتا تھا۔اس حسرت و ماتم میں ان کی حیات مستعار ختم ہوگئی۔مگر غم گسار و راز دار نہ ملتا تھا، نہ ملا۔کبھی کسی میں کچھ راز داری اور اسرار شناس کی جھلک نظر آ جاتی ہے تو خوش ہو جاتے ہیں اور کہہ اٹھتے ہیں:

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

(بالِ جبریل:۶۱)

لیکن یہ کیفیت احتراز ونشاط عارضی ہوتی ہے۔غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے۔
خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم
پھر آہ بھر کے رہ جاتے ہیں، پھر اپنے آپ کو ہجوم میں تنہا محسوس کرنے لگتے ہیں۔

مثنوی اسرار خودی، جہاں ختم ہوتی ہے، خدا سے دعا کرتے ہیں اور بڑی دیر تک مناجات کرتے رہتے ہیں۔اس دعا اور مناجات میں، سارا دردِ دل کہہ جاتے ہیں۔ جو کچھ دل میں آتا ہے عرض کرتے جاتے ہیں۔خدا سے بڑھ کر راز دار اور غم گسار کون ہوسکتا ہے۔لہٰذا نہایت سکونِ قلب اور جمعیت خاطر سے اپنا ماجرا اس سے بیان کرتے رہتے ہیں۔

اس دعا کے دو بند ہیں۔ پہلے بند میں وہ اپنی ملت اور قوم کے لیے دستِ سوال دراز کرتے ہیں اور جو کچھ مانگنا ہے، مانگ لیتے ہیں۔وہ دولتِ دُنیا نہ اپنے لیے مانگتے ہیں نہ اپنی قوم کے لیے۔وہ تو عشق و مستی کے طالب ہیں۔ یہی دولت سب سے بڑی دولت ہے۔اس کی دریوزہ گری، وہ اپنے لیے بھی کرتے ہیں اور اپنی قوم کے لیے جو محروم جذب وشوق ہو چکی ہے، قوم کے لیے، جو دعائیں انھوں نے دل کی گہرائیوں سے مانگی ہیں۔ایک نمونہ ان کا بھی ملاحظہ کر لیجیے:۔

از مقدر شکوہ ہا داریم ما
نرخِ تو بالاؤ نا داریم ما

(اسرار و رموز:۷۶)

ہم مسلمانوں کو اپنے مقدر سے گلہ ہے۔تیرا نرخ بالا اور ہم نادار و مفلوک۔

از تہی دستاں رخِ زیبا فروش
عشقِ سلمانؓ و بلالؓ ارزاں فروش

(اسرار و رموز:۷۶)

ہم جیسے تہی دستوں اور ناداروں سے اپنا رخ زیبا نہ چھپا۔ ہمیں اپنی عنایت اور رحمت سے عشقِ سلمانؓ و بلالؓ مرحمت فرما۔

چشمِ بے خواب و دل بے تاب دہ
باز مارا فطرتِ سیماب دہ

(اسرار ورموز:۷۶)

اے خدا!

اپنی بارگاہ سے ہمیں دولت دُنیا نہ مرحمت فرما۔ ہاں چشم بے خواب اور دل بے تاب کی نعمت عطا فرما۔ وہ فطرت سیماب، جو کبھی ہماری سرشت تھی، پھر سے ہمیں دے دے۔

پھر اور بہت سی دعائیں مانگتے اور تمناؤں کا اظہار کرنے کی آخری بات کہتے ہیں۔

رہرواں را منزلِ تسلیم بخش
قوتِ ایمانِ ابراہیم بخش
عشق را از شغلِ لا آگاہ کن
آشنائے رمزِ الا اللہ کن

(اسرار ورموز:۷۶)

یعنی بار الٰہی! ہمیں منزل تسلیم کا راہرو بنادے۔ ہمیں وہ ایمان مرحمت فرما جو الا اللہ ابراہیم کے ایمان سے مشابہ ہو۔

عشق کو ایک مرتبہ پھر شغل لا مرحمت فرما تاکہ وہ تیرے سوا ہر ایک سے بیگانہ ہو جائے۔ تیرے سوا ہر قوت کی نفی کردے۔ تیرے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے وہ آشنائے رمز الا اللہ بن جائے۔ ہر چیز میں تیرا جلوہ دیکھے۔ ہر رنگ میں اسے تو ہی نظر آئے۔

ملت کے لیے یہ کچھ مانگ چکنے کے بعد اب وہ اپنا حال بارگاہ خداوندی میں، تڑپ اور خلش اور تپش کے ساتھ عرض کرتے ہیں:

من کہ بہرِ دیگراں سوزم چو شمع
بزمِ خود را گریہ آموزم چو شمع (اسرار ورموز:۷۶)

کتنی مدت ہوگئی کہ میں اپنی ملت کے غم میں شمع کی طرح پگھل رہا ہوں، روتا بھی ہوں رلاتا بھی ہوں۔ کیونکہ اپنی محفل کے لیے، میں نے سامان گریہ فراہم کردیا ہے۔

یا رب آں اشکے کہ باشد دل فروز
بے قرار و مضطر و آرام سوز

(اسرار و رموز:۷۶)

یااللہ

مجھے وہ آنسو مرحمت فرما، جو دل افروز ہو، جس سے دل کی گرہیں کھلیں، جو بے قرار ہو، مضطر ہو، آرام سوز ہو۔

دل بدوش و دیدہ بر فرداستم
درمیانِ انجمن تنہا ستم

(اسرار و رموز:۷۷)

حال یہ ہے کہ، تنہا نہیں ہوں، مگر اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہوں، ہجوم میں گھرا ہوا ہوں، مگر پھر بھی تنہا ہوں۔ کوئی آشنا نہیں، کوئی محرم سوز نہیں۔

در جہاں یارب ندیمِ من کجاست؟
نخلِ سینایم کلیمِ من کجاست؟

(اسرار و رموز:۷۷)

اے خدا!

اس دُنیا میں، میرا کوئی ندیم نہیں ہے۔ میں نخلِ سینا ہوں، تجلی کا منتظر ہوں، لیکن کلیم سے محروم ہوں۔ اے خدا! تو سب کچھ کرسکتا ہے۔ مجھے ندیم اور کلیم عطا فرما، تا کہ میں تنہا نہ رہوں۔

ظالم بر خود ستم ہا کردہ ام
شعلہ را در بغل پروردہ ام

(اسرار و رموز:۷۷)

میں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم سے کام لیا ہے۔ مجھے کیا ضرورت تھی، کہ عشق کی چنگاری اپنے دامن میں سلگاتا اور پھر فریاد وفغاں کرتا، لیکن اب تو یہ آگ بھڑک چکی۔ اب تو یہ عشق شرر سے شعلہ بن چکا ہے۔ اس کا مداوا تو ہی کرسکتا ہے۔ میرے رب اب وہ مداوا عطا کر۔

بارگاہ الٰہی میں، اتنا کچھ عرض کر چکنے کے بعد بھی ابھی بہت کچھ کہنا باقی ہے۔

ہم چو شبنم دیدہ گریاں شدم
تا امینِ آتشِ پنہاں شدم

(اسرار ورموز:۷۷)

شبنم کے مانند میں دیدہ گریاں بنا ہوا ہوں۔ آتش پنہاں، یعنی سوز دروں کی امانت میرے ہی حصہ میں آئی ہے۔

شمع را سوزِ عیاں آموختم
خود نہاں از چشمِ عالم سوختم

(اسرار ورموز:۷۷)

شمع کو تو میں نے سوز عیاں دے رہا ہے۔ وہ پگھل رہی ہے اور دُنیا اس کا پگھلنا دیکھ رہی ہے۔ خود بھی جل رہا ہوں، لیکن چشم عالم سے پنہاں ہوکر۔

شعلہ ہا آخر زہر مویم دمید
از رگِ اندیشہ ام آتش چکید

(اسرار ورموز:۷۷)

میرے ہر بن مو سے، شعلہ کی لپٹ نکل رہی ہے۔ میری رگِ تخیل سے شعلے اور نگارے برس رہے ہیں۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

سینۂ عصرِ من از دل خالی است
می تپد مجنوں کہ محمل خالی است

(اسرار ورموز:۷۷)

میرا زمانہ دل کی نعمت سے محروم ہے۔ مجنوں کے اضطراب کا سبب یہ ہے کہ محمل خالی ہے۔ اب وہ لیلیٰ کی جستجو تلاش کہاں کرے؟ اسے کہاں سے پائے اور دل ناصبور کو تسکین و تسلی دے؟

پھر خدا سے عرض کرتے ہیں:

شمع را تنہا تپیدن سہل نیست
آہ یک پروانۂ من اہل نیست

(اسرار ورموز: ۷۷)

شمع کو پگھلنے اور جلنے میں تکلیف نہیں ہوتی، دکھ اس کا ہوتا ہے کہ وہ تنہا جلتی ہے میں بھی اسی شمع کی طرح جل رہا ہوں، جس کے پاس کوئی پروانہ نہیں۔

انتظارِ غم گسارے تا کجا
جستجوئے راز دارے تا کجا

(اسرار ورموز: ۷۷)

اے خدا۔۔۔غم گسار کا انتظار کب تک کرتا رہوں۔ راز دار کی جستجو میں کب تک جان ہلکان کرتا رہوں؟

اے ز رویت ماہ و انجم مستنیر
آتشِ خود را ز جانم باز گیر

(اسرار ورموز: ۷۷)

اے میرے رب۔۔۔یہ چاند اور تارے تیرے ہی نور سے تو روشن نظر آتے ہیں۔ لیکن میں اس نور سے محروم ہوں۔۔۔کیوں؟

یا مرا ایک ہمدم دیرینہ دہ
عشقِ عالم سوز را آئینہ دہ

(اسرار ورموز: ۷۸)

تو مجھے ایک ہمدم و مونس مرحمت کر جو عشق عالم سوز کے لیے آئینہ کا کام دے۔

موج در بحر است ہم پہلوئے موج
ہست باہمدم تپیدن خوئے موج

(اسرارورموز:۷۸)

یہ سمندر کی موجیں بھی ایک دوسرے کے ساتھ تڑپتی ہیں۔موج کا مزاج بھی تنہا تڑپنا نہیں ہے۔وہ بھی ایک ساتھی۔ایک ندیم،ایک راز داراور غم گسار کی متلاشی ہے۔

اتنی مثالیں دے چکنے کے بعد خدا سے عرض کرتے ہیں:

گرچہ تو در ذات خود یکتاستی
عالمے از بہر خویش آراستی

(اسرارورموز:۷۸)

اگر چہ تیری ذات یکتا اور بے ہمتا ہے،لیکن تجھے بھی تنہائی پسند نہ آئی اور اپنی تنہائی کو دوئی سے بدلنے کے لیے،تو نے یہ دُنیا آراستہ کردی،لیکن

من مثالِ لالہ صحرا ستم
درمیانِ محفلے تنہاستم

(اسرارورموز:۷۸)

میں لالہ صحرا کی طرح ہوں۔جس کی کوئی محفل نہیں ہوتی۔جس کا کوئی چمن نہیں ہوتا،جو صحرا میں تنہائی کی زندگی بسر کرتا ہے۔

خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے
از رموز فطرت من محرمے

(اسرارورموز:۷۸)

تیرے لطف وکرم سے ایک دوست اور ہمدم کا متمنی ہوں،ایسا ہمدم اورم حرم جو میرے اسرارفطرت سے واقف ہو۔اورخیال ایں وآں سے یکسر بیگانہ ہو۔میری ہی طرح وہ بھی عاشق ہواور مجنوں ہو۔

تا بہ جاں او سپارم ہوئے خویش
باز بینم در دل او روئے خویش (اسرارورموز:۷۸)

تا کہ میں اپنا جنوں اسے بخش دوں، اور پھر اس کے آئینہ دل میں اپنا چہرہ دیکھوں۔

سازم از مشتِ گلِ خود پیکرش
هم صنم اورا شوم هم آذرش

(اسرار ورموز:۷۸)

میں اس کی تعمیر، اپنی مشت گل سے کروں گا۔ میں اس کا صنم بن جاؤں گا۔ وہ میرا آذر، میں اس کے وجود میں اپنے افکار وخیالات کا پرتو دیکھوں گا۔ وہ میری مٹی میں اپنا وجود دیکھے گا۔ پھر ہم دونوں کے اتحاد وتعاون سے، عشق ومستی کی دُنیا میں ایک نیا دور شروع ہوگا۔ پھر میں تنہا نہ رہوں گا۔ میرا جنوں میری قوم میں عام ہو جائے گا۔ آج میری قوم مجھ سے بیگانہ ہے۔ میرے پیام سے غیر ملتفت ہے۔ میری آہ اور اشک سے ناواقف ہے۔ پھر یہ صورت باقی نہ رہے گی۔ پھر وہ میرے غم کی شریک بن جائے گی۔ وہ بھی پھر اس آگ میں جلنے لگے گی۔ جس نے میرا خرمنِ ہستی پھونک کر رکھ دیا ہے۔

(۹۶)

بہ حضور ملت اسلامیہ

مثنوی رموز بے خودی، اقبال کے فلسفہ اور پیام کی روح ہے۔ جس نے اسے سمجھ لیا اس نے اقبال کو سمجھ لیا۔ یہ کتاب انھوں نے بڑے ولولہ اور ہمہمہ کے ساتھ ملت اسلامیہ کی خدمت میں پیش کی ہے، اور اپنی ملت کو مخاطب کر کے انھوں نے آغاز کلام سے پہلے دو دو باتیں کی ہیں۔ ان باتوں میں اپنا ذکر بھی ہے، اور قوم کا بھی، رموز بے خودی پر تبصرہ فی الحال ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہمارے پیش نظر تو اقبال ہیں۔ ہم انہی کا تعارف کرا رہے ہیں۔ ان کے کلام سے انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں، لہٰذا ہماری گفتگو اسی حد تک محدود رہے گی، وہ اپنی ملت سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اے ترا حق خاتمِ اقوام کرد
بر تو ہر آغاز را انجام کرد

(اسرار و رموز: ۸۱)

خدائے بزرگ و برتر نے تجھے یہ عزت بخشی ہے کہ تو فاتح اقوام ہے۔ تو ہی ہر آغاز کا انجام ہے۔ تو نبی آخر الزماں کی امت ہے، جس طرح محمدؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اسی طرح امت اسلامیہ کے بعد کوئی قوم نہیں نمودار ہوگی۔ یہ آخری قوم ہے، جو تعلیماتِ الٰہی اور ہدایاتِ نبوی کی روشنی میں، دُنیا کی اصلاح و ہدایت کے لیے بھیجی گئی ہے۔

اے مثالِ انبیا پاکانِ تو
ہم گرد دل ہا جگر چاکانِ تو (اسرار و رموز: ۸۱)

تیرے جگر پاک، اپنی ایک نئی شان رکھتے ہیں۔ تیرے پاک اور صالح لوگ دوسری قوموں کے انبیا کے مانند ہیں۔ ان کا کردار، ان کی سیرت، ان کا جمالِ کار، ان کا جلالِ عمل، اسی حقیقت ثانیہ کا آئینہ دار اور ترجمان ہے۔

اے نظر بر حُسنِ ترسا زادہ
اے ز راہِ کعبہ دور افتادہ

(اسرار و رموز: ۸۱)

پھر کیا بات ہے کہ تو نے غیر اسلامی اصولوں کو اپنا لیا ہے اور کعبہ کی راہ سے جو تیری اصل منزل مقصود ہے، دور جا پڑی ہے۔

طرحِ عشق انداز اندر جانِ خویش
تازہ کن با مصطفیؐ پیمانِ خویش

(اسرار و رموز: ۸۱)

تو عشق و جدان کی حامل تھی اور جب تک یہ دولت تیرے پاس رہی، تو اقوام عالم کی رہنمائی کرتی رہی۔ لیکن اب یہ دولت تجھ سے چھن چکی ہے۔ اسے حاصل کر۔

لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

پھر اپنے اندر عشق کا ولولہ پیدا کر اور تو نے اپنے پیغمبرؐ سے جو پیمان باندھا تھا، اسے پورا کر

اس ذکر و فکر اور نصیحت و تلقین کے بعد وہ اپنا اور قوم کا تعلق بیان کرتے ہیں۔ یہ بتاتے ہیں کہ ان میں اور قوم میں کیا ربط و تعلق ہے؟ فرماتے ہیں

من شہید تیغِ ابروئے توام
خاکم و آسودۂ کوئے توام

(اسرار و رموز: ۸۲)

دوسرے لوگ، بادشاہوں اور سلطانوں کی شان میں قصیدے پڑھتے ہیں۔ اپنے محبوب کے خال و رخ کی داستان بیان کرتے ہیں۔ لیکن مجھے نہ بادشاہوں اور سلطانوں سے

مطلب ہے نہ میں کسی کو محبوب و مطلوب بنا کر پوجتا ہوں۔ میں تو تیرا گرفتار ہوں۔ تیری تیغ ابرو کا شہید ہوں۔ تو نے نمودار ہو کر، دُنیا میں وہ کارنامے دکھائے ہیں اور فقیر و مفلس دُنیا کو وہ نعمتیں دی ہیں جس کی ہر قوم ممنون ہے۔ جس کی نظیر دُنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

قوم سے اپنا ربط و تعلق بیان کرنے کے بعد، اپنی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور قوم کو بتاتے ہیں کہ میں کیا ہوں، خاک رہ گزر یا کوہ گراں؟

سخت کوشم مثلِ خنجر در جہاں
آبِ خود می گیرم از سنگِ گراں

(اسرار و رموز:۸۲)

میں خنجر کی طرح سخت کوش ہوں، اپنی روزی سنگ گراں سے حاصل کر لیتا ہوں۔ کسی کا محتاج نہیں۔

گرچہ بحرم، موج من بیتاب نیست
بر کفِ من کاسۂ گرداب نیست

(اسرار و رموز:۸۲)

اگرچہ میں سمندر ہوں، لیکن میری موج، موجِ بیتاب نہیں۔ میری لہریں گرداب کی صورت میں کاسۂ گدائی لے کر نمودار نہیں ہوتیں،

در سرار آبادِ ہستی اخگرم
خلعتے بخشد مرا خاکسترم

(اسرار و رموز:۸۲)

شرر آبادِ ہستی میں، میری مثال انگارہ کی سی ہے۔ میرا خلعت، میری خاکستر ہے۔

پھر قوم سے مخاطب ہوتے ہیں:

بر درت خانم نیاز آوردہ است
ہدیۂ سوز و گداز آوردہ است

(اسرار و رموز:۸۲)

اے میری ملت ۔۔۔۔۔ تیرے حضور میں سوز وگداز کا ہدیہ، اور تیرے در پر جان نیاز مند کا نذرانہ لایا ہوں۔ اسے قبول کرلے اور میرے دل کی تمنا پوری کردے۔

اپنے جذب دروں اور سوز نہاں کی تصویر کھینچتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

در سکوتِ نیم شب نالاں بدم
عالم اندر خواب و من گریاں بدم

(اسرار و رموز:۸۳)

آدھی رات کے سناٹے میں، میں اشک کے موتی پروتا ہوں، ساری دُنیا محوخواب ہوتی ہے اور میں گریاں ہوتا ہوں کیوں؟

از پئے قومِ ز خود نامحرے
خواستم از حق حیاتِ محکمے

(اسرار و رموز:۸۳)

اپنی قوم کے لیے، جو اپنی حقیقت اور اپنے رازِ وجود سے نامحرم ہے، میں اس کے لیے بارگاہِ خداوندی میں حیات محکم کا طلب گار ہوں۔

جانم از صبر و سکوں محروم بود
وردِ من یا حی یا قیوم بود

(اسرار و رموز:۸۳)

میری زندگی، صبر وسکون سے، قوم کے غم میں محروم ہوچکی ہے۔ میرا ورد اور وظیفہ صرف یہ رہ گیا ہے کہ خدائے حی وقیوم سے گڑگڑا گڑگڑا کر دعا کروں کہ بارالٰہا! میری قوم کو زندگی کی تابندگی عطا کر، میری قوم کو استقلال و استحکام عطا فرما۔

سوختن چوں لالہ پیہم تا کجا
از سحر دریوز شبنم تا کجا

(اسرار و رموز:۸۳)

کب تک میں لالہ خونیں جگر کی طرح جلتا، کڑھتا اور وقف سوز وحرماں رہوں گا؟

صبح صادق سے شبنم کی دریوزہ گری کب تک کرتا رہوں گا؟

اشکِ خود برخویش می ریزم چو شمع
با شبِ یلدا در آویزم چو شمع

(اسرار و رموز: ۸۳)

جس طرح شمع کے آنسو اس پر گرتے ہیں۔اسی طرح میرے آنسو، میرے دامان وگریباں میں نم پیدا کر رہے ہیں۔جس طرح شمع جل کر پگھل کر رات کی تاریکی کو نور سے بدل دیتی ہے اسی طرح میں بھی اپنی آگ میں جل رہا ہوں اور فکر ونظر کی تاریکیوں کو افکار صالح کی روشنی میں دور کر رہا ہوں۔

عشق را داغے مثال لالہ بس
در گریبانش گلِ یک نالہ بس
من ہمیں یک گل بہ دستارت زنم
محشرے برخواب سرشارت زنم
تاز خاکت لالہ زار آید پدید
از دمت بادِ بہار آید پدید

(اسرار و رموز: ۸۳۔۸۴)

عشق کے لیے وہ داغ بس ہے، جو لالہ کے جگر میں ہوتا ہے۔یہ پھول اس کے دامن میں خوب بجتا ہے۔

میرے پاس بھی یہی داغ، یہی پھول ہے اور میں اسے تیری دستار میں لگائے دیتا ہوں۔ تیرا خواب خرگوش بیداری سے بدل جائے اس لیے آہ وبکا اور فریاد وشیون کرتا رہتا ہوں۔

میری اس جگر کاوی کا مقصد صرف یہ ہے کہ تیری خاک سے لالہ زار پیدا ہو، تیرے دم سے بادِ بہار آ جائے۔

متاعِ کارواں

وہ جگر سوزی نہیں، وہ شعلہ آشامی نہیں
فائدہ پھر کیا جو گردِ شمع پروانے رہے؟
خیر تو ساقی سہی، لیکن پلائے گا کسے؟
اب نہ وہ میکش رہے باقی، نہ میخانے رہے!
رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے
آج ہیں خاموش وہ دشتِ جنوں پرور جہاں
رقص میں لیلا رہی، لیلا کے دیوانے رہے
وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

(بانگِ درا: ۱۸۷-۱۸۶)

(۹۷)

تربیت

اقبال، حریت نسواں کے بارے میں ذرا محتاط سے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں دیکھنا چاہتے ہیں وہ ہے مادریت۔ اور تہذیب جدید نے اسے اس چیز سے بیگانہ بنادیا ہے اقبال کا خیال ہے، انسان کی بہترین تربیت گاہ، آغوش مادر ہے۔ وہ مدرسہ ومکتب سے اتنا کچھ نہیں حاصل کر سکتا، جتنا ماں کی گود میں سیکھ سکتا ہے۔ یہ ایسا نقش ہوتا ہے جو زندگی کے کسی دور میں اس سے جدا نہیں ہوتا۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ اور زیادہ محکم، مستحکم اور مرتسم ہوتا رہتا ہے۔ ارمغان حجاز میں فرماتے ہیں:

مراد او ایں خرد پرور جنونے
نگاہِ مادرِ پاک اندرونے
ز مکتب چشم و دل نتواں گرفتن
کہ مکتب نیست جز سحر و فسونے (ارمغانِ حجا

یعنی، یہ خرد پرور جنوں، جو تم میری ہستی میں دیکھتے ہو، یہ کالج اور یونیورسٹی کا پیدا کردہ نہیں ہے۔ یہ تو میں نے آغوش مادر سے حاصل کیا ہے، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سحر و فسوں کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے؟

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

زندگی کی قوت پنہاں

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے

(بانگِ درا: ۲۶۰-۲۵۹)

(۹۸)

عصر جدید

اقبال، تہذیب حاضر اور عصر جدید کے سخت مخالف ہیں۔ اس لیے کہ مسلمانوں کی خودی پر انہی دونوں چیزوں نے چھاپہ مارا ہے۔ وہ بار بار اپنی قوم کو، ان دونوں خطروں سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ارمغانِ حجاز میں کہتے ہیں:

جواناں را بد آموز است ایں عصر
شب ابلیس را روز است ایں عصر
بہ دامانش مثالِ شعلہ پیچم
کہ بے نور است و بے سوز است ایں عصر

(ارمغانِ حجاز:۹۵)

یعنی، یہ عصر جدید مسلمانوں کے دین وایمان کے لیے غارت گر ہے۔ یہ انہیں شیری نہیں روباہی سکھاتا ہے۔ انہیں گوسفندی کی تعلیم دیتا ہے۔ ماضی اور حال کے رشتہ کو منقطع کر دیتا ہے۔ سچ پوچھو تو یہ زمانہ مسلمان کے لیے سازگار نہیں۔ ہاں، ابلیس کی شب تاریک کے لیے بے شک یہ نوروز ہے۔

اسی عصر جدید کے بارے میں ایک اور رباعی:

مسلماں فقر و سلطانی بہم کرد
ضمیرش باقی و فانی بہم کرد
ولیکن الاماں از عصرِ حاضر
کہ سلطانی بہ شیطانی بہم کرد

(ارمغانِ حجاز:۹۶)

یعنی مسلمانوں نے اپنے زمانہ میں فقر اور سلطانی کو ایک کر دیا تھا۔ان کا سلطان اسلام کا مردفقیر ہوتا تھا۔وہی مردفقیر

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

لیکن

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

اور دُنیا نے دیکھ لیا کہ فقر وسلطانی کی آمیزش نے اس کی تمام بیماریاں دور کر دیں اور اسے راہ راست پر گامزن کر دیا۔لیکن عصر حاضر کا کمال یہ ہے کہ اس نے فقر وسلطانی کا مبارک رشتہ تو قطع کر دیا اور اس کے بجائے ایک نئی چیز پیدا کر دی،یعنی سلطانی اور شیطانی میں اتحاد کرا دیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسانیت چیخ اٹھی،اس کی ہر چیز لوٹ لی گئی۔اس کے اقدار بدل دیے گئے۔دماغ اس سے چھین لیا گیا۔دل اس کا لوٹ لیا گیا۔زبان اس کی بند کر دی گئی۔قلم اس کے ہاتھ میں نہ رہا۔فکر وخیال تک پر پہرے بٹھا دیے گئے۔

اسی عصر جدید کا ایک اور نقشہ:

چہ عصر است ایں کہ دیں فریادِے اوست
ہزاراں بند در آزادی اوست
ز روئے آدمیت رنگ و نم برد
غلط نقشے کہ از بہزادیٔ اوست

(ارمغانِ حجاز:۹۵)

یعنی یہ کیسا عجیب زمانہ آیا ہے۔جس میں دین تک محفوظ ومامون نہیں ہے۔اس کی چیرہ دستیوں اور عیاریوں سے دین بھی پناہ مانگتا ہے۔یہ آزادی وجمہوری کا علمبردار ہے۔ساری دُنیا کو نوید آزادی سناتا ہے لیکن درحقیقت یہ پابندیوں اور ناروا چمن آرائیوں کا دوسرا نام ہے۔

عصر جدید کی صورت گری اور نقش بندی اور بہزادیت کا سب سے بڑا شاہکار یہ ہے کہ اس نے جو تصویر بنائی ہے وہ اتنی ہی ہیچ پوچ،مکروہ اور بدنما ہے کہ اس نے آدمیت کے رخ

انور سے اس کا نور چھین لیا ہے۔ اسے زشت رو اور بھدا بنا دیا ہے۔ اگر یہی اس کی نفس آرائی ہے تو پھر اس سے خدا کی پناہ۔۔۔ اگر اسے صورت کا بنانا کہتے ہیں تو پھر بگاڑنا کسے کہیں گے۔ یہ عصر جدید ایسا غلط کار ہے کہ اس کی غلط کاریاں افراد ہی کو نہیں، جماعتوں کو، قوموں کو، ملتوں کو اور ملکوں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔

حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تیری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے!
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے!

(بانگِ درا:۲۶۹)

(۹۹)
پرویزانِ عصر سے خطاب

پرویز و فرہاد:

بگو از من بہ پرویزانِ ایں عصر
نہ فرہادم کہ گیرم تیشہ در دست
ز خارے تو خلد در سینۂ من
دلِ صد بے ستوں رامی تواں خست

(ارمغانِ حجاز:۱۳۳)

یعنی

میری طرف سے، اس دور کے پرویزوں، جابر بادشاہوں، سفاک آمروں اور خوں آشام مدبروں سے کہہ دو کہ میں فرہاد نہیں ہوں کہ ایک غلط مقصد کی خاطر محض ہوا و ہوس کے لیے تیشہ ہاتھ میں لوں گا اور کوہ بے ستون کا جگر کاٹنے کے لیے چل پڑوں گا۔ میرے سینہ میں جو کانٹا کھٹک رہا ہے ایسی نوک تیز رکھتا ہے کہ اس سے سینکڑوں بے ستون کٹ سکتے ہیں اور ان کے جگر کے ٹکڑے اڑائے جا سکتے ہیں۔ مرد مسلمان کبھی بھی مشکلات و موانع سے ہراساں نہیں ہوتا۔ وہ عزم و ہمت کے ساتھ ہر مشکل کا مقابلہ کرتا ہے اور بالآخر اس پر غالب آ جاتا ہے کیونکہ وہ ہار ماننا جانتا ہی نہیں۔ وہ صرف لڑنا، کشاکش میں حصہ لینا اور اپنے مقصد بالا پر مرمٹنا جانتا ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔

دردِ دل:

درِ دل را بہ روئے کس نہ بستم
نہ از خویشاں نہ از یاراں گسستم

نشیمن ساختم در سینۂ خویش
تہِ ایں چرخ گرداں خوش نشستم

(ارمغانِ حجاز:۱۳۴)

میں اپنے دل کا ماجرا کسی سے نہیں کہتا۔نہ اپنے دل کا دروازہ ہر کسی کے لیے کھولتا ہوں۔ویسے دوستوں کا دوست اور خویشوں کا خویش ہوں۔

میں نے اپنے سینہ میں نشیمن بنالیا ہے اور تہہ چرخ گرداں اس نشیمن میں بیٹھ کر بہت خوش ہوں۔

گلشن و گلچیں:

دریں گلشن نہ دارم آب و جاہے
نصیبم نے قبائے ، نے کلاہے
مرا گلچیں بد آموزِ چمن خواند
کہ دادم چشمِ نرگس را نگاہے!

(ارمغانِ حجاز:۱۳۴)

یعنی اس دُنیا کے گلشن میں میں جاہ وجلال نہیں رکھتا۔نہ میرے نصیب میں کلاہ شہریاری اور قبائے خسروی آئی ہے،چمن کا مالک مجھے بدآموز چمن کہتا ہے۔لیکن میری خطا کیا ہے؟ یہ کہ میں نے نرگس کو نگاہ عطا کی ہے؟اسے چشم بیدار عطا کر دی ہے۔اگر یہ میرا گناہ ہے، تو میں اسے قبول کرتا ہوں۔غلاموں کو آزادی کا چسکا لگانا۔محکوموں میں حریت کا جذبہ پیدا کرنا۔مجبوروں کو قوت وطاقت سے آشنا کرنا اور اندھوں کو بینا بنانا اور بصیرت دینا یقیناً بہت بڑا جرم ہے۔لیکن اسے کیا کروں کہ اس جرم پر مجھے فخر ہے ندامت نہیں۔

مرغ صبح خواں

نہ پنداری کہ مرغ صبح خوانم
بجز آہ و فغاں چیزے ندانم

مدہ از دست دامانم کہ یابی
کلیدِ باغ را در آشیانم!

(ارمغانِ حجاز:۱۳۵)

یعنی میرے بارے میں اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ میں صرف ایک صبح خواں۔۔۔۔شاعر۔۔۔۔۔ہوں، تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ میرا سرمایہ صرف آہ فغاں ہے۔ میرا دامن، اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑ، میرے آشیانہ کی کنجی، اگر چاہتا ہے تو اسے ہاتھ سے نہ جانے دے۔ کیونکہ میں ہی ایک ایسا آدمی ہوں جو تجھے حقائق و معارف سے آگاہ کرسکتا ہوں۔ اور تیرے فکر و نظر میں انقلاب پیدا کرسکتا ہوں۔

بیگانگی:

بہ چشمِ من جہاں جز رہگور نیست
ہزاران راہرو ویک ہم سفر نیست!
گزشتم از ہجومِ خویش و پیوند
کہ از خویشاں کسے بیگانہ نیست!

(ارمغانِ حجاز:۱۳۵)

یعنی میری نظر میں اس جہان رنگ و بو کی حیثیت صرف ایک رہ گزر کی ہے۔ اس راستہ میں ہزاروں راہرو ملتے ہیں لیکن کوئی ہم سفر نہیں ملتا۔ کوئی ایسا شخص نہیں ملتا جس کی منزل بھی وہی ہو جو میری ہے۔ میں ہجوم سے گزرتا ہوں لیکن تنہا رہتا ہوں۔ کیا مجھ سے بڑھ کر بھی اس دُنیا میں کوئی اپنوں سے بیگانہ تر ہوگا۔

افسوس:

چو رخت خویش بر بستم ازیں خاک
ہمہ گفتند با ما آشنا بود!
ولیکن کس نہ دانست ایں مسافر
چہ گفت و باکہ گفت و از کجا بود! (ارمغانِ حجاز:۱۳۹)

یعنی جب میں نے اس دُنیا سے رخت سفر باندھا تو سب پکار اٹھے یہ شاعر تو ہمارا آشنا تھا۔ ہم اس کے دوست تھے۔ لیکن یہ کسی نے نہ سوچا کہ یہ مسافر۔۔۔۔ شاعر کیا کہتا رہا ہے۔ کس کو اپنا مخاطب بناتا رہا ہے؟ اور آیا کہاں سے تھا؟ باتیں کس عالم کی کرتا تھا؟ افسانہ کون سا سناتا تھا؟ راستہ کون سا دکھاتا تھا؟ اس کے سینہ میں جو آگ سلگ رہی تھی وہ کیا تھی؟ کیسی تھی؟ یہ چنگاری اس نے کہاں سے لی تھی، اور کس کے لیے؟

پالانِ حریر

اگر دانا دل و صافی ضمیر است
فقیرے با تہی دستی امیر است
بہ دوشِ منعمِ بے دین و دانش
قبائے نیست ، پالانِ حریر است!

(ارمغانِ حجاز: ۱۳۹)

فقیر کا دل اگر دانا ہے، ضمیر صاف ہے، نیت نیک ہے۔ مقاصد صالح ہیں، تو اس فقر کے باوجود امیر ہے اسے غریب نہیں کہا جاسکتا۔

منعم اور دولت مند کے کاندھوں پر جو قبائے لالہ گوں اور زرکار و زرنگار نظر آ رہی ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے گدھے پر ریشم کا چار جامہ کس دیا جائے۔

خود فزائی

تخمِ گل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بیتاب ہے
زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خود نمائی خود فزائی کے لیے مجبور ہے

(ارمغانِ حجاز: ۲۳۳)



ISBN 978-969-4492-01-8
9 789694 492018